قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

نومبر 2017 قیمت ₹15

ماہنامہ

# اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

# ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

عجیب و غریب خبریں

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

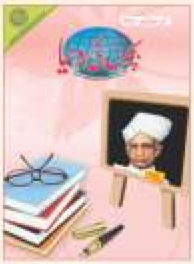

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے    سالانہ: 100 روپے

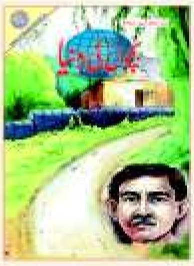

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ
اُردو دُنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:19، شمارہ:11، نومبر 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

**ناشر اور طابع**

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

**مطبع:**
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

**مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل**

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

**صدر دفتر**
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

**ویب سائٹ**
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

**شعبۂ فروخت**

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

# مشمولات


**اداریہ**
ہماری بات 4

**خطوط**
آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

**انٹرویو**
عبدالستار دلوی سے ایک ملاقات
مراٹھی: نندنی آتم سدھ، مترجم: مزمل سرکھوت 7

**کور اسٹوری**
منی پور میں بھی روشن ہے
اردو کا چراغ حقانی القاسمی 11

**ایک شمارہ نومبر کے نام**
شبلی نعمانی: بحیثیت تنقید نگار نور فاطمہ 13
مولانا ابوالکلام آزاد اور فن موسیقی
سے ان کا عشق محمد منصور عالم 17
کلام اکبر میں ذو معنویت اور احتجاج عرشیہ سرفراز 21
'مدینہ' کے مولوی مجید حسن پرویز عادل ماحی 23
سردار جعفری: حکایات خونچکاں کا شاعر یونس غازی 25
اختر الایمان کے کلام میں ماضی کا رنگ نیہا اقبال 28
منفرد ردیفوں کا شاعر: جون ایلیا مستجاب شبلی 30
اردو شاعری کی ماہِ تمام: پروین شاکر نایاب حسن 32

**خراج عقیدت**
نام آلٹر غضنفر 35

**نقد و نگاہ**
عزیز ربانی تابش مہدی 37
شاعر عرفانیات: عزیز الحسن مجذوب فیض قاضی آبادی 39
سری لنکا میں بہار کا ایک خادم علم و ادب شاہد اقبال 43
کلام فراق پر فارسی کے لسانی اثرات محمد زبیر 47

**نگر نگر اردو**
ممبئی کی موجودہ ادبی صورت حال ماجد قاضی 49

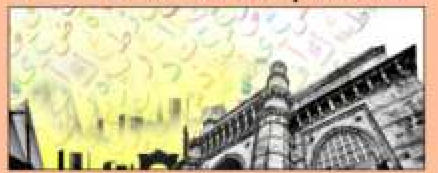

**نیا آسماں نئے ستارے**
مشرقی پنجاب کے پنجابی ناول تبسم بانو شاہ 53

**رسالوں کے خاص نمبر**
نخلستان کا علاقائی ادب نمبر عمران عاکف خان 56

**ہم نے جنہیں بھلا دیا**
ادبی افق پہ درخشاں: چاند کلوی ابوارشد اعظمی 59

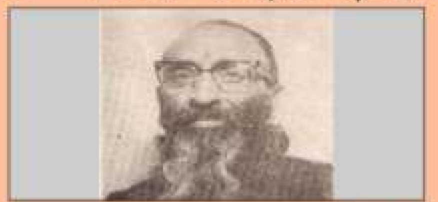

**کمپیوٹر**
پی سی کی تنصیب 62

**کوئز**
ادبی کوئز زیب النساء سعید 64

**سائنس**
امریکہ کی سرزمین پر دن میں رات انیس الحسن صدیقی 66

**کتابوں کی دنیا**
تعارف و تبصرہ ادارہ 68

**عالمی اردو نامہ**
اردو نامہ ادارہ 83

**خبرنامہ**
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 84

# ہماری بات

ناقدری تخلیقی احساس اور اظہار کو پژمردہ اور مضمحل کر دیتی ہے۔ ناقدرشناس معاشروں میں ادب، تہذیب کے فروغ کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ یہاں اہل ہنر کی قدر و قیمت نہیں ہے۔ مادّی اور صارفی معاشرت کی وجہ سے ہنرمند افراد اس قدر و منزلت سے محروم ہو جاتے ہیں جو انھیں معاشرے میں ملنی چاہیے۔ مشرق کے بڑے بڑے فنکاروں نے ناقدری کا شکوہ اسی وجہ سے کیا ہے کہ انھیں اپنے ہنر کی داد نہیں ملتی۔ عہد غالب کے فنکار ہوں یا آج کے تخلیق کار۔ بیشتر ناقدری زمانہ کے شاکی رہے ہیں۔ غالب نے تو یہاں تک کہا تھا:

کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

یہ احساس صرف غالب کا نہیں تھا بلکہ اکثر ان بڑے ذہنوں کا تھا جن کی زمانے نے قدر نہیں کی۔ انھوں نے اپنی اس ناقدری کا شکوہ اپنے شعروں میں بھی کیا ہے۔ جبکہ ایک زمانہ ایسا بھی رہا ہے جب ارباب ہنر کی معاشرے میں بڑی قدر و قیمت تھی۔ قدیم زمانے میں تو نوابین اور امرا، علما اور فنکاروں کو انعامات اور خلعتوں سے نوازتے تھے۔ امراء کے دربار میں اہل علم کی بڑی قدر تھی۔ وہ دور دراز کے علاقے کے اہل علم و دانش اور ارباب فن کو اپنے درباروں میں عزت و احترام کے ساتھ بلاتے تھے۔ انھیں موزوں مناصب اور عہدے تفویض کرتے تھے۔ ان سے علمی اور ادبی نوعیت کے کام لیتے تھے۔ اس طرح علم و ادب کو فروغ ملتا تھا۔ انھیں لوگوں کی سرپرستی کی وجہ سے نہایت قیمتی تصانیف وجود میں آئیں۔ بہت سی کتابوں کے ترجمے ہوئے، بہت سے علوم و فنون کو ترقی ملی۔ مگر اب صورتِ حال یکسر بدل گئی ہے۔ معاشرے کی ترجیحات بدل جانے کی وجہ سے اہل ہنر کی قدر کرنے والے افراد بھی کم ہو گئے ہیں۔ یہ صورتِ حال زیادہ تر ہمارے مشرق کی ہے جبکہ مغرب اس معاملے میں مستثنیٰ ہے کہ وہاں فنکاروں کی بڑی عزت ہے۔ وہاں مصنّفین کے ایسے میوزیم ہیں جہاں ان سے وابستہ یادیں اور چیزیں محفوظ رکھی جاتی ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ ان بڑے فنکاروں سے جڑی ہوئی ہر چیز سے معاشرہ واقف ہو۔

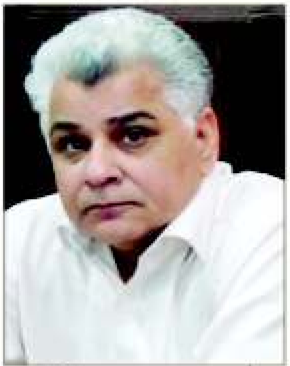

وہاں کے لوگوں کو یہ احساس ہے کہ انہی فنکاروں کی وجہ سے انھیں تہذیبی اور ثقافتی مظاہر سے آگہی ہوئی ہے اور انہی کی وجہ سے ان کا سماجی اور ثقافتی شعور بھی بلند ہوا ہے۔ وہ فنکاروں کی تخلیقی قوتوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔ شیکسپیئر اور دوسرے بڑے قلمکاروں کی کتابیں، مخطوطے، ملبوسات اور دیگر ساری چیزیں ان کے پاس محفوظ ہیں۔ مغرب کے اسی قدر شناس رویے کی وجہ سے وہاں کے فنکار اپنے معاشرے کو بہتر بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ کوششیں بھی کرتے ہیں۔ مشرق اس معاملے میں قدرے پسماندہ ہے کہ یہاں فنکاروں کی قدر افزائی کا وہ سلسلہ نہیں ہے جس کی وجہ سے فنکاروں کا حوصلہ بھی ٹوٹتا ہے اور انھیں کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ شاید کار زیاں میں لگے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے بہت سے فنکاروں نے دوسری راہیں اختیار کر لیں مگر اس صورتِ حال کے باوجود ایک اچھی بات یہ ہے کہ سرکاری سطح پر آج بھی فنکاروں کی قدر افزائی کا سلسلہ جاری ہے۔ بہت سے ایوارڈز ایسے ہیں جو فنکاروں کی خدمات کے صلے میں دیے جاتے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی، جو ہندوستان کا ایک بڑا ادبی اور ثقافتی ادارہ ہے وہ ہندوستان کی بائیس زبانوں کے مصنّفین اور مترجمین کو ہر سال اعزاز و اکرام سے نوازتی ہے۔ اسی طرح اور بھی اکادمیاں ہیں جو اپنے فنکاروں کو اعزاز دیتی ہیں۔ کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، اقبال سمان، گیان پیٹھ، سرسوتی سمان اور ویش بھارتی یہ ایسے اعزازات ہیں جو بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اعزازات سے فنکاروں کو نہ صرف حوصلہ ملتا ہے بلکہ انھیں اور بھی کچھ نیا کرنے کے لیے یہ ایوارڈ مہمیز کرتے ہیں۔ انھیں ایک طرح سے قلبی تسکین بھی ملتی ہے کہ انھیں ان کی محنتوں کا کچھ تو صلہ ملا۔ قومی اردو کونسل نے بھی اسی سلسلۂ تحسین و اعتراف کو آگے بڑھاتے ہوئے زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں خدمات کے اعتراف کے لیے 2017 سے سالانہ ایوارڈ اسکیم کے آغاز کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ جب تک فنکاروں کی صحیح معنوں میں قدر افزائی نہیں ہوگی تب تک ہمارے ادب و ثقافت کا یہ کارواں آگے نہیں بڑھے گا۔ ہمیں اپنے معاشرے کے بہترین فنکاروں اور تخلیق کاروں کی قدر و تحسین کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے کہ اس عمل سے صرف ادیبوں کو ہی نہیں زبان و ادب کو بھی نئی زندگی ملتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ادبی دنیا قومی اردو کونسل کے اس نئے سلسلے کو پسند کرے گی۔ اس اسکیم کو بہتر بنانے کے لیے ہمیں عمدہ تجاویز اور مشوروں کا بھی انتظار ہے۔

اس شمارے میں نومبر کی کچھ اہم ادبی اور علمی شخصیات کے حوالے سے تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ کوشش تو یہ تھی کہ اس ماہ سے متعلق جتنی بھی شخصیات ہیں سب کا احاطہ کیا جائے مگر صفحات کی تنگ دامنی کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ آئندہ بھی اس طرح کے سلسلے جاری رہیں گے۔ آپ کو یہ سلسلہ پسند آئے تو ہمیں اپنے مشوروں سے ضرور نوازیں۔

ارتضیٰ

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

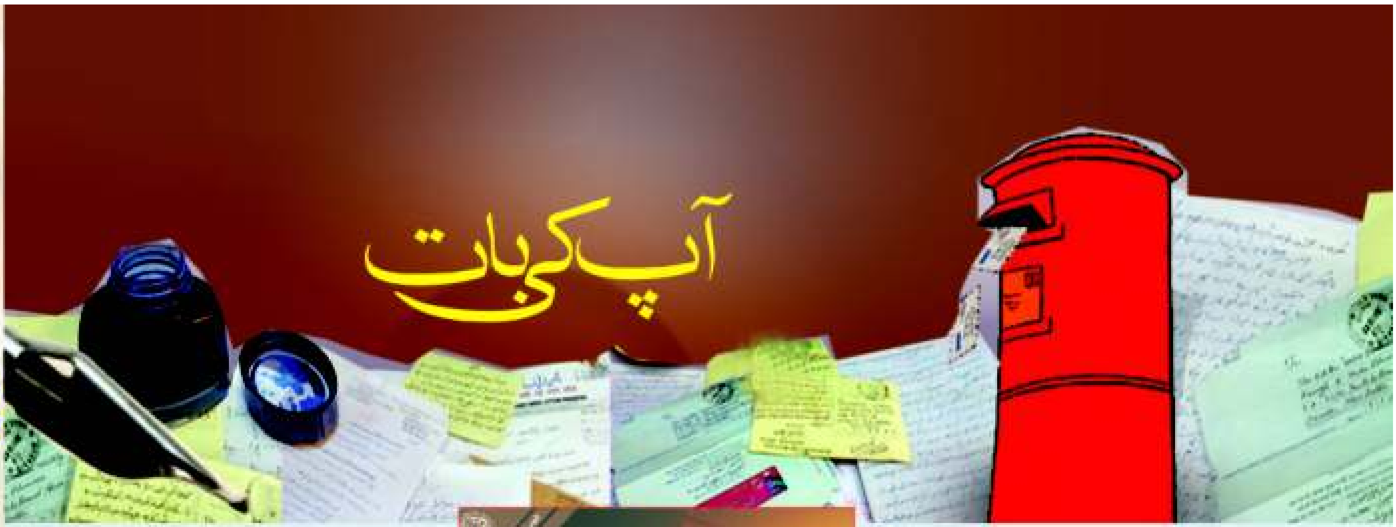

# آپ کی بات

اکتوبر کا شمارہ نظر نواز ہوا، آپ کے اداریے کے توسط سے علم ہوا کہ کونسل پرانی اور نادر کتابوں کی از سر نو اشاعت کا جامع منصوبہ بنا رہی ہے۔ مکتبہ جامعہ کی کتابوں کو دوبارہ شائع کرکے آپ نے ہم طلبا کا ایک بڑا مسئلہ حل فرما دیا تھا۔ اب اسی پروگرام کو آگے بڑھاتے ہوئے منشی نول کشول پریس اور دیگر اشاعتی اداروں کی کتابوں کو دوبارہ شائع کرنے کے اس منصوبے کو اگر ایمانداری سے عملی جامہ پہنایا جائے تو اس کا والہانہ استقبال ہوگا۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے بھی 1948 کے پولیس ایکشن کے بعد لائبریری میں آگ لگنے کے جانکاہ حادثے تک تقریباً ساڑھے تین سو کتابیں شائع کی تھیں۔ ترجیحاتی طور پہ اگر ان کتابوں کو تلاش کر کے دوبارہ شائع کیا جائے تو یقیناً یہ بڑی خدمت ہوگی۔ یہ انتہائی اہم کتابیں تھیں اور باکمال شخصیتوں کے ذریعے تیار کی گئی تھیں۔ عبدالماجد دریابادی (فلسفہ) قاضی تلمذ حسین (سیاسیات) محمد الیاس برنی (معاشیات) سید ہاشمی فرید آبادی (تاریخ) چودھری برکت علی (سائنس) قاضی محمد حسین ریگلو (ریاضی) ظفر علی خان، عبدالحلیم شرر، نظم طباطبائی، خلیفہ عبدالحکیم اور مولانا مودودی جیسی نابغہ روزگار شخصیات نے اس اہم ادارے سے جڑ کر وقیع لٹریچر کو تیار کیا تھا۔ اس لیے کونسل کے اس اشاعتی پروگرام میں ترجیح دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی کتابوں کو حاصل ہونی چاہیے۔

اسی کے ساتھ اکتوبر کے شمارے سے دوسری خوش کن خبر یہ ملی کہ کونسل سوشل سائنس کی کلاسیکی کتابوں کی اشاعت کو ترجیح دے گی، میرے جیسے سیکڑوں طلبا ہیں جو اردو ذریعہ تعلیم سے ہونے کے باوجود یو پی ایس سی جیسے باوقار سول سروسز کے امتحانات میں اردو میڈیم سے امتحان لکھنے کی ہمت نہیں کر پاتے۔ دیسیوں کو تو راقم ذاتی طور سے جانتا ہے۔ وجہ ہے ہندی، انگلش کے مقابلے میں اردو میں سوشل سائنس کی معیاری کتابوں کی عدم دستیابی۔ کونسل کے اس اقدام سے تو کسی حد تک یقیناً اس کمی کی تلافی ہو

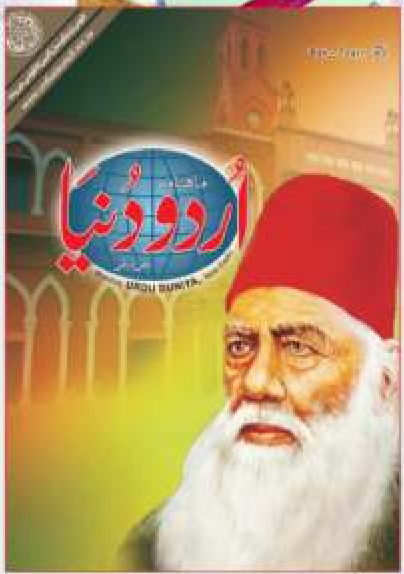


جائے گی۔ ہمیں آپ کی پیش رفت کا شدت سے انتظار رہے گا۔

زیر نظر شمارے میں پروفیسر علیم اللہ حالی سے فاروق اعظم قاسمی کے ذریعے لیے گئے انٹرویو کے ساتھ ساتھ عظیم اللہ ہاشمی کا مضمون 'پروین شاکر کی شاعری میں سائنسی اصطلاحات'، محمد اکمل خان کا مضمون 'کلام غالب میں سائنسی اشارات'، رفیعہ سلیم کا مضمون 'حیدرآباد میں اردو افسانہ' معلومات افزا اور محققانہ ہیں۔

❖ **شاہد حبیب فلاحی**: ریسرچ اسکالر، مانو لکھنؤ کیمپس، یو پی

اکتوبر ماہ کا شمارہ سر سید احمد خاں کے گوشے پر مبنی ہے۔ اس بار کے اداریے میں مدیر نے اہم موضوعات کو نشان زد کیا ہے۔ مثلاً زبان و بیان کے علاوہ پرانی کتب کی اشاعت ثانی واقعی ایک فوری تقاضا ہے۔

اس شمارے کے بقیہ تمام مشمولات معیاری ہیں، تاہم اس ناچیز کو ڈاکٹر محبوب حسن کا انگریزی ادیبہ محترمہ جین آسٹین کے ناولوں پر مبنی مضمون ازحد پسند آیا ہے۔ ان کے مشہور زمانہ ناول 'پرائڈ اینڈ پریجوڈس' پر ایک ہندی سیریل نصف صدی قبل دہلی دوردرشن سے کئی قسطوں میں نشر ہو کر مقبول عام ہوا تھا۔

محترمہ شبنم حمید نے الہ آباد کے تناظر میں اردو شعرا کے منتخب اشعار درج کیے ہیں، مثلاً وحید الہ آبادی کا یہ شعر تو زبان زد یا ضرب المثل ہی ہو چکا ہے۔ ''ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا/ دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو''۔ اسی طرح نوح ناروی کی غنایت مصرعوں کو روزمرہ کے مشاہدات و تجربات کے آئینے میں ہمیشہ ہی منعکس دیکھا جاتا رہا ہے۔

اس شمارے میں شائع میرے خط میں عجلت میں ہی 'ہلکی ٹھنڈی تازہ ہوا' نام کے شعری مجموعے کو ضمیر کاظمی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے، جبکہ یہ مجموعہ تو جناب ظفر گورکھپوری (ص 51) کا ہے۔ اس غلطی کے لیے راقم الحروف معذرت خواہ ہے۔

❖ **کرشن بھالوک**: کوٹھی نمبر A-201، گلی نمبر A-18، گورو نانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' ستمبر کا شمارہ ملا۔ زیر نظر شمارے کے اداریے 'ہماری بات' میں مدیر محترم نے اردو زبان و ادب کی اہمیت کا مختصر و موثر احاطہ کرتے ہوئے ادب کو معاشرۂ عالم کی بنیاد گردانا ہے جو برحق ہے۔ بالیقیں ملک کی تعمیر اور بقا میں زبان و ادب نے روز اول ہی سے اپنا کردار نبھایا ہے۔ بغیر ادب کے نہ تعلیم و تمدن نہ سیاست نہ ثقافت نہ معاشرت، یہاں تک کہ مذہبوں کی بنیاد بھی نامکمل و بودی ہیں۔ زبان و ادب نے ہی خدا اور بندے کی عظمت سے روشناس کرایا، طبقاتی عصبیت اور منافرت کی ظلمات سے بچا کر عالم انسانی کو منصۂ شہود پر مجلّی کیا۔ مدیر محترم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' اور 'البلاغ' رسائل کو قومی اور سیاسی شعور کی بیداری کا منبع بتایا ہے جبکہ ان سے بہت پہلے 1700 اور 1800 کے درمیانی دہوں میں نول کشور پریس سے پہلا اخبار 'اخبار عالم' منظر عام پر آچکا تھا۔ اس کے بعد بیسیوں رسائل اور گزٹ،

اخبارات اور صحافت کی تاریخ میں اپنے کارہائے نمایاں سے متعارف و مقبول ہو چکے تھے لیکن ان سب صحافیوں کی صفوں میں بقول مدیر محترم مولانا آزاد کے صحافتی کارنامے صفِ اول میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ بے شک مدیر محترم ہمارے ادیبوں اور دانشوروں نے ان تعصبات اور منافرت کے خلاف دم آخر تک جنگ لڑی ہے اور ملک کی سالمیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ ہندوستان کی تعمیر کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں انھیں کی تخلیقات و تصنیفات نے ہر محاذ پر اپنا جادوداں رول ادا کیا ہے اور کرتے رہیں گے۔

پروین کمار اشک کی شاعری پر قدوس جاوید اور پریمی رومانی نے اپنی فکری اور احساسی کرنوں کا دوشالہ بچھایا ہے جو واقعی قابل دید ہے۔ پروفیسر نیر ناچیز کے اچھے اور نیک دوستوں میں تھے۔ مقالوں کی دنیا میں موضوعات کو مختصر ترین جادوئی بیانات میں پیش کرنے کے کمال سے واقف تھے۔ غالباً 2007 میں غالب کے سمینار میں غالب کے گھر اور گلی کا نقشہ بڑے خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کیا تھا جس کا اعتراف پروفیسر شمس الرحمن فاروقی نے اپنی صدارتی تقریر میں کیا تھا۔ موصوف اردو افسانوں کی آفاقی جہتوں کے دلدادہ تھے۔ قمر صدیقی نے نیر صاحب کی افسانوی قدروں کا بہت خوب جائزہ لیا ہے۔ تمل زبان میں اردو تخلیقات کے تراجم والا مضمون تمل اور اردو زبان کے علمبردار حضرت مختار بدری اور مرحوم سجاد بخاری کی تخلیقات کا چربہ ہے۔ خواجہ احمد عباس کی یادوں کو شیخ رحمن نے بڑے تیکھے اور نرالے انداز میں روشن کیا ہے۔ اختر الایمان والا مضمون بھی پسند آیا۔

**علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی، تمل ناڈو

ستمبر کا 'اردو دنیا' ملا۔ حسب سابق دلچسپ معلوماتی اور جاذبِ نظر ہے۔ اصطلاحات فہمی، تدوین کے اصول و مباحث، تمل زبان میں اردو تخلیقات کے تراجم، کلام نانک میں وحدانیت اور ثمار ایک دوائی غذا بہت پسند آئے۔ دنیا مابعد جدیدیت کی حدیں چھو رہی ہے مگر اردو داں قاری کو نہ اردو پڑھنے کی فرصت ہے اور نہ اردو اخبار خریدنے کی وہ زحمت گوارا کرتا ہے۔ اردو کو تجارتی انداز سے ترقی دینی ہوگی تبھی اردو کا فروغ ہوگا۔

**عبدالرشید ٹھاکر**: حاسنڈار، ویری ناگ، اننت ناگ، جموں وکشمیر

'اردو دنیا' اگست میں پروفیسر محمد اسلم اصلاحی نے جو صفحہ 8 پر آرٹیکل ہمارے اولین وزیر تعلیم اور فکر مند عالم جناب مولانا ابوالکلام آزاد پر جو معلومات مہیا کی ہے وہ

ہمارے سماج کے لیے فائدے مند ثابت ہوں گی۔ NCPUL کا یوم آزادی پر خصوصی شمارہ نکلنا تعریف کے لائق ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ماہ اگست کی میگزین میں گھر ہی پر بیٹھ کر 'پرسنل کمپیوٹر' کے بارے میں بہت کچھ آسانی سے سیکھنے کو ملا۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ 'اردو دنیا' محض 15 روپے پر ہمارے ریڈرس کو مل رہی ہے، یہ NCPUL کی طرف سے بڑی نعمت ہے۔ 'خبرنامہ' کے صفحات مجھے بہت اچھے لگتے ہیں جو قومی اردو کونسل کا ڈیجیٹلائزیشن ہے۔ اتنے طویل عرصے سے 'اردو دنیا' کی اشاعت اس بات کی دلیل ہے کہ اردو دنیا کے پاس لکھنے اور پڑھنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ اٹھارہ سو ستاون اور بہادر شاہ ظفر (سعدیہ پروین) بہت اچھا لگا، قلم کا سپاہی شاہد رام نگری (ایم رحمت اللہ)، ایک بے باک صحافی پر مضمون صحافتی دنیا کو آئینہ دکھاتا ہے۔ اردو میں سائبر سماج کا حصہ (خان محمد آصف)، سے بہت ساری اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ خواجہ عبدالمنتقم (چکبست کے کلام میں جذبہ حب الوطنی) فدا وطن پے جو ہوا آدمی دلیر ہے وہ، جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ۔ اس سے اپنے وطن سے محبت کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔

**وہاج الدین غوری**: طالب علم اترپردیش اردو اکادمی، گومتی نگر، لکھنؤ

بات اتنی پرانی بھی نہیں، مئی 2017 کے شمارہ میں ایک مضمون بعنوان ادبی تراجم کی روایت شائع ہوا ہے (اردو سے مراٹھی اور مراٹھی سے اردو کے حوالے سے) لگا، مضمون تحقیقی ہوگا، لیکن پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ ممبئی یونیورسٹی میں پروفیسر صاحب نے اردو۔ مراٹھی ترجمہ کے ذیل میں، سارا زور مراٹھی سے اردو ترجمہ پر لگا دیا۔ اردو سے مراٹھی کے باب میں سرسری گزر گئے! شری پاد جوشی کے تعلق سے لکھا کہ، قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا کا مراٹھی ترجمہ کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اردو ناول کے محض کچھ حصوں کا ترجمہ کیا، مکمل ناول کا نہیں۔ کرشن چندر کے ناول شکست کے مراٹھی ترجمہ کا تذکرہ بھی ہے، لیکن یہ نہیں لکھا کہ کس نے اور کب ترجمہ کیا؟ نامور افسانہ نگار اور صحافی ساجد رشید نے مراٹھی ناول جھاڑا جھڑتی کا اردو ترجمہ کیا، اس کا تذکرہ مضمون میں نہیں!

حال ہی میں مشہور ادیب قاضی مشتاق احمد کے انعام یافتہ ناول فٹ پاتھ کی رانی کا مراٹھی ترجمہ بعنوان فٹ پاتھ چی رانی کہنہ مشق افسانہ نگار اور مترجم رشید قاسمی نے کیا۔ اردو اخبارات اور ماہنامہ بیباک (مالیگاؤں) میں یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی۔ اس تحقیقی مضمون میں اس کا تذکرہ کیوں نہیں کیا گیا؟ اگر کرشن چندر کے ناول کے ترجمہ کی اطلاع صحیح نہیں ہے تو، فٹ پاتھ کی رانی کا ترجمہ کسی بھی اردو ناول کا اولین مکمل مراٹھی ترجمہ ہے۔ مراٹھی زبان سے اردو تراجم خوب ہوئے۔ اردو زبان سے مراٹھی تراجم خال خال ہی ہوئے۔ وہ بھی محض افسانوں کی حد تک۔ اس مضمون میں غیر اردو ترجمہ نگاروں کے نام تو بہت تفصیل سے گنائے گئے، اردو داں مترجمین کے ذیل میں محض کوکن اور ممبئی کے مترجمین کے اسمائے گرامی ہی نظر آتے ہیں۔ مہاراشٹر میں تو کئی قلمکاروں نے مراٹھی مضامین، منظومات اور کہانیوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا، وہ کیوں بھلا دیے گئے؟

**قیوم اثر**: 168، شیواجی نگر، جلگاؤں، مہاراشٹر

ہر سال اخبارات میں یونیورسٹیوں کی عالمی رینکنگ کے تعلق سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ عالمی معیار پر تیار کی گئی فہرست میں ہمارے ملک کی ایک بھی یونیورسٹی شامل نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم جیسے لوگوں کو مطلوبہ معیار جانچنے کا طریقہ معلوم نہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں سوائے افسوس کے اور کیا کر سکتے! عموماً اخبارات میں اس تعلق سے معلومات نہیں دی جاتی۔ ہندی اور انگریزی زبان کے اخبارات میں شاید کچھ شائع ہوتا ہو تو اس کا علم نہیں۔ راقم السطور اردو اخبارات و رسائل کا معمولی درجہ کا قاری ہے اس کے علاوہ محدود مطالعہ ہونے کی وجہ سے ادبی و معلوماتی مواد پر نظر کچھ کم ہے۔ 'اردو دنیا' میں پہلی بار اس موضوع پر تفصیلی تحریر پڑھنے کو ملی۔ پی ایف رحمان صاحب نے محنت کی ہے۔ یہ مضمون بے حد معلوماتی ہے۔

**یعقوب الرحمن**: ایوت محل (مہاراشٹر)

مراٹھی: نندنی آتم سدھ
اردو ترجمہ: مزمل سرکھوت

# پروفیسر عبدالستار دلوی سے ایک ملاقات

زبان پر کوئی مہر مرتب نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کا احترام کرنا چاہیے۔ زبان ہی کی وجہ سے باہمی گفت وشنید اور مکالمے بار پاتے ہیں۔ زبانوں کو لے کر نا اتفاقی پیدا کرنے سے تہذیب بھی متاثر ہوتی ہے۔ لسانی رفاقت انسانی رفاقت کو مضبوط بناتی ہے۔ زبان سے محبت کرنے والے، اس کی حفاظت کرنے والے، اس کی دن دونی ترقی کے لیے ہر وقت متحرک لوگ تقریباً ہر زبان کو میسر ہیں۔ ایسے لوگوں ہی کی وجہ سے زبان کا وجود اور اس کا پیرہن قائم رہنے اور اس کے بامعنی ہونے میں مدد ملتی ہے۔ اردو زبان کے بھی کئی محب اور ادیب ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اردو زبان ہندوستان کا دنیا کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے۔

ادیب اور مترجم ڈاکٹر عبدالستار دلوی اردو کے مختلف شعبہ ہائے ادب میں قابلِ رشک خدمات انجام دینے اور مختلف زبانوں میں آپسی ربط وضبط بڑھانے کے لیے معروف ہیں۔ ڈاکٹر دلوی کوکن سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں اردو اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ فی الحال وہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کے ڈائریکٹر ہیں۔ اس سے قبل وہ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر ممبئی میں بحیثیت ڈائریکٹر فرائض انجام دے چکے ہیں اور شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی کے صدر شعبہ کی ذمے داریاں بھی سنبھال چکے ہیں۔ اردو زبان وادب میں تحقیق وتنقید کے ساتھ ساتھ انھوں نے مراٹھی۔ سنسکرت زبانوں سے گراں قدر ادب پاروں کے اردو میں تراجم بھی کیے ہیں۔ تراجم کے میدان میں کیے گئے ڈاکٹر دلوی کے کارنامے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ کئی برس پہلے مشہور ادیب اور مورخ سیتو مادھوراؤ پگڑی نے انجمن اسلام میں منعقد ایک سمینار میں کہا تھا کہ اردو سے مراٹھی زبان میں ترجمے ہوتے ہیں اور خوب ہوتے ہیں، مگر مراٹھی سے اردو میں ترجمے نہیں ہوتے، حالانکہ ہونے چاہیے، جس سے اردو کا بھی فائدہ ہی ہوگا۔ یہ بات دلوی صاحب کے دل میں اتر گئی اور ارادہ کیا اور پوری دلچسپی اور دلجمعی کے ساتھ انھوں نے مراٹھی سے اردو تراجم کی شروعات کی۔ ادبی رسائل میں ان کے تراجم شائع ہونے لگے اور کچھ کتابی صورت میں بھی منظر عام پر آئے۔ مراٹھی کی 50 تا 60 نظموں کے اردو تراجم انھوں نے کیے۔ جس میں سنت گیانیشور کی نظم 'پسائیدان' بھی شامل ہے۔ پ.ش. رینگے کے ناول

ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں زبان پر سیاست بھی کی جاتی ہے۔ زبان حقیقی گفتگو کا ذریعہ ہے، راستہ ہے۔ مگر زبان کو لے کر ہمارے یہاں تصادم اور ٹکراؤ کے حالات پیدا کیے جاتے ہیں، جس کے پیچھے مختلف سیاسی مقاصد ہوتے ہیں۔ باہمی گفتگو، سب زبانوں کے احترام کی روایت، زبانوں کے متعلق وسیع المشربی کے جذبات کی بجائے غیر ضروری کینہ وکپٹ بھی پایا جاتا ہے۔ اس موضوع پر سیاست کرنے والے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نقصان زبان کا ہوتا ہے۔ جنوب میں ہندی سے مغائرت، مہاراشٹر کے سرحدی علاقوں میں زبانوں کے اختلافات، سنسکرت جیسی عظیم زبان کو مذہبی تنگ نظری کی بھینٹ چڑھانے سے جو ناانصافی ہوئی ہے، یہ سب اسی رجحان کی مثالیں ہیں۔ زبان اور مذہب کے دانستہ اختلاط کی وجہ سے اردو زبان کے ساتھ بھی کئی برسوں سے ناانصافی ہو رہی ہے۔ اردو پر یہ مہر لگا دی گئی کہ ''اردو مسلمانوں کی زبان ہے''، اور اسے ایک خاص رنگ میں رنگ دیا گیا۔ اردو در حقیقت ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی ہے۔ عربی۔ فارسی کے الفاظ، تراکیب اور مقامی بولیوں کے امتزاج سے اردو بنی ہے۔ یہ ایک نئی زبان ہے۔ اٹھارویں صدی میں اس نے اپنا وجود منوایا۔ فارسی زبان کے زیرِ اثر یہ زبان مقامی بولیوں کے ساتھ تعلقات بناتے ہوئے عوامی زبان کے روپ میں ابھر رہی تھی۔ دکھنی، گجری اس کے پیکر مانے گئے ہیں۔ مگر شمالی ہند میں اس کی وسعت اور ترقی نے ہندی سے اسے قریب کر دیا۔ ہندی اور اردو دونوں ساتھ ساتھ پروان چڑھی ہیں۔ کئی برسوں سے دونوں زبانوں کے استحکام اور یکساں ترقی پانے کے بعد اس بات پر بحث بے معنی ہے کہ پہلے کون سی زبان وجود میں آئی۔ بنا بریں اردو کو ہندی کا عربی رسم الخط سمجھنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ عقلمندی اسی میں ہے کہ ان دو زبانوں میں ٹکراؤ سے بچتے ہوئے دونوں سے محبت کی جائے، دونوں کا احترام کیا جائے۔ اس پر توجہ مبذول رکھی جائے کہ کس طرح ہر دو زبانوں کی ترقی ممکن ہے۔ ویسے بھی کسی بھی

'ساوتری' اور 'اولوکتا' کا اردو ترجمہ کیا۔ دلوی صاحب نے وشرام بیڈیکر کے ناول 'رن آنگن' کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے، جس کے لیے انھیں ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ملا۔

ڈاکٹر دلوی صرف ایک مترجم ہی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اردو میں تحقیق اور تنقید کے میدانوں میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ممبئی یونیورسٹی میں وہ بانی پروفیسرو صدر شعبہ رہے اور حیدرآباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بھی مہمان پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ مصر کے شہر قاہرہ کی ایک تعلیمی درسگاہ عین شمس یونیورسٹی میں شعبہ اردو کو ممیز دینے کے لیے حکومت ہند نے ان کی خدمات حاصل کی۔ وہاں دو سال مسلسل جدوجہد سے عین شمس یونیورسٹی کے شعبہ اردو کو فعال بنایا اور اسے ترقی کی شاہراہ دکھائی۔ شعبے میں تحقیقی رجحان پیدا کیا، کتب خانے کو کارآمد بنایا۔ استاد کی حیثیت سے ڈاکٹر دلوی طلبا میں ہمیشہ مقبول رہے، وہ ممبئی رہے، حیدرآباد ہو چاہے قاہرہ، طلبا میں آپ ہر دلعزیز رہے۔

فی الحال دلوی صاحب جس تحقیقی ادارے سے وابستہ ہیں وہ 60 سال پرانا ادارہ ہے۔ آزادی کے فوراً بعد اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اردو میں تحقیقی رجحان کو رفتار دینے اور اردو کی ترقی کے اقدامات اس ادارے کے بنیادی مقاصد تھے۔ اردو کے قدیم مخطوطات کی چھان پھٹک، اردو کتب خانے کی ترتیب، سہ ماہی 'نوائے ادب' کی اشاعت، مختلف ادبی نشستوں کا انعقاد اور اردو میں تحقیق کرنے والے طلبا کے لیے وظیفوں کا انتظام جیسے اہم کام ادارے کے زیر اہتمام جاری ہے۔ ادارے کے دفتر میں دلوی صاحب سے ملاقات کی۔ اردو زبان اور اس سے متعلق کئی گوشوں پر دلوی صاحب نے کھل کر بات کی۔ انھیں ادارے کی ذمے داری سنبھالے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے مگر انھوں نے کئی منصوبے بنا رکھے ہیں اور ان کو بروئے کار لانے کا عزم بھی رکھتے ہیں۔

**نندنی آتم سدھ**: اس اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے متعلق بتائیے۔ ایسے تحقیقی ادارے کی ذمے داری سنبھالتے ہوئے آپ کی سوچ کیا تھی؟

**پروفیسر عبدالستار دلوی**: اردو زبان و ادب میں تحقیق کو فروغ دینے کی غرض سے اس ادارے کا قیام عمل میں آیا ہے۔ میں خود اردو زبان و ادب میں تحقیق کے لیے متفکر رہا ہوں۔ سبکدوشی کے بعد ایسے تحقیقی ادارے سے جڑنا ایک اطمینان بخش احساس دلاتا ہے۔ اس ادارے کے توسط سے اردو کے لیے کئی منصوبے میرے ذہن میں ہیں۔ اردو زبان ملک کے بیشتر علاقوں میں درجہ قبولیت حاصل کر چکی ہے، علاقائی زبانوں سے رسم وراہ

کئی ملکوں میں اردو کو سہارا ملا ہے ،اس کی وجہ ہجرت کا امنڈتا سیلاب ہے ۔اس زبان کے بولنے والے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے روزمرہ میں وہ اس زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ عرب ممالک، جنوب وسطیٰ کے ممالک، کناڈا جیسی جگھوں پر اردو ہجرت ہی کی وجہ سے بار پاسکی ہے۔ میں اس کو اردو کی نئی بستیاں کہتا ہوں۔ لوگ حیرت کا اظہار کرتے ہیں جب دیکھتے کہ سویڈن میں، امریکہ میں اردو پھل پھول رہی ہے۔

بناتے ہوئے اس نے اپنی ترقی کو یقینی بنایا ہے۔ اردو کے متعلق ان ساری جزئیات کی تحقیق اس ادارے کے مقاصد میں شامل ہے، پھر چاہے وہ اردوئے قدیم ہو، گجری ہو، دکھنی ہو یا آج کی تطہیر شدہ اردو زبان ہو۔ اس ادارے کا قیام 1947 میں عمل میں آیا۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی ادارے کے پہلے ڈائریکٹر تھے۔ 1957 میں ہنگامہ غدر یا پہلی جنگ آزادی کے سو سال مکمل ہوئے تھے اور اس مناسبت سے ادارے کی جانب سے ''جنگ آزادی یا تحریک آزادی میں اردو زبان کا حصہ'' کے عنوان پر ایک خصوصی دستاویز شائع کی گئی تھی۔ اس برس تحریک آزادی کے 150 سال پورے ہو رہے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ادارے کے رسالے (نوائے ادب) میں مزید اہم مضامین اس تعلق سے شامل کر کے نئی آب وتاب کے ساتھ اسے شائع کیا جائے۔

**ن آ س**: آپ نے کئی اہم منصوبے بنائے ہیں اور اس مختصر وقت میں بھی کئی اہم کام سرانجام دے چکے ہیں۔ اردو تحقیق کے تئیں آپ نے کوئی مثبت پیش رفت محسوس کی ہے؟ کوئی مثبت ردعمل سامنے آیا ہے؟

**عبدالستار دلوی**: جی ہاں! اردو کے بہت اچھے قاری ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی ہی رہی ہے۔ حال ہی میں ہم نے ''اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں پر فارسی کا اثر'' پر ایک سیمینار منعقد کیا، جس کا کافی حوصلہ افزا ردعمل ہم تک پہنچا۔ آئندہ ہم چاہتے ہیں لوگ اس جانب متوجہ ہوں کہ کس طرح اردو ادب کے مختلف گوشوں پر تحقیق کی جائے۔

**ن آ س**: آپ کے مطابق آج اردو زبان کس حال میں ہے؟ کیا زبان کی سیاست سے اردو کو نقصان ہو رہا ہے؟ ممبئی میں اردو کو ہمیشہ پیار ملا ہے۔ تاہم آج کی صورت حال پر روشنی ڈالیے۔

**عبدالستار دلوی**: ممبئی اور اردو کا کافی قریبی تعلق ہے۔ اس شہر نے اردو کو ہمیشہ عزت دی ہے، پیار دیا ہے۔ اردو ایک زندہ زبان ہے۔ ممبئی کی فلمی صنعت نے بھی اردو کی عوامی مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دراصل اردو مہاراشٹر میں بہتر حالت میں ہے۔ تقسیم ہند سے قبل شمالی ہند میں اردو ایک مقبول زبان رہی ہے۔ اس وقت ہندی اور اردو والے ایک دوسرے کی زبان سیکھنا ضروری تصور کرتے تھے۔ اچھی ہندی کے لیے اردو زبان کا آنا لازمی ہے اور اچھی اردو بولنے کے لیے ہندی کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ لیکن اس کے بعد سیاست کی وجہ سے اردو کو نقصان پہنچا۔ خاص طور پر شمالی ہند کے اتر پردیش صوبے میں اردو ذریعہ تعلیم کا کوئی اسکول نظر نہیں آتا، مدھیہ پردیش میں کچھ اسکول اردو میڈیم کے ہیں۔ بہار میں بھی اردو سے اس طرح پرہیز نہیں کیا گیا ہے۔ یہاں اردو کی صورت حال قدرے بہتر ہے۔ مہاراشٹر نے اردو کی کھل کر حمایت کی ہے۔ سرکاری ماتحتی میں چلنے والے چار سو سے زائد اردو ذریعہ تعلیم کے ہائی اسکول اور کالج موجود ہیں۔ پرائمری اسکولوں کی تعداد دو سے ڈھائی ہزار تک پہنچتی ہے۔ صرف ممبئی میں مہانگر پالیکا کے زیر اہتمام دو سو اسکول کامیابی کے ساتھ جاری ہیں، علاوہ ازیں یہاں اردو اکادمی بھی موجود ہے۔

**ن آ س**: مگر ایسا کیوں کہا جا رہا ہے کہ اردو روبہ زوال ہے؟ انگریزی کے شدید اثر نے جس طرح دوسری ہندوستانی زبانوں کو متاثر کیا ہے، کیا ایسا کہا جا سکتا ہے کہ اردو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے؟ اردو کے مستقبل کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

**عبدالستار دلوی**: مجھے تو اردو کا مستقبل تاریک نظر نہیں آتا۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں اس کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔ مگر اردو کے چاہنے والے بھی کم نہیں ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ زبان کی حیثیت سے اردو روبہ زوال ہے۔ اردو پڑھنے والے اور اردو کے چاہنے والے آج بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

**ن آ س**: عالمی سطح پر اردو پڑھی جاتی ہے اور اسے پسند کیا جاتا ہے۔ یہ بتائیے کہ کن ممالک میں اردو استعمال کی جاتی ہے اور اسے باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے؟

**عبدالستار دلوی**: کئی ملکوں میں اردو کو سہارا ملا ہے، اس کی وجہ ہجرت کا امنڈتا سیلاب ہے۔ اس زبان کے بولنے والے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے روزمرہ میں وہ اس زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ عرب ممالک، جنوب وسطیٰ کے

ممالک، کناڈا جیسی جگہوں پر اردو ہجرت ہی کی وجہ سے بار پا سکی ہے۔ میں اس کو اردو کی نئی بستیاں کہتا ہوں۔ لوگ حیرت کا اظہار کرتے ہیں جب دیکھتے کہ سویڈن میں، امریکہ میں اردو پھل پھول رہی ہے۔ نیویارک سے اردو کا روزنامہ 'اردو ٹائمز' شائع ہو رہا ہے، لندن سے 'جنگ' اور 'اخبار وطن' نامی اردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ لندن میں اردو نصاب کا حصہ ہے، دسویں اور انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اردو پڑھائی جا رہی ہے، یہاں اردو اپنے شباب پر ہے۔

**ن آ س**: علاوہ اس کے کئی ممالک میں اردو کے ادیب اور خدمت گار موجود ہیں۔ خاص طور پر رالف رسل جیسے اردو کے قدیم رسیا اور اہم ادیب لندن ہی کے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کا اطمینان بخش مطالعہ کیا تھا، اسے انگریزی روپ میں وسعت دی۔ اور اردو ادب کو عالمی سطح پر متعارف کروایا۔ غالب کی شاعری کا ترجمہ اور اس کی تشریح کو سراہنا ضروری ہے، خوب کام ہے۔ ایسے بے لوث خدمت گاروں کو بھی اردو کی وسعت اور عالمی مقبولیت میں اہم حصہ دار مانا جانا چاہیے، کہ نہیں؟

**عبدالستار دلوی**: بالکل! رالف رسل جیسے عالم اور ادیب اردو ادب میں اہم مقام کے حامل ہیں۔ میں انھیں اپنا استاد سمجھتا ہوں۔ انھوں نے اردو ادب کا بھر پور مطالعہ کیا اور اسے دنیا کے روبرو کرایا۔ دوسرے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز۔ اردو زبان کی جانب ان کے التفات کی ایک عجیب کہانی ہے۔ درحقیقت وہ گریک اور لاطینی زبان میں گریجویٹ ہیں۔ لندن میں وہ اپنے جن دوستوں کے ساتھ قیام پذیر تھے ان میں ایک ہندوستانی اور ایک پاکستانی تھا۔ وہ دونوں باہم اردو میں گفتگو کرتے۔ ڈاکٹر میتھیوز کو یہ زبان پیاری لگی۔ چنانچہ انھوں نے اسے سیکھا۔ دلچسپی بڑھی تو انھوں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا۔ یہاں صرف ایک زبان کے سیکھنے کی جستجو نظر آتی ہے، دوسرا کوئی پہلو منظر میں ہے ہی نہیں۔ بغیر سرحد کی روک ٹوک کے اور بغیر کسی مادی نفع نقصان کی پرواہ کے اردو سیکھنے والے تھے یہ لوگ، تو اردو کو ایسے چاہنے والے ملے اسی لیے اس کی عالمی سطح پر تشہیر ہوئی اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ دنیا کی کئی زبانوں میں اس کی تخلیقات کے ترجمے ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔

**ن آ س**: ترجمے کی بات کریں تو مراٹھی تراجم کے سلسلے میں آپ کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ ان تراجم کا اردو میں کس طرح استقبال ہوا ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ نے بھرتری ہری کی تین سو نظموں میں سے منتخب کلام کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، یہ کس طرح ممکن ہوا؟ کیا آپ سنسکرت زبان سے واقف ہیں؟

**عبدالستار دلوی**: میں سنسکرت نہیں جانتا۔ مگر بھرتری ہری سے واقف تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو کے ممتاز شاعر علامہ اقبال بھرتری ہری سے کافی متاثر تھے۔ میں جانتا ہوں کہ اقبال نے کئی جگہوں پر بھرتری ہری سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ بھرتری ہری سے اردو محروم نہ رہ جائے یہی میرا جذبہ تھا۔ اقبال اپنی طویل فارسی مثنوی 'جاوید نامہ' میں آٹھ صدی قبل کے فارسی کے عظیم شاعر رومی کو لے کر مختلف دانشوروں سے گفتگو کرتے ہیں۔ عالم افلاک سے لے کر عالم آفاق کی مشہور و معروف ہستیوں سے مکالمہ اس نظم کا پیکر ہے۔ اس میں ان کی بھرتری ہری سے کی گئی (تصوراتی) گفتگو شامل ہے۔ لب لباب یہ کہ علامہ اقبال پر بھرتری ہری کے فن کا اثر تھا۔ اور میرے لیے یہی وجہ کافی تھی بھرتری ہری کو سمجھنے اور ان کے کلام کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے۔ چنانچہ میں نے اپنا کام کر لیا۔ میں نے انگریزی زبان میں بھرتری ہری کا ترجمہ پڑھا تھا۔ یہ ترجمہ باربرا اطر اسٹرولر نے کیا تھا۔ میرے اردو ترجمے میں مجھے ڈاکٹر کمل ویلنکر اور معروف پروفیسر ڈاکٹر بھٹ نے کافی مدد کی۔ ان کی مدد سے میں نے اصل سنسکرت متن بھی پڑھا اور پیش نظر یہ انگریزی ترجمہ بھی ہوتا۔ اس طرح میرا کام آسان ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بھرتری ہری نے تین سو نظمیں کہی ہیں اور اس میں زیادہ تر ہیجان انگیز ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ بھرتری ہری کی تقریباً دو سو نظمیں (شلوک) اسی خوبی سے متصف ہیں۔ میں نے انھیں دو سو نظموں (شلوک) کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ اردو کے قاری بھرتری ہری سے مکمل طور سے واقف ہوں اس لیے میں نے کتاب کا نام "اقبال کا ایک ممدوح: سنسکرت کا عظیم شاعر اور مفکر بھرتری ہری۔ دو سو نظموں کا ترجمہ اور تحقیقی مطالعہ" رکھا۔ بھرتری ہری پر یہ کتاب دو سال پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد رالف رسل نے مجھے فون کیا اور مبارکباد دی۔

**ن آ س**: مصر کے صدر مقام قاہرہ کی ایک یونیورسٹی نے شعبہ اردو کے قیام اور اس کی ترقی کے لیے آپ کی خدمات حاصل کی تھیں۔ یہ بتائیے کہ وہ تجربہ آپ کے لیے کیسا رہا؟

**عبدالستار دلوی**: بہت خوب رہا یہ دورہ۔ وہاں اردو زبان کی تدریس کا نظم تھا۔ مگر باضابطہ تدریس کا فقدان تھا۔ چنانچہ شعبے کا قیام اور اس کے ماتحت کتب خانے کی سہولت کا انتظام جیسے کئی کام تھے۔ وہاں کی حکومت نے ہماری مرکزی قیادت سے اس تعلق سے خط و کتابت کی اور ہماری حکومت نے میرا انتخاب کیا۔ میں اس وقت ممبئی یونیورسٹی میں تھا۔ میں قاہرہ گیا۔ اس وقت ممبئی میں پلیگ کی وبا (1994) پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم کچھ عرصے بعد میں وہاں گیا۔ عین شمس یونیورسٹی قاہرہ میری منزل تھی۔ وہاں میں نے ایم۔اے۔، پی ایچ ڈی کی کلاسس شروع کیں۔ فارسی شعبے میں طلبا کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ مجھے صرف دس طلبا میسر آئے۔ آہستہ آہستہ میرے شعبے میں طلبا کی تعداد چالیس تک جا پہنچی۔ یہ طلبا فارسی سے اردو کی جانب ملتفت ہوئے تھے۔ یونیورسٹی میں اردو کتب خانے کا قیام بھی خاکسار کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ اس دور میں مصر میں ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے اروندھتی گھوش وہاں موجود تھیں۔ ان کا ہر ممکن تعاون مجھے حاصل تھا۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتی تھیں کہ "آپ یہاں ثقافتی سفیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔" واقعی! قاہرہ کے دن شاندار تھے۔

**ن آ س**: اب ہم تھوڑا ماضی میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی آپ کے بچپن میں۔ آپ کو کن سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں کیسا ماحول تھا؟ آپ کی اردو پڑھنے کی ابتدا کے متعلق بتائیے۔ اس سفر کی تفصیل کیا ہے؟

**عبدالستار دلوی**: میں داپولی شہر سے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں دابھیل سے تعلق رکھتا ہوں۔ میری ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں ہوئی۔ اس وقت آس پاس کسی گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ دور و نزدیک کے تقریباً 30-25 گاؤں کے بچے میرے گاؤں کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ کوکن کے دو مشہور اسکولوں میں ایک ہمارا اردو مراٹھی اسکول جو کہ علاقائی بورڈ سے منسلک تھا۔ اسکول کی بنیاد 1868 میں رکھی گئی۔ نہایت قدیم اسکول ہے۔ اسکول کا ذریعہ تعلیم مراٹھی تھا مگر مسلم طلبا کے لیے اردو بھی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی۔ یہ بد بختی تھی کیوں کہ اس کے ذریعے ایک زبان کو خود بخود ایک خاص مذہب سے جوڑا جا رہا تھا۔ چلو یہ بھی سہی۔ میں اردو کی مشق کے ساتھ مراٹھی میڈیم سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ گھر پر بھائی اور دوسرے لوگ اردو اخبار پڑھا کرتے۔ وہ اردو شاعری کو پسند کرتے تھے۔ میرے سامنے نظمیں پڑھ کر سنائی جاتیں، اس کی وجہ سے شاعری میں میری دلچسپی بڑھی۔ تاہم گھر پر بول چال کی زبان کوکنی تھی۔ ثقافتی اور مذہبی تقاریب میں البتہ اردو کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طرح ان تین زبانوں سے میری جان پہچان ہوئی۔

میں جماعت چہارم کے بعد ممبئی چلا آیا۔ یہاں اردو ذریعہ تعلیم تھا۔ میرے بڑے بھائی محمد مراٹھی میڈیم میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انھوں نے سنسکرت سیکھی اور میں نے فارسی۔ بڑے بھائی نے فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ میرے ماموں داؤد دلوی نے بھی سنسکرت سیکھی۔ مراٹھی ہم بھی نے سیکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مقامی زبان وہاں رہنے والوں کے لیے سیکھنی لازمی ہے۔ کثیر اللسانی

کا اپنا فائدہ ہوتا ہے۔ میں نے اسماعیل یوسف کالج سے اردو میں بی اے کیا اور ایم اے کے لیے اردو کے ساتھ عربی زبان کا انتخاب کیا۔ محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات پر میں نے پی ایچ ڈی کی۔ پھر میں لسانیات میں دلچسپی لینے لگا۔ مجھے فیلوشپ ملی اور میں لسانیات میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گیا۔ وہاں سے واپسی کے کچھ عرصے بعد ممبئی یونیورسٹی میں اردو میں لسانیات پر دوسری پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران مجھے اشوک کیلکر، اے ایم گھاڈگے، پروفیسر گجیندر گڈکر جیسے اساتذہ سے کسب علم کا موقع ملا۔

**ن آ س**: مراٹھی ادب کے اردو ترجمہ کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانے والے ستیو مادھوراؤ پگڑی سے آپ کب ملے؟ آئندہ دنوں میں آپ دونوں کے تعلقات میں گرمجوشی رہی۔

**عبدالستار دلوی**: میرے لندن سے واپسی کے بعد انجمن اسلام میں تین دنوں کا اردو زبان و ادب کے موضوع پر سیمنار منعقد ہوا تھا۔ پگڑی صاحب کی تقریر تیسرے دن ہوئی، جس میں انھوں نے مراٹھی زبان و ادب کے اردو تراجم کی فرمائش کی۔ میں اس سے متفق تھا۔ مگر یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس سے پہلے مراٹھی کے اردو تراجم ہوئے ہی نہیں ہیں۔ اس زمانے میں میں جامع مسجد ممبئی کے کتب خانے میں قدیم مخطوطات کی تحقیق میں مشغول تھا۔ اسی تلاش میں مجھے 'من سمجھاون' کا مخطوطہ مل گیا۔ اس کے مطالعے سے میں جان پایا کہ یہ تو 'مناچے شلوک' ہے! میں نے اسے باقاعدگی سے تحریری صورت میں محفوظ کرکے مرتب کیا اور پگڑی صاحب سے ملاقات کی۔ اس وقت وہ الفنسٹن کالج کی عمارت میں بیے گزیٹیر کے دفتر میں ہوتے تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کی روایت کافی پرانی ہے اور 1750 کا پہلا ترجمہ دستیاب ہوا ہے۔ اور اپنی مرتبہ 'من سمجھاون' ان کی خدمت میں پیش کی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور اس وقت سے ہم دونوں کے تعلقات مضبوط ہوئے۔ ان کی رہنمائی مجھے حاصل رہی وہ میرے لیے استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ میری نظر میں وہ کفیل کی حیثیت کے حامل شخص تھے۔ میں اکثر ان سے ملاقات کرتا تھا۔ کئی برس مسلسل ہر اتوار کی صبح آٹھ۔ ساڑھے آٹھ کے درمیان مجھے فون کرتے اور گھنٹوں گفتگو کرتے تھے۔ پگڑی صاحب کا میں ازحد احترام کرتا ہوں۔

**ن آ س**: اردو کے غیر ملکی (مغربی ممالک کے ) عاشق کس شعبہ ہائے ادب میں دلچسپی رکھتے ہیں؟ اردو شاعری انھیں اپنی جانب ملتفت کرتی ہے؟ یا کوئی اور وجہ سے وہ اس جانب راغب ہوتے ہیں؟

**عبدالستار دلوی**: اردو شاعری کی کشش ہندوستانی پاکستانی لوگوں کو زیادہ متوجہ کرتی ہے۔ مغربی لوگ تحقیق میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اگر شاعری پر کام کریں گے تب بھی انداز مطالعہ تحقیقی رہے گا۔ علاوہ اس کے تجارتی مقاصد بھی اردو سیکھنے پر اکساتے ہیں یا مجبور کرتے ہیں۔

**ن آ س**: فی الحال آپ کون سی کتاب تصنیف کر رہے ہیں؟

**عبدالستار دلوی**: اقبال پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ اقبال 1905، 1930 اور 1932 میں ممبئی میں آچکے ہیں۔ یہیں سے وہ گول میز کانفرنس کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ سروجنی نائیڈو نے لندن میں اقبال کا استقبال کرتے ہوئے کہا تھا ''اقبال نہ صرف اردو یا ہندوستان کے اہم شاعر ہیں بلکہ وہ ایشیا کے ملک الشعرا ہیں۔'' ممبئی میں ان کی سکونت اور ممبئی کی ان کی یادداشتوں پر مشتمل تحریر اس کتاب میں درج کرنے والا ہوں۔ 1932 میں وہ یہیں سے لندن گئے، اس وقت ایک صحافی نے ان سے انٹرویو کیا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ'' میرا پیغام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں سے مل جل کر رہیں۔'' انھوں نے مسلم ریاست کا تصور دیا تھا مگر پاکستان جیسا الگ ملک وہ نہیں چاہتے تھے۔ وہ متحدہ ملک میں مسلم ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس کی وضاحت بھی وہ کر چکے تھے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اقبال کو سمجھنے میں اکثر لوگوں نے غلطی کی ہے اور انھیں پاکستان کا بانی سمجھ لیا ہے۔

**ن آ س**: اردو پر بات کرتے ہوئے اکثر رسم الخط پر سوال اٹھایا جاتا ہے۔ اپنے یہاں ایک خیال یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر فارسی رسم الخط کی بجائے دیوناگری رسم الخط کو رواج دیا جائے تو یہ زبان مزید عوامی مقبولیت حاصل کرے گی۔ عصمت چغتائی بھی اس خیال کی حمایت کرتی تھیں۔ مغربی ملکوں میں رومن رسم الخط پر اصرار کیا جاتا ہے۔ رسم الخط کسی بھی زبان کے لباس کی حیثیت رکھتا ہے، رسم الخط سے اس طرح دستبردار ہونا کتنا درست ہے؟

**عبدالستار دلوی**: رسم الخط زبان کی پہچان ہوتی ہے۔ ہر زبان کی جزیات اس کے رسم الخط ہی کے ذریعے گرفت میں لائی جاتی ہیں۔ ہاں! سہولت کو مد نظر رکھ کر اردو کی کتابیں دیوناگری میں شائع کی جاسکتی ہیں، مگر اردو کے فارسی رسم الخط سے دست بردار ہونا کسی بھی حال میں مناسب نہیں ہے۔ اصل رسم الخط میں بھی کتابیں شائع ہونا چاہیے۔ اردو کی چاشنی ناگری رسم الخط میں ممکن نہیں ہے۔ گجراتی زبان دیوناگری سے بہت قریب ہے، کافی کوشش کی گئی کہ گجراتی زبان دیوناگری رسم الخط میں تحریر کی جائے۔ مگر گجراتی لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ ترکی زبان کا بھی یہی حال ہوا۔ کمال اتاترک نے فارسی رسم الخط کو ترک کر کے رومن رسم الخط کو بڑھاوا دینے کی بھرپور کوشش کی۔ اس نے فارسی رسم الخط کو ترک کر دیا اور رومن رسم الخط کو لاگو کر دیا۔ چنانچہ 1926 کے بعد وہاں پر رومن رسم الخط کا استعمال ہونے لگا۔ مگر اس کا منفی نتیجہ اب ظاہر ہوا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تمام قدیم ادبی خزینے کو کسی اور رسم الخط میں تبدیل کیا جائے؟ علاوہ ازیں ہر رسم الخط جداگانہ انفرادیت رکھتا ہے۔ اردو کے فارسی رسم الخط میں سنسکرت کے ک، کھ، گ، گھ، ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ جیسے حروف مختلف اشاروں اور علامتوں سے ظاہر کیے جاتے ہیں۔ اردو کے ق، خ کی آواز حلق سے نکلتی ہے اور یہ حروف صرف فارسی رسم الخط میں موجود ہیں۔ مگر دیوناگری میں ان تمام حروف کے اظہار کے لیے کوئی متبادل نہیں ہے۔ ہندی پر اصرار کرنے والوں نے تو حد کردی کہ غزل کو گجل کہنا شروع کر دیا۔ ایسے وقت میں جب انفرادیت قائم رکھنا ہو، خود کی شناخت بنائے رکھنی ہو اس وقت رسم الخط سے دست برداری مناسب نہیں ہے۔

دیوناگری رسم الخط کی حمایت کرنے والے گروہ میں راہی معصوم رضا اور عصمت چغتائی شامل ہیں۔ ایک بار میں نے عصمت چغتائی سے استفسار کیا تھا کہ کیا آپ دیوناگری جانتی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا تھا کہ'' میں کیوں جانوں؟'' تو میں نے ان سے کہا اگر آپ کسی رسم الخط کو نہیں جانتے تو اس کی خوبیوں سے بھی آپ واقف نہیں ہوں گی، اس کی بندشوں سے بھی انجان ہی رہیں گی۔

اردو زبان اور زبان کے متعدد سوالوں کے موضوعات میں ڈاکٹر دلوی نے اپنے آپ کو گم کر دیا ہے۔ ان کے دل کی تڑپ واضح طور پر نمایاں تھی۔ وہ مسلسل اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ زبان کو خاص رنگ دینا ظلم ہے۔ اردو کی ترقی کے لیے ان کے کئی ارادے اور عزائم ہیں، جن میں سے انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اردو کی کلاسس جاری کرنا بھی ہے۔ اردو کے لیے مسلسل پریشان ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور ان کی ایک زبان کے تئیں اس قدر فراخدلانہ اور اخلاص سے بھرپور نقطہ نظر دل پر نقش کر گیا۔ من میں چاہت ابھری کہ زبان کے ایسے شیدائی ہونے چاہیے۔

مراٹھی: نندنی آتم سدھ ماھنامہ 'للت' مراٹھی، اپریل 2007، مدیر : اشوک کیشو کوٹھاولے

اردو ترجمہ: ڈاکٹر مزمل سرکھوت، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، ممبئی یونی ورسٹی

**Dr. Muzammil Sirkhot**
Asst. Prof. Dept of Urdu
Mumbai University, Vidyanagari Campus
Kalina, Santacruz (East)
Mumbai - 400098 (MS)
Mob.:9527541533

# منی پور میں بھی روشن ہے اردو کا چراغ

حقانی القاسمی

اردو زبان کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ مگر اس زبان نے ہر علاقے میں اپنی موجودگی درج کرائی ہے۔ اس کی شیرینی اور جاذبیت کے جلوے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کے وجود میں ایسی خوشبو بسی ہوئی ہے کہ یہ ہر دماغ کو معطر کردیتی ہے۔ اس کی جادوئی قوت نے بہت سے ان علاقوں کو بھی مسخر کرلیا ہے جو لسانی اور تہذیبی اعتبار سے اس زبان سے مانوس نہیں ہیں۔ اسی زبان کا جادو ہے کہ اس نے صحرا کو بہار اور ریت کو بھی گل وگلزار میں بدل دیا ہے۔ اس زبان نے پوری دنیا میں نئے نئے جزیرے دریافت کیے ہیں جہاں وہ اپنی ساری امکانی قوتوں کے ساتھ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اپنے دائرے کو اور پھیلا رہی ہے۔ یہ زبان ہر تہذیب کے رنگ اور آہنگ کو اپنے اندر قبول کرتی ہے اور ہر زبان کے الفاظ اس کے دامن میں جگہ بھی پاتے ہیں۔ اس کا یہی جمہوری اور سیکولر مزاج ہے جس کی وجہ سے یہ ہندوستان کے ہر علاقے میں اب شعوری یا غیر شعوری طور پر لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔

شمال مشرقی ریاستوں کی تہذیبیں اور زبانیں، اردو سے بالکل مختلف ہیں۔ اردو اور ان ریاستوں کے درمیان کسی طرح کی فطری ہم آہنگی نہیں ہے۔ اس کے باوجود اردو ان علاقوں میں نہ صرف سمجھی اور بولی جاتی ہے بلکہ کچھ ایسے ادارے بھی ہیں جہاں اردو زبان پڑھائی اور سکھائی جاتی ہے۔ اردو زبان سے جذباتی محبت کرنے والے لوگ اس علاقے میں بھی موجود ہیں۔ اردو کے شیدائیوں کا بھی حلقہ ہے۔ وہ اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ اس زبان پر بھی اپنی محبتیں نچھاور کرتے ہیں۔ یہ جادو صرف اس زبان کا ہے جو کسی ایک قوم، ذات یا کلچر کی نہیں ہے بلکہ ہر اس شخص کی بھی زبان ہے جس کے اندر جمالیاتی حس اور لطافت ہے۔

اردو زبان نے اپنی شیرینی اور مٹھاس کی وجہ سے منی پور جیسی ریاست میں بھی اپنی موجودگی درج کرائی ہے۔ گوکہ منی پور میں رہنے والوں کا لسانی کلچر الگ ہے۔ ان کے تہذیبی اور ثقافتی مظاہر بھی اردو کی تہذیبی روایات سے میل نہیں کھاتے۔ مگر اس نامانوس ماحول میں بھی وہاں اردو کا چراغ جل رہا ہے اور اس کا احساس 17 اکتوبر 2017 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی طرف سے منی پور کی راجدھانی امپھال میں منعقدہ 'اردو-عربی اور CABA-MDTP' مراکز کے انچارجوں کی ایک رابطہ تقریب میں بھی ہوا جہاں اردو سے کم واقف لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اردو کے شیدائیوں کی یہ بڑی تعداد دیکھ کر منی پور کی گورنر ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ بھی حیرت زدہ رہ گئیں۔ اس موقعے پر انھوں نے محسوس کیا کہ اردو صرف خاص علاقے یا قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ عام لوگوں کی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان ہندوستانی تاریخ اور ثقافت کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ اس زبان نے دوسری زبانوں کے الفاظ کو بھی اپنے اندر سمویا ہے اور اب اردو کے الفاظ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ منی پور کی گورنر ڈاکٹر

نجمہ ہیپت اللہ جن کا مولانا ابوالکلام آزاد کے خانوادے سے تعلق ہے اور جو اردو زبان و ادب کی شیدائی بھی ہیں انھوں نے قومی اردو کونسل کے اس پروگرام کی ستائش کی اور یہ کہا کہ شمال مشرقی ریاستوں میں قومی اردو کونسل کی طرف سے اس طرح کی اور بھی تقریبات کا انعقاد کیا جانا چاہیے اور اپنی اسکیموں میں اس علاقے کو ترجیحی فہرست میں شامل کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس کے منظور شدہ بجٹ میں سے دس فیصد کا استعمال اس علاقے میں کیا جائے تو یہاں کی صورت حال بھی بہتر ہوگی۔

قومی اردو کونسل کا یہ یک روزہ سیشن 'اردو-عربی اور CABA-MDTP' مراکز کے انچارج سے انٹرکشن کے طور پر منعقد کیا گیا تھا تاکہ ان کو درپیش مسائل اور مشکلات کا تدارک کیا جاسکے اور کمپیوٹر خواندگی کی شرح میں اضافہ کیا جائے۔

قومی اردو کونسل نے گذشتہ کئی برسوں سے شمال مشرقی ریاستوں کو اپنی ترجیحی فہرست میں شامل رکھا ہے اور وہاں 'اردو-عربی اور CABA-MDTP' کے بہت سے مراکز قائم ہیں جس سے فیض اٹھانے والوں کی تعداد منی پور میں بھی بڑھی ہے۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ صرف منی پور جیسی ریاست میں قومی اردو کونسل کے تقریباً چالیس مراکز ہیں جہاں اردو عربی کے سرٹی فکیٹ اور ڈپلوما کے کورسز کرائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر کی تربیت دی جاتی ہے۔ قومی اردو کونسل کے اس پروگرام میں سب سے اچھی بات یہ رہی کہ منی پور بی جے پی اقلیتی مورچے کے صدر اور سکریٹری کے علاوہ دہلی سے مسلم راشٹریہ منچ کے محمد افضال نے بھی شرکت کی اور مختلف مراکز کے طلبا اور نمائندہ بھی شریک رہے۔ اس رابطہ تقریب کی خاص بات یہ بھی رہی کہ ایک غیر اردو علاقے میں ایک بڑی تعداد کو دیکھ کر قومی

> ” منی پور جیسی الگ لسانی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والی ریاست میں اگر اردو کا چراغ جل رہا ہے تو یقینا یہ ہمارے لیے فخر اور خوشی کی بات ہے کہ اردو نے اس علاقے کو بھی اپنی مٹھاس سے متاثر کیا ہے اور اس علاقے میں بھی اپنا چراغ روشن کیا ہے۔ اردو آج اس چراغ کی طرح ہے جس کا کوئی مکاں نہیں ہوتا مگر ہر طرف روشنی لٹاتا ہے۔ “

اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم کو بھی حیرت ہوئی کہ الیکشن کی گہما گہمی کے باوجود اردو کے چاہنے والوں کا ایک جم غفیر تھا۔ پروفیسر ارتضی کریم نے اس موقعے پر نہایت مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شمال مشرقی ریاستیں ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہیں۔ ہم یہاں اور بھی 'اردو-عربی اور CABA-MDTP' کے تربیتی مراکز قائم کریں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ منی پوری اور اردو دونوں زبانیں مل کر ایک نیا ثقافتی اور لسانی منظرنامہ ترتیب دے سکتی ہیں۔ اردو زبان کی بہت سی شاہکار تخلیقات کا منی پوری میں اور منی پوری کی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تو اس سے ایک بہتر لسانی اور ثقافتی تبادلے کی صورت سامنے آئے گی۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے منی پوری اور اردو لغت کی تشکیل کا بھی کام کیا جاسکتا ہے۔ اس سے پتہ چلے گا کہ دیگر زبانوں کے علاوہ منی پوری میں اردو کے کتنے الفاظ ہیں اور اردو نے منی پوری کے کتنے لفظوں کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ یہ کام یقینی طور پر اردو اور منی پوری دونوں زبانوں کو جوڑنے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔

منی پور جیسی الگ لسانی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والی ریاست میں اگر اردو کا چراغ جل رہا ہے تو یقیناً یہ ہمارے لیے فخر اور خوشی کی بات ہے کہ اردو نے اس علاقے کو بھی اپنی مٹھاس سے متاثر کیا ہے اور اس علاقے میں بھی اپنا چراغ روشن کیا ہے۔ اردو آج اس چراغ کی طرح ہے جس کا کوئی مکاں نہیں ہوتا مگر ہر طرف روشنی لٹاتا ہے۔ وسیم بریلوی کا ایک شعر ہے۔

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

اردو اپنی بے مکانی کے باوجود ہر علاقے میں نیا مکاں بنا رہی ہے۔ منی پور بھی اس کا ایک نیا گھر ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنانے کی ذمے داری ہم سب اردو والوں کی ہے۔

■

**Haqqani Al-Qasmi**
Mob.: 9891726444
E-mail.: haqqanialqasmi@gmail.com

نورفاطمہ

# شبلی نعمانی: بحیثیت تنقید نگار
## (موازنۂ انیس و دبیر اور شعرالعجم کی روشنی میں)

علامہ شبلی نعمانی اردو تنقید کے ان بنیاد گزاروں میں سے ایک ہیں جن کو الطاف حسین حالی کے بعد اردو تنقید اور شعریات کے سب سے نمایاں نظریہ ساز نقاد کا نام دیا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تنقید ہمارے سامنے ایک مستحکم روپ میں ابھرتی ہے اور تذکروں کی تنقید (جس کو تنقیدی شعور کے آغاز کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا)۔ کے دائرۂ کار سے باہر نکلتی ہے۔ اس کا سہرا سب سے پہلے مولانا الطاف حسین حالی اور اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی کے سر بندھتا ہے۔ حالی نے (1893) میں مقدمہ شعرو شاعری لکھ کر ادبی دنیا میں ہلچل پیدا کی۔ آج بھی ان کے وضع کردہ اصولوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد شبلی نے بیسویں صدی کے آغاز میں ہی تقابلی تنقید کا ایک اور نیا رخ موازنۂ انیس و دبیر (1907) لکھ کر پیش کیا۔ الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی سے قبل اگر کوئی نقاد اردو میں نمایاں نظر آتا ہے تو وہ محمد حسین آزاد ہیں مگر آزاد کو شعرائے اردو کے تذکروں کے بعد اردو تنقید کے باقاعدہ آغاز سے قبل ایک ایسے ادبی تاریخ نویس کا نام دیا جانا چاہیے جس نے تذکروں کی اصطلاحات سے آگے بڑھ کر بعض تنقیدی تصورات کی وضاحت کا فریضہ انجام دیا۔ چونکہ ان کا تنقیدی اسلوب زیادہ دوٹوک نہیں اور ان کی تنقیدی زبان پر بھی انشا پردازی کا غلبہ نظر آتا ہے اس لیے ان کو حالی اور شبلی کی برابری کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ ان ہی کی طرح اس زمانے میں امداد امام اثر نے بھی جو تنقید لکھی وہ بھی شبلی اور حالی کے دوٹوک انداز و اسلوب کا درجہ حاصل نہیں کر پائی۔ شبلی نعمانی کی تنقید نگاری کا جائزہ لینے کی غرض سے تنقید کے بارے میں ان کی دو بنیادی کتابوں موازنۂ انیس و دبیر اور شعرالعجم کا ذکر ناگزیر ہے۔

موازنہ کے ذریعے شبلی نے تنقید کو محدود دائرے سے نکال کر مغرب کے بالمقابل کر دیا وہ اس لیے کہ مغرب میں تو تقابلی تنقید کا چلن عام تھا مگر اردو میں تقابلی تنقید پر پہلی کتاب شبلی کی موازنۂ انیس و دبیر ہی سامنے آتی ہے۔ اس کتاب کے منظر عام پر آتے ہی شبلی نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا لوہا بھی منوالیا۔ مرثیہ نگاری کے دو بڑے اور نمائندہ فن کار انیس و دبیر کے درمیان موازنہ کر کے شبلی نے ادب کو ایک نیا نقطۂ نظر دیا۔ آج بھی شبلی کی یہ کتاب تنقیدی میدان میں استناد کا درجہ رکھتی ہے اور اہل علم انیس و دبیر کو موازنہ کے سیاق و سباق میں رکھ کر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شعرالعجم کی چوتھی جلد بھی ان کا تصور شعر، تنقیدی شعور اور اس کے علاوہ ادبی بصیرت قاری کو اپنی گرفت میں لیے بغیر نہیں رہتی۔ یوں تو شعرالعجم کی پانچ جلدوں میں فارسی شاعری کی تاریخ ملتی ہے مگر چوتھی جلد کے پہلے حصہ میں تنقیدی اصول و نظریات سے بحث کی گئی ہے جو کہ نظری تنقید کے اعلیٰ نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ تنقید کے اصول و ضوابط اور نظریاتی مسائل کا اس طرح جائزہ لیا گیا ہے کہ وہ فارسی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی پرکھ اور محاسن کی شناخت کا وسیلہ بن جاتے ہیں شبلی کے یہاں مشرقی شعریات کا اثر گہرا دکھائی دیتا ہے۔ شبلی کی تنقیدی تصانیف کے ذریعے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شعر و سخن کی پرکھ کے سلسلے میں بنیادی باتیں موازنہ میں موجود ہیں اور ان کی مزید وضاحت شعرالعجم کی چوتھی جلد میں ملتی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شعرالعجم میں موجود شعریات اور تنقیدی تصورات سے پہلے ہم موازنۂ انیس و دبیر کے مباحث پر ایک نگاہ ڈال لیں۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ موازنہ میں انیس و دبیر کے شاعرانہ کمالات کو پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے بیشتر حصے میں انیس کی شاعرانہ خوبیوں پر تفصیلی بحث ملتی ہے۔ ہر اعتبار سے دبیر کے مقابلے انیس کا مرتبہ بلند دکھایا گیا ہے۔ اس لیے اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد مخالفت کا بازار گرم رہا اور شبلی پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ دبیر کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کہ انیس کے مقابلہ دبیر کے کلام کا تجزیہ اس کتاب میں کم ملتا ہے۔ مگر اس کے باوجود شبلی نے جگہ جگہ دبیر کی علمیت، قوت اختراع، اور مضمون آفرینی کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ دبیر کے کلام میں تشبیہات و استعارات کی ندرت و جدت کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مگر شبلی چونکہ اپنا سارا زور فصاحت و بلاغت پر صرف کر دیتے ہیں اس لیے انیس کے مقابلے انھیں دبیر کا کلام قدرے پھیکا اور کم حیثیت نظر آتا ہے۔ موازنہ میں فصاحت کی تعریف بہت جامع اور منظم انداز میں کی گئی ہے۔ شبلی نے اس انداز سے فصاحت کی تعریف کی ہے کہ آوازوں کے ذریعے الفاظ کے فصیح اور غیر فصیح ہونے کا فرق ہمارے سامنے نمایاں ہو کر آجاتا ہے۔ اسی روشنی میں شبلی نے میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کو پرکھنے

کی کوشش کی اور مثالوں کے ذریعے یہ صاف کر دیا کہ فصاحت کی عمدہ مثالیں میر انیس کے کلام میں کس طرح پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے دونوں شاعروں کے مصرعوں یا شعروں کو سامنے رکھ کر یہ بات واضح کی ہے کہ انیس کا کلام دبیر کے مقابلے میں زیادہ فصیح معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ مصرعے دیکھیے:

کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع وسجود میں

مرزا دبیر

سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں

میر انیس

شبلی فصاحت پر مزید بحث کرتے ہوئے لفظ کے فصیح ہونے کو کافی نہیں سمجھتے اور اس کی ترتیب و تناسب یا ساخت و ہیئت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے، ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی''۔

(موازنہ انیس و دبیر، مرتبہ فضل امام ص، 45)

شبلی نے فصاحت کے ضمن میں ترتیب و تناسب کو بھی اہمیت دی ہے۔ اس روشنی میں شبلی نے میر انیس کے کلام سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں یہاں ایک دو مثال کا ذکر ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

***

شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

شبلی کا ماننا ہے کہ اوس اور شبنم دونوں لفظ فصیح ہیں لیکن اگر میر انیس اوس کے بجائے شبنم اور شبنم کی جگہ اوس کا لفظ استعمال کرتے تو فصاحت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے لفظوں کے انتخاب میں توازن اور تناسب دیکھنا بے حد ضروری ہے۔ لفظوں میں معمولی الٹ پھیر کے ذریعے کلام میں جو فرق پیدا ہوتا ہے اسے ذیل میں دی جا رہی مثال سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ میر انیس نے حضرت علی اکبر کے اذان دینے کی تعریف اکثر جگہ کی ہے۔ ایک جگہ اس بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

تھا بلبل حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

بلبل چہک رہا تھا ریاض رسول میں

دونوں مصرعوں کا مضمون ایک ہے مگر لفظوں کے الٹ پھیر نے واضح فرق پیدا کر دیا ہے۔ ان تمام مثالوں کے ذریعے شبلی کے وسیع مطالعہ باریک بینی اور ناقدانہ بصیرت کے سبب ہمیں قدم قدم پر ان کے گہرے تنقیدی شعور کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ بلاغت پر بھی شبلی پر معنی انداز میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ بلاغت کے لیے ضروری ہے کہ کلام فصیح ہو۔ عام طور پر یہ خیال تسلیم کیا جاتا ہے کہ جس کلام میں دوسروں تک پہنچنے کی جتنی صلاحیت ہوگی وہ اتنا ہی بلیغ ہوگا۔ شبلی بلاغت کو اس طرح سمجھتے ہیں:

''بلاغت کو الفاظ سے چنداں تعلق نہیں، محض مضامین کو بھی بلیغ یا غیر بلیغ کہا جا سکتا ہے۔ بلاغت الفاظ در حقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے۔ اصل اور اعلیٰ درجے کی بلاغت معانی کی بلاغت ہے۔''

(موازنہ انیس و دبیر، مرتبہ فضل امام ص 60-59)

شبلی نے مثالوں کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ الفاظ کی بلاغت سے زیادہ میر انیس کے یہاں معنی کی بلاغت ملتی ہے۔ جبکہ دبیر کے یہاں معانی کی بلاغت انیس کے مقابلے میں کم ہے۔ شبلی کا ماننا ہے کہ انیس کا اصل جوہر معانی کی بلاغت میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ میر انیس اور دبیر کے کلام سے بلاغت کی مثال دیکھیے کربلا کے واقعات میں ایک موقع ایسا آتا ہے جب کوئی امام حسین کا نام اور تعارف جاننا چاہتا ہے۔ اس صوت حال کو دبیر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ امام حسین کی زبان سے خودستائی ظاہر ہوتی ہے:

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

اس مقابلے میں ایسی صورت حال کے بیان میں انیس کے یہاں انکسار اور عظمت دونوں موجود ہیں:

مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

شبلی کا ماننا ہے کہ ان مصرعوں میں بلاغت کا جو نکتہ چھپا ہوا ہے اس کا اندازہ صرف مذاق سخن سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ شبلی موازنہ میں تشبیہ اور استعارے پر بھی مدلل انداز میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں تشبیہ و استعارہ ایسے شاعرانہ وسائل ہیں جن کے ذریعے کلام کی دلکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ شبلی بھی تشبیہ و استعارے کو کلام کا زیور سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اگر کوئی چیز کلام میں یا تحریر میں روح پھونک سکتی ہے تو وہ تشبیہات و استعارات ہیں۔ شبلی تشبیہ و استعارے کے حسن کے تبھی تک قائل ہیں جب تک وہ اپنی اصلی حالت میں قائم رہیں اور غیر ضروری معلوم نہ ہوں۔ تشبیہ کی اہمیت اور افادیت پر بحث کرتے ہوئے شبلی نے تشبیہ کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک مفرد اور دوسری مرکب۔ شبلی کا ماننا ہے کہ مفرد تشبیہ میں جدت پیدا نہیں کی جا سکتی جبکہ مرکب تشبیہ میں صورت حال کی مناسبت سے جدت پیدا کی جا سکتی ہے۔ مرکب تشبیہ میں جدت اور ندرت کا سارا انحصار قوت اختراع پر ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تشبیہ کی خوبی یہ ہے کہ مشبہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے جیسا کہ عرب میں نیچرل قسم کی تشبیہات پائی جاتی تھیں۔ شبلی نے موازنہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ میر انیس کے کلام میں تشبیہات کی جتنی خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ کسی اور کے کلام میں ملنا مشکل ہے۔ تشبیہات کی ان خصوصیات کو شبلی نے متعدد مثالوں سے واضح کیا ہے۔ میدان کربلا میں جب حضرت عباس پر چاروں طرف سے برچھیاں چل رہی تھیں انیس نے اس کیفیت کو تشبیہ کے ذریعے نیا رنگ دے دیا ہے اور برچھیوں کے چلنے کے ناپسندیدہ عمل کو کہیں سورج کی کرنوں اور کبھی پروانوں کی خوبصورت تشبیہات سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

یوں برچھیاں تھیں چاروں طرف اس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

***

مقتل میں کیا ہجوم تھا اس نور عین پر
پروانے گر رہے تھے چراغ حسین پر

شبلی مزید لکھتے ہیں کہ محسوسات کے ذریعے جو تشبیہ دی جاتی ہے اس کی تصویر فوراً ذہن میں آجاتی ہے۔ اس قسم کی تشبیہات میر انیس کے کلام میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ دو دشمنوں کے درمیان جب ایک دوسرے پر وار کرتے ہوئے ان کی برچھیاں آپس میں ٹکرا رہی تھیں تو اس منظر کو میر انیس نے اس طرح بیان کیا ہے:

دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

شبلی شاعری میں حسن کاری کے قائل تھے۔ اس بات کو شبلی ایک بے حد خوبصورت مثال کے ذریعے بتاتے ہیں کہ اگر آدمیوں کے ہجوم کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہاں آدمیوں کا جنگل تھا تو کلام میں وسعت اور زور پیدا ہو جائے گا۔ دیکھا جائے تو تشبیہ ایک عام خیال ہے جس کو کوئی بھی شخص اپنے کلام میں استعمال کر سکتا ہے۔ مگر جب تک تشبیہ میں ندرت اور کوئی خاص خوبی موجود نہ ہو وہ کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لیے شاعر کا فرض ہے کہ کلام میں نادر اور جدید تشبیہات اور استعارات استعمال کرے۔ جیسا کہ ہمارے یہاں کے اکثر بڑے شعرا نے کیا ہے۔ اگر بار بار وہی تشبیہیں اور استعارے استعمال کیے جائیں گے تو ان میں تازگی اور ندرت برقرار نہیں رہے گی۔ اس کے بعد شبلی صنائع و بدائع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صنائع و بدائع کے ذریعے کلام میں حسن اور

دلکشی پیدا کی جاسکتی ہے۔ میر انیس کی شاعری جس زمانے میں پروان چڑھی اس وقت مبالغہ، صنائع و بدائع، ایہام اور رعایت لفظی کو شاعرانہ کمال سمجھا جاتا تھا۔ ایسے میں میر انیس کا صنائع و بدائع سے الگ رہنا تھوڑا مشکل تھا۔ اس سلسلے میں شبلی کا خیال ہے کہ:

''باقی صنعتوں کو انھوں نے اس طرح برتا کہ کلام کی اصل خوبی یعنی برجستگی، صفائی اور سادگی میں فرق نہ آنے پائے''۔ (موازنہ انیس و دبیر، مرتبہ فضل امام، ص 99)

شبلی اس بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ میر انیس کے کلام میں جن صنعتوں کا حسن و خوبی کے ساتھ استعمال ہوا ہے ان میں ایہام (یعنی ایک لفظ کے دو معنی مراد ہوں دوسرے معنی مراد نہ ہوں) مبالغہ، حسن تعلیل، مراعات النظیر (الفاظ کی رعایت) ہیں ویسے لف ونشر اور تلمیح کے جابہ جا اشعار بھی میر انیس کے مرثیوں میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ یہ تمام محاسن بلاغت کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس کے بعد میر انیس نے اپنے کلام میں انسانی جذبات و احساسات، منظر نگاری، واقعہ نگاری کو بے حد خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس بات کو شبلی نے متعدد مثالوں سے واضح کیا ہے۔ ان مباحث کو نظریاتی طور پر مستحکم کرنے کی غرض سے شبلی نے جگہ جگہ مثالیں بھی دی ہیں۔ لیکن انھوں نے محض نظریاتی بحث پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ عملی تنقید کرتے ہوئے میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کا تقابل اور موازنہ کیا ہے اور ہر جگہ ثبوت کے طور پر اشعار کے حوالے سے دونوں شاعروں کے فنی طریق کار کو بھی نمایاں کیا ہے۔

شعرالعجم میں شاعری کے جن اصول و نظریات کا ذکر ملتا ہے ان میں سے بیشتر کا ذکر موازنہ میں سرسری طور پر کیا جاچکا ہے۔ شعرالعجم کی چوتھی جلد کے ابتدائی صفحات مین ان تمام مباحث پر تفصیلی گفتگو ملتی ہے۔ شبلی انشا پرداز تھے، جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں کہیں کہیں رومانیت کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی کی نثر روکھی پھیکی معلوم نہیں ہوتی بلکہ پیرایۂ بیان بہت شگفتہ اور دلکش انداز لیے رہتا ہے۔ اس لیے شبلی کو جمالیاتی نقاد کا نام دینا بھی غلط نہ ہوگا۔ شبلی شاعری کو ذوقی اور وجدانی چیز سمجھتے ہیں اس لیے ان کا یہ کہنا کہ چند الفاظ میں شاعری کا صحیح نقشہ پیش نہیں کیا جاسکتا درست معلوم ہوتا ہے۔ شبلی نے شاعری میں دو چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ ایک ادراک اور دوسرا احساس۔ ادراک کا کام مسائل پر غور کرنا، نئی نئی ایجادات اور تحقیقات وغیرہ ہیں مگر احساس انسان کے دلوں پر گہرا اثر مرتب کرتا ہے۔ پھر چاہے وہ خوشی کی حالت، غم کی حالت، یا حیرت انگیزی کا بیان ہو، یا اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ چونکہ شعر میں کسی نہ کسی انسانی جذبے کا بیان کیا جاتا ہے اور وہ سننے والے کے دلوں پر گہرا اثر مرتب کرتا ہے اس لیے شبلی شعر کی تعریف ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

''جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے''۔

(شعرالعجم، جلد چہارم، علامہ شبلی نعمانی، ص 4)

ان کا کہنا ہے کہ شاعری کی یہ وہ خصوصیت ہے جو اس کو تمام علوم وفنون اور سائنس سے الگ کردیتی ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے شبلی تاریخ اور شعر کے فرق، شاعری اور واقعہ نگاری کے فرق اور خطابت اور شاعری کے فرق کو بہت مدلل انداز میں مثالوں کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد شبلی اس بات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں کہ شعر کے اصلی عناصر کیا ہیں؟ اور کن خوبیوں کی بنا پر اچھا شعر وجود میں آتا ہے؟ اس کے لیے شبلی نے دو چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ ایک محاکات اور دوسرا تخیل ان میں سے کسی ایک صنعت کا استعمال شعر میں ہوگا تو وہ شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ خیال بندی، بندش، طرز ادا، سادگی و سلاست کو شبلی شعر کے اصلی اجزاء تصور نہیں کرتے بلکہ ان کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ اب ذرا یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ شبلی نعمانی محاکات اور تخیل کی کیا تعریف کرتے ہیں اور شاعری میں اس کے استعمال کو کس طور پر کارآمد خیال کرتے ہیں۔ اس لیے محاکات اور تخیل سے متعلق شبلی کے ناقدانہ خیالات کا سرسری جائزہ پیش ہے۔ کسی چیز یا کسی حالت کا منظر اس طرح بیان کرنا کہ اس کی تصویر آنکھوں میں گھوم جائے محاکات کہلائے گی۔ تصویر اور محاکات میں فرق واضح کرتے ہوئے شبلی کہتے ہیں کہ تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی ہمارے گردوپیش میں بہت سارے حالات، واقعات و اردات ایسی ہیں جو کہ تصویر کی مکمل پہنچ سے باہر ہیں۔ اس کے لیے شبلی نے عام مصوری اور شاعرانہ مصوری کے باریک اور لطیف فرق کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

''ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک ایک خال و خط دکھایا جائے۔ ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہوگی۔ برخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں شاعر اکثر صرف ان چیزوں کو لیتا ہے اور نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے۔ باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں خلل نہ آئے۔''

(شعرالعجم جلد چہارم، علامہ شبلی نعمانی، ص 10)

مصوری اور محاکات کے اس باریک فرق کو شبلی نے ایک شعر کے ذریعے پوری طرح صاف کردیا ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

گھاس پر اوس کی بوندیں دیکھ کر وہ اثر پیدا نہیں ہوسکتا جو شعر کو پڑھ کر ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ مصور کے لیے تمام خط و خال نمایاں کرنا ضروری ہے مگر شاعر تصویر کا ہر جز نمایاں کرکے نہیں دکھاتا۔ حالانکہ ایسے موقعوں پر شاعر کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دراصل شاعر کو تخیل کی سب سے زیادہ ضرورت ایسے ہی موقعوں پر پڑتی ہے۔ شبلی سے پہلے حالی نے بھی مقدمہ شعر و شاعری میں تخیل پر زور دیا تھا اور کہا تھا کہ قوت متخیلہ جس قدر اعلیٰ درجے کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری بھی اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ مگر حالی نے قوت متخیلہ پر کچھ پابندیاں عائد کی تھیں۔ دراصل حالی تخیل پر پابندی لگانے اور اس کو قوت ممیزہ کے تابع رکھنے کے قائل تھے۔ اس لیے تخیل کے استعمال کے لیے حالی نے کچھ شرطیں بھی عائد کی تھیں جبکہ شبلی اس طرح کی کسی پابندی کے قائل نہیں بلکہ وہ شاعر کی آزادی کے خواہاں ہیں اور وہ کسی بھی قسم کی پابندی کو شعر کے لیے ضروری خیال نہیں کرتے۔ شبلی کے نزدیک تخیل قوت اختراع کا نام ہے۔ وہ تخیل کی تعریف مختلف جگہوں پر الگ الگ انداز سے کرتے ہیں:

''شاعری دراصل تخیل کا نام ہے محاکات میں جو جان آتی ہے تخیل ہی سے آتی ہے ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ نہیں۔'' (ایضاً، ص 24)

''تخیل مسلم اور طے شدہ باتوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ دوبارہ ان پر تنقیدی نظر ڈالتی ہے اور بات میں بات پیدا کرتی ہے۔'' (ایضاً، ص 29)

''قوت تخیل ایک چیز کو سو دفعہ دیکھتی ہے اور ہر دفعہ اس کو ایک نیا کرشمہ نظر آتا ہے۔ پھول کو تم نے سینکڑوں بار دیکھا ہوگا اور ہر دفعہ تم نے صرف اس کے رنگ و بو سے لطف اٹھایا ہوگا، لیکن شاعر قوت تخیل کے ذریعہ سے ہر بار نئے نئے پہلو سے دیکھتا ہے اور ہر دفعہ اس کو ایک نیا عالم نظر آتا ہے''۔ (ایضاً، ص 33)

ان تمام تعریفوں سے پتہ چلتا ہے کہ شبلی نعمانی نے تخیل کے مسئلے پر کتنا غور و خوض کیا ہے اور تخیل کی کارگردگی کو

شاعری کے ساتھ فلسفہ تک میں ڈھونڈ نکالا ہے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ شبلی نعمانی تخیل کو محدود اور تنگ دائرے سے باہر نکالنے کے لیے کائنات کے مشاہدے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح حالی نے تخیل کے ساتھ ساتھ کائنات کے مطالعے کی شرط عائد کی تھی۔ فرق اتنا ہے کہ حالی شاعری کو اخلاق کا پابند سمجھتے تھے اور اسے تعمیری مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے اس لیے وہ قوت متخیلہ پر کچھ پابندی عائد کرنا ضروری سمجھتے ہیں مگر شبلی کا مزاج رومانیت سے کافی حد تک قریب ہے وہ شاعر کے لیے پوری آزادی چاہتے ہیں جس کی وضاحت ان کے ذیل کے اقتباس سے بخوبی ہوتی ہے:

''وہ شاعری جو ہر قسم کے جذبات کا آئینہ بن سکتی ہو جو فطرت انسانی کے راز کھول سکتی ہو، جو تاریخی واقعات کو دلچسپی کے منظر پر لاسکتی ہو، جو فلسفۂ اخلاق کے دقائق بتا سکتی ہو، اس کے لیے ایسا محدود تخیل کیا کام آسکتا ہے؟ تخیل جس قدر قوی، باریک، متنوع اور کثیر العمل ہوگی اسی قدر اس کے لیے مشاہدات کی زیادہ ضرورت ہوگی''۔

(ایضاً، ص 39-40)

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بہترین اور اعلیٰ شاعری کے لیے محدود تخیل کی نہیں بلکہ وسیع مشاہدے کی ضرورت پڑتی ہے۔ شاعر پر کسی طرح کی پابندی اس کو محدود دائرے میں مقید کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی کے نزدیک شاعری مکمل آزادی کے اظہار کا نام ہے۔ لفظ و معنی پر بھی شبلی اپنی رائے مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ شبلی نعمانی سے پہلے الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لفظ و معنی اور ان میں سے ایک کی فضیلت یا دوسرے کی، اس موضوع پر تفصیلی اظہار خیال کیا تھا۔ مگر چونکہ یہ معاملہ مشرقی تنقید کا ایک اہم مسئلہ تھا اس لیے شبلی نے بھی اس مسئلے پر اپنے طور پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ یہاں شبلی اور حالی کے نقطۂ نظر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حالی کا جھکاؤ لفظ سے زیادہ معنی کی طرف نظر آتا ہے جبکہ شبلی کا جھکاؤ لفظ کی طرف زیادہ ہے۔ یعنی شبلی کے نزدیک مواد سے زیادہ ضروری اسلوب ہے۔ اس ضمن میں شبلی لکھتے ہیں:

''مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں شاعر کا معیار کمال یہی ہے مضمون ادا کن لفظوں میں کیا گیا ہے اور بندش کیسی ہے''۔ (ایضاً، ص 55)

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ لفظ اور معنی کا رشتہ بالکل ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا۔ کتاب العمدہ میں باب ''فی اللفظ والمعنی'' کے تحت ایک عنوان قائم کیا گیا ہے جس سے لفظ و معنی کا رشتہ پانی کی طرح واضح اور صاف ہو جاتا ہے:

''لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا ارتباط کہ وہ کمزور ہوگا تو یہ بھی کمزور ہوگی، پس اگر معنی میں نقص نہ ہو اور الفاظ میں ہو تو شعر میں عیب سمجھا جائے گا۔۔۔ اسی طرح اگر لفظ اچھے ہوں لیکن مضمون اچھا نہ ہو تب بھی شعر خراب ہوگا اور مضمون کی خرابی الفاظ پر بھی اثر کرے گی۔'' (ایضاً، ص 54)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ لفظ اور معنی دونوں ایک دوسرے کے بنا ادھورے ہیں۔ دراصل علمائے عرب میں دو گروہ پائے جاتے تھے۔ ایک گروہ معنی کو اہمیت دیتا تھا اور دوسرا الفاظ کو۔ شبلی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انشا پردازی کا سارا کمال لفظوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ شبلی نے الفاظ کی ساخت و ہیئت اور تناسب پر بھی زور دیا ہے۔ چونکہ فصیح الفاظ ترتیب اور تناسب ہی معمولی خیالات کو غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت میں شبلی نے میر ضمیر اور میر انیس کے کلام سے وہ مثالیں پیش کی ہیں جن کے موضوعات تو کم و بیش ایک جیسے ہیں مگر الفاظ کے ردو بدل نے کلام کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ شبلی کہتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا دار و مدار زیادہ تر الفاظ پر ہی ہے، گلستاں میں جو مضامین اور خیالات ہیں، ایسے اچھوتے اور نادر نہیں، لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب اور تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے''۔ (ایضاً، ص 55)

موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم میں شبلی نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ شاعری کی عظمت کا سارا دار و مدار محاکات یا الفاظ کی فصاحت و بلاغت پر ہے۔ شبلی الفاظ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دیکھتے ہیں:

''الفاظ متعدد قسم کے ہوتے ہیں بعض نازک، لطیف، شستہ، صاف رواں اور شیریں اور بعض پر شوکت، متین، بلند۔ پہلی قسم کے الفاظ عشق و محبت کے مضامین ادا کرنے کے لیے موزوں ہیں۔ عشق و محبت انسان کے لطیف اور نازک جذبات ہیں اس لیے ان کو ادا کرنے کے لیے لفظ بھی اسی قسم کے ہونے چاہیے۔'' (ایضاً، ص 58)

الفاظ کی اہمیت کے باوجود شبلی یہ بھی مانتے ہیں کہ معنی سے بالکل لاپرواہی بھی نہیں برتنی چاہیے۔ چونکہ مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو اگر الفاظ مناسب نہ ہوں تو شعر میں تاثیر پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے شبلی کا مزید یہ کہنا کہ الفاظ کے مختلف اثرات ہر کیفیت میں بدلتے رہتے ہیں۔ معنی کے لحاظ سے الفاظ پر کیا اثر پڑتا ہے یا جملے کی ساخت و ترتیب اگر ٹھیک ہو تو شعر کیسے کامیاب بن جاتا ہے، ان کی نکتہ رسی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ان تمام معروضات کی روشنی میں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ شبلی کا نقطۂ نظر 'تخیل' تشبیہ و استعارے یا لفظ و معنی کے بارے میں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ شبلی کا جھکاؤ الفاظ پر زیادہ ہے۔ شبلی نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ لفظ و معنی کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مناسب نہیں نہ ایک دوسرے کو کسی پر مقدم سمجھنا ٹھیک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر جگہ شبلی کی تنقید تشریحی قسم کی ہو جاتی ہے وہ ایسے شاعروں سے پوری طرح انصاف نہیں کر پاتے جن کے یہاں معنی کی وسعت کے ساتھ اسلوب بیان علامتی پیچیدہ یا تمثیلی پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بیدل اور غالب کی فارسی شاعری کو نظر انداز کرنا اور مولانا روم کی شاعری کو یہ کہہ کر الگ کر دینا کہ ان پر سوانح لکھی جا چکی ہے یا پھر مولانا روم کی مثنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھنا کہ ان کے کلام میں روانی بر جستگی حسن ترکیب کے ساتھ غریب اور نامانوس الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ اس طرح کا رویہ شبلی کے شایان شان نہیں معلوم ہوتا۔ پھر یہ کہ صرف اپنی پسند اور ناپسند کی بنا پر کبھی کبھی شاعروں کے کلام سے مثالیں پیش کرنے لگتے ہیں اور ان کو بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل شبلی کی تنقید جس مشرقی روایت کے سہارے آگے بڑھتی ہے اس میں نقد الشعر، العمدہ، قابوس نامہ، چہار مقالہ، اور حدائق البلاغت جیسی عربی اور فارسی تنقید کی اہم اور مرکزی کتابوں کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ دراصل شبلی ذوقی اور تحسینی نقاد تھے ان کا جمالیاتی ذوق بہت رچا ہوا تھا۔ وہ اچھے شعروں کی داد دیے بنا نہیں رہ سکتے تھے اس لیے اچھے اشعار سن کر شبلی پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ شبلی نے شاعری کو پرکھنے کے جو معیار وضع کیے تھے عموماً اسی کی روشنی میں اشعار کو دیکھتے اور پرکھتے تھے۔ اس کے بعد فیصلہ کرتے تھے۔ یہ شاعری اچھی ہے یا بری؟ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ شبلی نے فارسی شاعری کے بہترین فن پاروں کو اس کتاب میں سمو لیا ہے اور اس کی تشریح و ترجمانی پر اثر انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ شبلی کا یہ وہ کارنامہ ہے جس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہی بات اردو تنقید میں شبلی کی ناقدانہ صلاحیتوں کو منوانے کے لیے کافی ہے۔

■

**Dr. Noor Fatima**
Asst. Prof. (Dept of Urdu)
MANUU, Lucknow Campus
C-9, H Park, Mahanagar Extension, Behind Neera Nursing Home Lucknow 226006 (UP)

# مولانا ابوالکلام آزاد
## اور فنِ موسیقی سے ان کا عشق

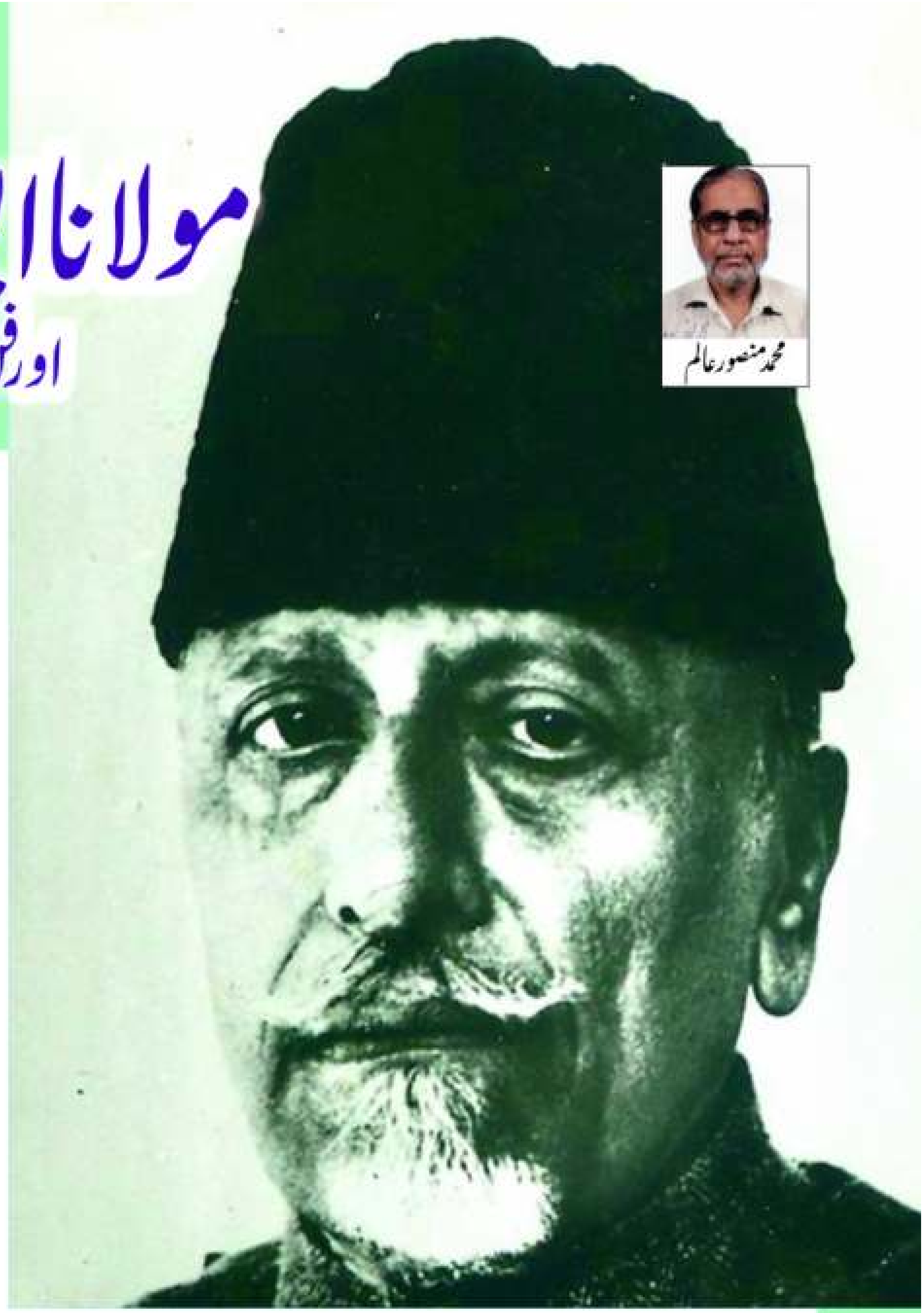

محمد منصور عالم

شعر سے روشن ہے جانِ جبریل و اہرمن
رقص و موسیقی سے ہے سوز و سرورِ انجمن
فاش یوں کرتا ہے ایک چینی حکیم اسرارِ فن
شعر گویا روحِ موسیقی ہے، رقص اس کا بدن

(ڈاکٹر محمد اقبال)

مولانا آزاد کی شخصیت کے کئی رنگ اور پرتو ہیں اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان میں سے بعض رنگ تو ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے متصادم تصور کیے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے اس مضمون میں ان رنگوں میں سے ایک رنگ یعنی مولانا کی موسیقی سے وابستگی کو عنوان بنایا ہے۔ مولانا ایک ایسے گھرانے کے فرد تھے جہاں مذہب کا پورا پورا تسلط قائم تھا اور دینی امور میں ذرا سی کوتاہی بھی ناقابلِ معافی تھی ایسے عالم میں ان کی طبیعت کے تضاد نے اس لیے ان پابندیوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ ایک خلاق ذہن، اخاذ طبیعت اور وسیع الافق سوچ لے کر پیدا ہوئے تھے اور غالب کے بقول صاحب نظر ہونے کی وجہ سے 'دینِ بزرگاں خوش نہ کرد' کی فطری روش مولانا آزاد کے یہاں کم عمری میں ہی نمایاں ہوگئی تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا گھرانہ بالکل دینی تھا۔ وہ علوم قرآنیہ، تفسیر، حدیث، تاریخ اسلام، تاریخ افکار اسلامی، فلسفہ، علم الکلام، صحافت، فنونِ لطیفہ غرض ماضی کے شاندار تہذیبی ورثے کا کوئی ایسا اہم پہلو نہ رہا ہوگا جس میں انھوں نے اپنی بصیرت اور گہری فراست کا ثبوت نہ دیا ہو۔ لہٰذا وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اسلام کی نظر میں موسیقی شرعاً حرام ہے لیکن اس کے باوجود مولانا جیسے عالم دین اور پیکرِ حکمت نے اس سلسلے میں جو فیصلہ کیا تھا وہ قابل غور ہے۔ موسیقی سے اپنی گہری وابستگی کی تائید میں فرماتے ہیں:

''اس بات کی عام طور پر شہرت ہوگئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرمات شرعیہ میں داخل ہے۔ حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ سدِّ وسائل کے خیال سے اس بارے میں فقہا نے تشدد کیا اور یہ تشدد بھی باب قضا سے تھا نہ کہ باب تشریع سے۔ قضا کا میدان نہایت وسیع ہے۔ ہر چیز جو سوءِ استعمال سے کسی مفسدہ کا وسیلہ بن جائے قضاءً رد کی جاسکتی ہے لیکن اس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔''

(غبار خاطر، مرتبہ: مالک رام، لاہور ایڈیشن، ص 28-277)

بہرحال موسیقی کا جائز و ناجائز ہونا ایک اخلاقی مسئلہ ہے جو اس مقالے کا موضوع بحث نہیں ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ یہ موضوع بہت آسان نہیں ہے اور مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف بھی ہے۔ اس موضوع سے متعلق صحیح معنوں میں انصاف وہی کر سکتا ہے جسے موسیقی اور اُس کے فن سے متعلق ذرا بھی شد بد ہو۔ پھر بھی مولانا آزاد کی شخصیت، سیرت اور علمی کارناموں کے اتنے وسیع اور رنگارنگ پہلو نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان کی زندگی کے کس پہلو پر لکھا جائے۔ مولانا پر صحافی، ادیب، شاعر، سیاست داں، انشاپرداز اور مفسر کی حیثیت سے بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور کتابوں کی ڈھیر لگ چکی ہے لیکن موسیقی کے حوالے سے ان پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ راقم الحروف نے یہی سوچ کر اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اس سلسلے میں مولانا کی کتاب غبار خاطر نے میری رہنمائی کی جس میں مولانا کے ایک طویل خط کا خاص موضوع موسیقی ہے۔ غبار خاطر ادبی انشاپردازی اور تاریخ نویسی کے دلکش اسلوب کا خوبصورت نمونہ ہے اور اردو میں جدید نثر نگاری کی بھی مثال ہے۔ اس سے فنِ موسیقی سے متعلق مولانا

کے گہرے مطالعے کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کا علم بھی کہ موسیقی کے فن لطیف کی ترقی میں ہندوستانی مسلمانوں کا کیا رول رہا ہے۔

موسیقی دراصل ان آوازوں کا نام ہے جو آلات سے نکلتی ہیں اور جن کی ترتیب کانوں کو اچھی لگتی ہے۔ موسیقی صوت وآہنگ کی زبان ہے اور ایک فن بھی۔ الفاظ میں اس کے صحیح مفہوم کو ادا کرنا مشکل ہے۔ تاہم یہ سب جانتے ہیں کہ موسیقی انسانی جذبات کو ظاہر کرنے اور انھیں متاثر کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ غم کے جذبات ہوں کہ خوشی کے، حیرت و استعجاب ہو کہ احترام وعقیدت مندی، عیش وعشرت ہو کہ لطف ومحبت انھیں موسیقی کی تانوں میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ الفاظ دم بخود رہ جائیں۔ موسیقی صرف صوتی آہنگ کا نام نہیں ہے۔ بولی کے بغیر بھی الفاظ کا تاثر پیدا کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں موسیقی کی تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ دراصل آبشاروں کے شور، پتوں کی سرسراہٹ، ندیوں کی گنگناہٹ، دریاؤں کے شور، بادلوں کی گھن گرج، سمندر کی بے قرار لہروں، پرندوں کی دلنواز اور ترنم ریز آوازوں سے عبارت ہے۔

موسیقی کا قبضہ براہِ راست روح پر ہوتا ہے۔ جس طرح اس فن نے ترقی کی اس کی دلفریبی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی ہمہ گیری میں مذہب، قوم وملت اور ملک کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے انسان وحیوان یکساں طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ مشہور مفکر ایف گریڈ کے مطابق ''موسیقی کی سریں انسانی روح سے منسلک ہیں اور اس کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان کا اپنا وجود۔''

موسیقی کی تعریف وتوصیف میں بابائے موسیقی حضرت امیر خسرو نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''روح انسانی اس وقت تک جسم انسانی میں داخل نہیں ہوئی جب تک کہ اسے سنگیت سے منا نہ لیا گیا۔ شعر ملاحظہ ہو:

آن روز کہ روحِ پاک آدم بربدن
گفتار در آمی شد از ترس بدن
خواند ملائکان بہ لحن داؤد
در تن در آ، در آ، درتن درتن

ہندوستانی مسلمانوں میں ایسے بہت سے دانشوران، علما و فضلا گزرے ہیں جنھوں نے موسیقی میں اپنی گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اس فن کو بام عروج تک پہنچایا۔ ان کی ایک طویل فہرست ہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری وساری ہے۔ بیسویں صدی میں جن مسلم دانشوروں نے موسیقی سے تعلق رکھا ان میں علامہ شبلی نعمانی، سرسید احمد خان، ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد قابل ذکر ہیں۔

ظ۔ انصاری اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''سرسید کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں جو مفکر اور کارگر شخصیتیں اٹھی ہیں، شبلی، ابوالکلام آزاد اور اقبال کے نام صفِ اوّل میں آتے ہیں۔ ان تینوں ہی نے موسیقی کا اعلیٰ درجے کا ذوق پایا تھا، ان کے نکتے سیکھے تھے۔ اسے روحانی نعمت جانا اور کبھی کفرانی نہیں کیا تھا۔''

(اقبال کی تلاش، ص150)

جب ہم مولانا آزاد کی دوسری تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کی اجتماعی قومی زندگی میں ان کی شرکت اور کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی شخصیت کی جو تصویر ہمارے سامنے ابھر کر آتی ہے وہ ایک جید عالم، دانشور اور

> ”موسیقی کا قبضہ براہ راست روح پر ہوتا ہے۔ جس طرح اس فن نے ترقی کی اس کی دلفریبی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی ہمہ گیری میں مذہب، قوم و ملت اور ملک کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے انسان و حیوان یکساں طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ مشہور مفکر ایف گریڈ کے مطابق ''موسیقی کی سریں انسانی روح سے منسلک ہیں اور اس کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان کا اپنا وجود۔“

ایک اعلیٰ درجے اور بلند قامت سیاسی رہنما کی ہے لیکن جب ہم ان کی شاہکار تصنیف غبار خاطر کو اپنے مطالعے میں لاتے ہیں تو ہم ایک ایسے آزاد سے متعارف ہوتے ہیں جو کسی دانشور یا سیاسی رہنما سے مختلف ہے۔ عموماً یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ سیاست، مذہب، تاریخ، فلسفہ اور دیگر سماجی علوم سے دلچسپی رکھنے والا شخص ادب اور دیگر فنون کی دنیا سے الگ تھلگ رہتا ہے اور جمالیاتی حسن سے اس کی آشنائی ذرا کم ہی ہوتی ہے لیکن غبار خاطر میں جابجا عربی فارسی اور اردو کے اشعار کی کثرت سے ہمیں آزاد کی شخصیت کی تہہ داری کے ایک ایسے پہلو کا پتہ چلتا ہے جسے ہم ان کا جمالیاتی پہلو کہہ سکتے ہیں۔ وہ فن موسیقی کا نا صرف شعور رکھتے تھے بلکہ عملی طور پر بھی موسیقی سے ان کی دلچسپی رہی ہے۔ اس کا اندازہ غبار خاطر کے مکاتیب سے ہوجاتا ہے۔

مولانا کے دل ودماغ پر موسیقی نے کب سے اپنا اثر ڈالنا شروع کیا جو آگے چل کر یہ شوق جنوں کی حد تک پہنچ گیا۔ اس کا ذکر مولانا نے غبار خاطر کے آخری خط میں یوں کیا ہے:

''بچپن میں حجاز کی مترنم صداؤں سے کان آشنا ہوگئے تھے۔ اس زمانے میں حرم شریف کے ہر منارے پر ایک موذن متعین ہوتا تھا اور ان سب کے اوپر شیخ الموذن ہوتا تھا۔ اس زمانے میں شیخ الموذن شیخ حسن تھے اور بڑے ہی خوش آواز تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کی پچھلی پہر کو ان کی ترجیم کی نوائیں ایک سماں باندھ دیا کرتی تھیں۔ ہمارا مکان قدوہ میں باب السلام کے پاس تھا۔ کوٹھے کی کھڑکیوں سے مناروں کی قندیلیں صاف نظر آتی تھیں اور صبح کی اذان تو اس طرح سنائی دیتی جیسے چھت پر کوئی اذان دے رہا ہو۔''

(غبار خاطر، مرتبہ: مالک رام، لاہور ایڈیشن، ص 351)

اس عہد طفولیت سے ہی مولانا آزاد کے دل و دماغ پر موسیقیت سے بھرپور ترنم ریز آوازوں نے اپنا اثر قائم کرنا شروع کردیا تھا اور اسی زمانے سے یہ بات دل میں پرورش پانے لگی تھی کہ قدرت کے اس انمول تحفے کو مکمل طور پر حاصل کرسکیں اور اللہ نے یہ موقع انھیں ہندوستان میں عطا کردیا۔ موسیقی سیکھنے کا جذبہ مولانا میں کیسے پیدا ہوا، وہ خود رقمطراز ہیں:

''شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں مجھے فن موسیقی کے مطالعہ اور مشق کا شوق رہ چکا ہے۔ اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا تھا۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ 1905 میں جب میں تعلیم سے فارغ ہوچکا تھا اور طلبہ کو پڑھانے میں مشغول تھا تو کتابوں کا شوق مجھے اکثر ایک کتب فروش خدابخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا جس نے ویلیزلی اسٹریٹ میں مدرسہ کالج کے سامنے دکان لے رکھی تھی اور زیادہ تر عربی و فارسی کی کتابوں کی خرید وفروخت کا کاروبار کرتا تھا۔ ایک دن اس نے فقیر سیف اللہ خان کی راگ درپن کا ایک نہایت خوش خط اور مصور نسخہ مجھے دکھایا اور کہا کہ یہ فن موسیقی پر کتاب ہے.... میں ابھی اس کا دیباچہ ہی دیکھ رہا تھا کہ مسٹر ڈینی سن راس آگئے جو مدرسہ عالیہ کے پرنسپل تھے اور ایرانی لہجے میں فارسی بولنے کے بہت شائق تھے۔ یہ دیکھ کر کہ ایک کمسن لڑکا فارسی کی ایک کتاب کا غور وخوض سے مطالعہ کررہا ہے، متعجب ہوئے اور مجھ سے فارسی میں پوچھا ''یہ کس مصنف کی کتاب ہے؟'' انھوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنے کی کوشش کی اور کہا کہ ''ہندوستانی فن موسیقی بہت مشکل ہے۔'' کیا تم اس کتاب کے مطالب کو سمجھ سکتے ہو؟ میں نے کہا جو کتاب

لکھی جاتی ہے، اس لیے لکھی جاتی ہے کہ لوگ پڑھیں اور سمجھیں۔ میں بھی اسے پڑھوں گا تو سمجھوں گا۔ انھوں نے ہنس کر کہا: تم اسے نہیں سمجھ سکتے، اگر تم سمجھ سکتے ہو تو مجھے اس صفحے کا مطلب سمجھاؤ۔ میں نے الفاظ پڑھ لیے مگر مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ شرمندہ ہوکر خاموش رہا اور بالآخر کہنا پڑا کہ اس وقت اس کا مطلب بیان نہیں کرسکتا مطالعہ کرنے کے بعد بیان کرسکوں گا۔‘‘

مشہور مستشرق اور مدرسہ عالیہ کے پرنسپل سرڈینی سن راس اور مولانا ابوالکلام آزاد کے درمیان یہ وہ گفتگو تھی جس نے مولانا کے دل و دماغ پر گہرا اثر مرتب کیا۔ انھوں نے ڈینی سن راس کے اس چیلنج کو قبول کیا اور فن موسیقی کی اس کتاب کو، جسے انھوں نے خرید لیا تھا، سمجھنے کی کوششوں میں جٹ گئے۔ انھیں ایک ایسے ماہرِ فن کی تلاش تھی جو کتاب کے مطالعے کے درمیان مبادیات اور مصطلحات کو سمجھا سکے۔ قدرت نے یہ مسئلہ بھی حل کردیا۔ ان کی نظر اپنے والد کے ایک مرید مسیتا خان پر پڑی جنھوں نے مولانا کو فنِ موسیقی کی تعلیم دینے کے لیے اپنی رضامندی کا اظہار اس شرط پر کیا کہ وہ خفیہ طور پر انھیں اس فن کی تربیت و تعلیم دیں گے تاکہ ان کے پیر و مرشد کے کانوں تک یہ بات نہ پہنچ جائے۔ چونکہ مولانا میں خداداد ذہانت و صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی اس لیے انھوں نے مسیتا خان سے بہت جلد موسیقی کے تمام نکات نہ صرف سیکھ لیے بلکہ ستار بجانے میں مشاقی بھی حاصل کرلی اور یہ سلسلہ خفیہ طور پر پانچ سالوں تک چلتا رہا۔ اسی درمیان انھوں نے بین بجانا بھی سیکھ لیا لیکن بعد میں چند مشغولیات کی بنا پر سیکھنے کا یہ سلسلہ چھوٹ گیا لیکن موسیقی کا شوق برقرار رہا بلکہ جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ مولانا جہاں جاتے ان کا ستار ان کے ساتھ رہتا۔ چنانچہ آگرہ کے ایک سفر میں ایک چاندنی رات میں، تاج محل کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ کر ستار بجانے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا ذکر بڑے رومانی اور والہانہ انداز میں لکھتے ہیں۔ آپ بھی سنیے اور لطف اٹھایئے:

’’رات کو ستار لے کر تاج محل چلا جاتا اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا۔ پھر جیوں ہی چاندنی پھیلنے لگتی ستاروں پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہوجاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریب تخیل کے کیسے کیسے جلوے انھی آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔ رات سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں،

بیچ میں چاندنی سے ڈھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں، نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہواؤں کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلیوں کے زخموں سے نغمے۔‘‘ (غبار خاطر، مرتبہ: مالک رام، لاہور ایڈیشن، ص258)

حسن و جمال اور شاعرانہ وارفتگی کا یہ عالم پیغام دیتا ہے کہ تاج محل صرف محل نہیں بلکہ یہ ایک تاریخ ہے جو تمام فنون لطیفہ سے تعمیر و تعبیر ہے۔ موسیقیت اور ترنم سے لبریز مذکورہ بالا جملے صرف اور صرف ایسے ہی شخص کے قلم سے نکل سکتے ہیں جو موسیقی اور ترنم کی پکی سوجھ بوجھ رکھتا ہو اور مولانا آزاد تو اس میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ موسیقی کا ذوق اور تاثر ان کے دل میں ایک ایک ریشے میں اس قدر رچ بس گیا تھا کہ دل سے نکالا نہیں جاسکتا تھا۔ مولانا آزاد کی موسیقی سے گہری دلچسپی اور جنون کی حد تک بڑھتی وارفتگی کی کئی مثالیں غبار خاطر کے صفحات پر بکھری پڑی ہیں۔ ڈاکٹر ثریا لکھتی ہیں:

’’غبار خاطر میں مولانا آزاد نے اپنے تمام نہاں خانوں کو عیاں کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ اس کے پہلے کی تصنیف میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مستور کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اپنی شخصیت کے حسین نگارخانوں کی سیر کی اجازت انھوں نے کسی کو نہیں دی تھی۔ غبار خاطر ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہی نہیں بلکہ ایک علمی و ادبی شاہکار ہے جس میں ایک بالغ نظر اور حساس مکتوب نگار اپنے قلم کی سحرکاری دکھاتا ہوا، قدرت کے گل بوٹے جھلکاتا ہوا، فکر کے سوتے جگاتا ہوا، جذبہ شوق کے دریا بہاتا ہوا اپنے حسین نگارخانوں کی سیر کرواتا ہوا نظر آتا ہے۔‘‘

جیسا کہ پہلے بیان کرچکا ہوں کہ مولانا جہاں بھی جاتے ان لوگوں کی تلاش ضرور کرتے جن کا مزاج موسیقی سے ہم آہنگ ہوتا۔ چنانچہ جب وہ لکھنؤ تشریف لے گئے تو مرزا ہادی رسوا مرحوم، جن کا شمار لکھنؤ کے نابغۂ روزگار شخصیات میں ہوتا تھا، ملاقات کی۔ جب تک ان کا قیام لکھنؤ میں رہا دونوں ایک دوسرے سے گرم جوشی سے ملتے۔ موسیقی پر خاص طور سے گفتگو ہوتی اور مولانا کی معلومات میں مزید اضافہ ہوتا۔ بقول آزاد مرزا محمد ہادی رسوا موسیقی پر کافی دسترس رکھتے تھے جن سے انھوں نے اس فن سے متعلق بہت کچھ سیکھا تھا۔ دیکھیے غبار خاطر میں کیا لکھتے ہیں:

’’یہ گرم جوشیاں چونکہ موسیقی کے ذوق کے پردے میں ابھرتی تھیں اس لیے شاہدانِ نغمہ پرداز سے صحبتیں گرم رہتیں اور بعض استادانِ فن سے بھی مذاکرہ جاری رہتا۔ اس مرتبہ گرچہ میرا قیام مختصر رہا لیکن جتنے دن رہا موسیقی کے مذاکرات ہوتے رہے۔ اس زمانے کے کچھ عرصے بعد انھوں نے معارف النغمات کی ترتیب میں مدد دی جو چھپ کر شائع ہوچکی ہے۔‘‘

(غبار خاطر، مرتبہ: مالک رام، لاہور ایڈیشن، ص257)

مولانا جب بھی بیرونِ ہند گئے موسیقی بھی ان کے ساتھ سفر کرتی رہی۔ یہ ان کے لیے روحانی غذا بن چکی تھی۔ موسیقی سے لذت آشنائی کا دلچسپ سفر مولانا کی زندگی میں جاری رہا۔ اپنے زمانۂ قیام عراق و مصر و شام میں مولانا آزاد نے عربی موسیقی، ایرانی موسیقی اور یونانی موسیقی کے پیچ و خم سمجھنے اور ان کی تاریخ جاننے کی بھی کوشش کی۔ مصر میں سلامہ کا جوق عربی موسیقی کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ مولانا نے اس سے راہ و رسم پیدا کرلی۔ یہاں تک کہ وہ شیخ سلامہ کے کمالِ فن کی داد و تحسین کے لیے قاہرہ کے اوپیرا ہاؤس بھی چلے جاتے تھے۔ یہی نہیں مولانا ایک پری چہرہ اور خوش آواز مغنیہ سے بھی کافی متاثر تھے۔ اس مغنیہ کا ذکر دیکھیے مولانا کس انداز سے کرتے ہیں:

’’وہ (طاہرہ) خود بھی بلائے جان تھی مگر اس کی آواز اس سے بھی زیادہ آفتِ ہوش و ایمان تھی۔ میں نے اس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے کمالات سنے۔‘‘ (غبار خاطر، ص259)

قیامِ مصر میں طاہرہ کے علاوہ مولانا آزاد ایک اور مغنیہ ام کلثوم کی آواز کے اسیر ہوئے۔ اس شیریں آواز کی داد دیتے ہوئے مولانا کا قلم یوں حرکت میں آتا ہے:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص نے ام کلثوم کی آواز نہیں سنی ہے وہ موجودہ عربی موسیقی کی دلآویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کرسکتا۔''

(غبارِ خاطر، مرتبہ: مالک رام، لاہور ایڈیشن، ص 259)

مولانا نے موسیقی کے اپنے شوق کو جائز ٹھہرانے کے لیے غبارِ خاطر کے اپنے آخری خط میں امیر خسرو سے لے کر عہدِ مغلیہ کے تمام دانشوروں، بادشاہوں، سلطانوں اور امیروں کی موسیقی سے ان کی گہری وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ یہ خط نہیں بلکہ موسیقی کی تاریخ اور اس کے عروج و زوال کی کہانی پر ایک مبسوط مقالہ ہے جو ان کے رشحاتِ قلم سے نکل پڑا ہے۔ اس میں ایسے ایسے موسیقاروں کے نام آئے ہیں جن کے متعلق تاریخ بھی خاموش ہے۔ مولانا نے موسیقی کے جواز میں اپنی معلومات، تجربات، مشاہدات کے ساتھ اپنے کثرتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ کے قیمتی خزانہ کے منھ کھول دیے ہیں۔ مولانا عبدالقادر بدایونی، علامہ سعد اللہ، ملا سلام لاہوری، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، مرزا مظہر جانجاناں اور میر درد جیسی شخصیتوں پر موسیقی کے حوالے سے آج تک کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ مولانا نے موسیقی پر ان کی صلاحیتوں کا بھی ذکر کردیا ہے۔

اورنگ زیب، جس نے موسیقی پر پابندی لگا دی تھی اس کے بارے میں دیکھیے مولانا کیا لکھتے ہیں:

''وہ موسیقی کے فن سے بے خبر نہ تھا کیونکہ تمام شہزادوں کی طرح اس نے بھی اس کی تحصیل کی ہوگی۔ البتہ آگے چل کر اس کی افتاد نے دوسری راہ اختیار کرلی۔ گویوں نے بھی موسیقی کا جنازہ نکالا تو اس نے کہا کہ اس طرح دفن کرنا کہ پھر نہ اٹھ سکے۔''

(غبارِ خاطر، مرتبہ: مالک رام، لاہور ایڈیشن، ص......)

اورنگ زیب نے موسیقی پر پابندی تو لگا دی اور اسے دفن بھی کروادیا لیکن اس کے بعد موسیقی کا بھوت قبر سے نکل کر پھر سے زندہ ہوگیا اور ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر پھر سے چھانے لگا جس کی زد میں ہمارے مولانا آزاد بھی آئے بغیر نہ رہ سکے۔

شاعری اور موسیقی کو مولانا لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ ان کے مطابق دونوں اصناف کے درمیان گہرا رشتہ تھا۔ الفاظ کی ادائیگی کے بغیر موسیقی خود شاعری ہے۔ شاعروں میں جب کوئی شاعر اپنا کلام ترنم سے پڑھتا تو مولانا جھوم اٹھتے۔ صرف موسیقی ہی نہیں فنون لطیفہ کی ہر شاخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا خیال ان کو ہمیشہ ستاتا رہتا تھا چنانچہ جب انھوں نے وزارتِ تعلیم کا شعبہ بحیثیت وزیر سنبھالا تو انھوں نے اس

شاعروں میں جب کوئی شاعر اپنا کلام ترنم سے پڑھتا تو مولانا جھوم اٹھتے۔ صرف موسیقی ہی نہیں فنون لطیفہ کی ہر شاخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا خیال ان کو ہمیشہ ستاتا رہتا تھا چنانچہ جب انہوں نے وزارت تعلیم کا شعبہ بحیثیت وزیر سنبھالا تو انہوں نے اس میدان میں جو قدم اٹھائے اس میں بھی ان کے ذوق کو پورا دخل تھا۔ مولانا کی علمی شخصیت، عملی، فنی، سیاسی، ادبی اور مذہبی اعتبار سے کسی تعریف کی محتاج نہیں ہے۔

میدان میں جو قدم اٹھائے اس میں بھی ان کے ذوق کو پورا دخل تھا۔ مولانا کی علمی شخصیت، عملی، فنی، سیاسی، ادبی اور مذہبی اعتبار سے کسی تعریف کی محتاج نہیں ہے۔ تمام علوم و فنون و فنون لطیفہ، بالخصوص موسیقی، شاعری اور مصوری میں ان کی ژرف نگاہی، نکتہ سنجی، جدتِ فہم و ادراک، فراست، دریافت، حقیقت، تحصیلِ علم، ذہانت و ذکاوت، فصاحت و بلاغت اور بصیرت اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ایرانی فنون لطیفہ کی ہر شاخ نے ہندوستانی آرٹ کو کافی متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے 1952 میں ہندوایران کے درمیان کلچرل معاہدے پر دستخط کیے اور اس طرح نہ صرف اپنے ذوق کی تسکین کی بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان ہزاروں سال سے قائم ثقافتی رشتے کو دوبارہ زندہ کیا اور اسے توانائی بخشی، یہی نہیں فنون لطیفہ سے ان کی گہری دلچسپی کا ثبوت سنگیت ناٹک اکادمی، للت کلا اکادمی جیسے اداروں کا قیام ہے جو خالص ان کے دماغ کی اپج تھیں۔

مولانا آزاد اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ایک ایسی انجمن جس کی حدود اربعہ میں حکمت و فلسفہ، علم و فضل، شعر و ادب، اخلاق و مذہب اور سیاست گویا جملہ علوم منقولات گلہائے رنگارنگ کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور ذہن ایسا رسا اور مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ جس صنفِ علم پر قلم اٹھایا صرف اس کا حق ہی ادا نہیں کیا بلکہ اس میں فکر و بصیرت اور حسن و جمال کے نئے گوشوں کا اضافہ کردیا۔ جہاں تک موسیقیت سے لطف اندوزی اور کسب و سرور حاصل کرنے کا سوال ہے تو مولانا اس باب میں بھی روایتی فکر سے الگ اپنی رائے رکھتے تھے اور عموماً اس حوالے سے ان کی گفتگو کچھ ایسے ہم نواؤں سے تحریراً یا تقریراً ہوتی تھی جو ان کے خلوت گاہِ خاص کے ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔ مولانا خوب جانتے تھے کہ اس سلسلے میں عام مذاق اور مذہبی قیود کا لحاظ نہ رکھنے کے عمل کو ان کی یاسمینی چائے نوشی کی ہی طرح کسی اور شغلِ رندانہ سے منسوب کردیا جائے گا اور شاید اسی لیے اس موضوع پر بہت کم لکھا ہے اور اس پیرائے میں لکھا کہ اس سے بجائے اس کی حلت و حرمت کے پہلو نکلنے کے خالصۃً ان کا ذاتی ذوق و شوق کا معاملہ دکھائی دے۔ غبارِ خاطر میں موسیقی کے تعلق سے ان کی خامہ فرسائی میں بھی ان کا وہی اجتہادی رنگ دکھائی دیتا ہے جو انھیں دوسروں سے ممتاز بناتا ہے لیکن ان سطور سے یہ تو آسانی سے طے ہوجاتا ہے کہ وہ اس محفل کے بھی صدر نشینوں میں تھے تاہم موسیقی اور اس سے وابستہ افکار خاص طور پر اسلامی طرزِ فکر کی مخالفت یا حمایت کا پہلو نہیں نکلتا ہے اور غالباً مولانا کی شعوری کوشش بھی یہی رہی ہوگی کہ ذوق کی تسکین بھی ہوجائے اور مفتیانِ حیلہ جو کی نظرِ التفات بھی نہ پڑے۔ امام الہند ہونے کی حیثیت سے مولانا کی اس احتیاط کی تائید ہم بھی کرتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا کی ذات اجتماعی اضداد تھی اور وہ فطری طور پر پانچویں سمت کے مسافر تھے:

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

قاضی عبدالغفار نے درست کہا ہے کہ:

''ہم انھیں (مولانا آزاد) ایک مفکر، ادیب اور لطیف احساس کے نقیب و ترجمان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ان کی فطرتِ عالیہ کے متعلق نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر وہ اتنے بڑے انشا پرداز اور ادیب نہ ہوتے تو بہت بڑے مصور ہوتے یا مغنی ہوتے یا پھر ایک عظیم شاعر۔''

عرب کا سوز و دروں اور عجم کا حسنِ طبیعت رکھنے والی عظیم شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد اور موسیقی سے ان کا عشق انھیں کی عبارتوں اور اقوال کے حوالوں سے میں نے یہ مقالہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ مولانا آزاد پر ایک بہترین اور سچی رائے رکھنے والی ایک شخصیت ظ۔ انصاری کے یہ الفاظ پیش کرنا چاہتا ہوں:

''وہ (مولانا) اپنی تمام شبانہ روز گرمیوں کے باوجود ایک گتھی تھے، ریشم کی لچھی تھے۔ ہیرے پر لپٹی ہوئی، ہجوم عام میں دمکتے اور مذاقِ عام سے بدکتے رہے عمر بھر۔''

■

**Dr. Mansoor Alam**
17/2/H/9, Smith Lane, 2nd Floor
Kolkata - 700013 (WB)

# کلامِ اکبر میں ذو معنویت اور احتجاج

عرشیہ سرفراز

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ایسے شاعر و ادیب کثرت سے ملتے ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کو اپنی تخلیق اور اظہار خیال کا وسیلہ بنایا جن میں اکبر الہ آبادی خصوصی طور سے شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں طنز و مزاح کے ایسے نمونے ملتے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبے مثلاً سماجی، سیاسی، مذہبی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ طنز و مزاح کے پیرائے میں انھوں نے زندگی اور سماج کی ایسی تلخ حقیقتوں کو پیش کیا ہے جس سے ہمارا ملک اس وقت دوچار ہو رہا تھا۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اکبر کو اردو ادب میں وہ مقام حاصل نہیں ہوا جس کے وہ حقدار تھے۔ عام طور پر انھیں طنز و مزاح کا شاعر کہا جاتا ہے اور ان کی شاعری کو اسی صف میں رکھ کر اس کی وقعت سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ عام قارئین ان کی مزاحیہ شاعری کا مطالعہ کر کے چند لمحوں کے لیے لطف اندوز ہو کر سرسری گزر جاتے ہیں اور اس کی گہرائی میں نہیں اترتے لیکن اس طرح ان کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا۔ اکبر کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے لیے گہرا تنقیدی شعور اور سماجی بصیرت درکار ہے ساتھ ہی ہندوستان کی قدیم تاریخ اور اس دور کے سماجی و سیاسی حالات کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔ اکبر کی شاعری اپنے دور کے حالات کی ترجمان اور اس وقت کے ماحول کی پیداوار تھی جب ہندوستان پر برطانوی حکومت اور نئی ایجادات سے متاثر ہو کر تغیر و تبدل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مشہور نقاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اپنے مضمون 'اکبر اور ان کا پیغام' میں اس دور کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"یہ دور ہندوستانی سماج اور ہندوستانی سیاست میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہندوستان اس وقت ایک تحیر کن خلفشاری دور سے گزر رہا ہے۔ ایک طرف تو سائنسی ایجادات، اختراعات، اصول اور تجربے تھے، دوسری طرف غیر ملکی قبضہ اور ان سے نفرت و محکومیت کا جذبہ کارفرما تھا۔ ایک طبقے کو اگر اپنی ثروت و جاہ کے مٹنے کا الم تھا تو دوسرے کو اپنی روایات و اعتقادات کے باطل و شکست ہونے کا غم پریشان کر رہا تھا اور نتیجے کے طور پر دونوں طبقے اس نئی اور جابر حکومت سے بیزار نظر آ رہے تھے۔ اقتدار کے گھٹنے کا احساس، ریل گاڑی، بنگلہ، پاٹ، صابون، اخبار، تار، ڈاک، ٹیلیفون لوگوں کے لیے خواب پریشاں سے کم نہ تھے۔"

[نئی فکریں۔ سید محمد عقیل رضوی۔ ص۔ 165.166]

اکبر الہ آبادی کی شاعری میں طنزیہ عناصر، علامت نگاری، اشاریت نئے ادب و نظریات کی مخالفت وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں جس سے اکثر لوگ واقف ہیں لیکن ان کے کلام کی ایک بہت بڑی خصوصیت جس پر عام قارئین و ناقدین کی توجہ کم رہی ہے وہ ہے ان کی ذو معنی شاعری۔ ذو معنی سے مراد دو معنوں والا ہے مثلاً وہ بات جس میں کئی پہلو یا کئی معنی نکلتے ہوں جس کے تحت شاعر اپنے خیالات کا اظہار بھی کر دیتا ہے اور اسے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا۔ اکبر کا دور وہ دور تھا جس میں اپنی آواز کو ادبی سطح پر بلند کرنا برطانوی حکومت کے لیے ناگوار تھا اس لیے انھیں علامتوں، اشاروں، کنایوں اور طنز و مزاح کا سہارا لینا پڑا اور اس طرح ان کی شاعری کے دو معنی ظاہر ہوتے ہیں، ایک تو سطحی معنی جو سرسری ہوتا ہے اور جلد ہی گرفت میں آ جاتا ہے اور دوسرا جو تھوڑا غور و فکر اور ذہنی ورزش کے بعد برآمد ہوتا ہے۔ اکبر کے یہاں ایسے اشعار بے شمار ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دیہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

یہاں بسکٹ، پوری اور چپاتی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یوں تو ہم سبھی واقف ہیں کہ پوری اور چپاتی بسکٹ کے بہ نسبت زیادہ نرم ہوتی ہے اور دیہات کے لوگ پوری اور چپاتی کا ہی استعمال کرتے ہیں یہ تو عام معنی ہیں جن سے ہم چند لمحات کے لیے لطف اندوز تو ہوتے ہیں لیکن اس کے اصل معنی و مفہوم کی جانب توجہ کم دیتے ہیں جس کی وضاحت کے لیے مزید گہرائی میں جانا پڑے گا۔ ذرا غور کیجیے کہ بسکٹ سے انگریزوں کی طرف اشارہ کیا ہے، پوری ہندوؤں اور چپاتی مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتی ہے مثلاً ہندوستانی خواہ ہندو ہو یا مسلم، انگریزوں کے بہ نسبت زیادہ رحم دل ہیں اور ان کے برعکس برطانوی حکمراں بے حد سخت ہیں اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ پہلے مصرعے میں دیس کا ذکر آیا ہے جو کہ راگ کی ایک قسم ہے جس سے اکبر کے علم موسیقی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ذو معنویت کی ایک اور مثال دیکھیں:

الٰہی خانہ انگریز گرجا
یہ گرجا ہے، یہ گرجا ہے، یہ گرجا

اکبر نے بڑی خوبی اور صلاحیت کے ساتھ طنز کے پیرائے میں اپنی بات کو پیش کیا ہے کہ یہ گرجا انگریزوں کا عبادت خانہ ہے لیکن اس کے پس پردہ ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ اکبر نے لفظ 'گرجا' کو ذو معنی میں استعمال کیا ہے، ایک معنی تو عبادت خانہ گرجا ہے اور دوسرے معنی میں گرجا گھر کا گر جانا مثلاً وہ گرجا پر لعنت بھیج رہے ہیں کہ یہ گرجا گر جائے۔ اگلے شعر کا ایک مصرع دیکھیے:

جھوٹے ہیں ہم تو آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ

اکبر کا دور وہ تھا جب انگریز ہندوستان پر حکومت کر کے ہندوستانیوں کا استحصال کر رہے تھے جس سے ان دونوں کے درمیان رنجش بڑھتی جا رہی تھی۔ انگریز حکمراں لارڈ کرزن نے ہندوستانیوں کو دھوکے باز اور جھوٹا قرار دیا اور یہ بھی کہا کہ یہ ناقابل اعتبار ہیں۔ اکبر نے اپنی ذہانت اور سوجھ بوجھ سے کام لیا اور اس کے جواب میں مذکورہ بالا مصرع پیش کیا جس میں طنز کی نشتریت بھی ہے، صداقت کی کڑواہٹ بھی اور مبالغے کی چاشنی بھی جس کے ایک معنی ہیں کہ ہمیں قبول ہے کہ ہم ہندوستانی جھوٹے ہیں اور آپ ہمارے حکمراں اور بادشاہ ہیں اور دوسرے معنی

ہیں کہ آپ جھوٹوں کے بادشاہ ہیں مطلب ہم سے بھی بڑے جھوٹے ہیں۔ کلام اکبر میں ذو معنویت کی ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ چند اشعار پیش نظر ہے:

مناتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں
ہم آہ بھی بھرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
قتل سے پہلے ہے کلور و فارم
شکر ہے ان کی مہربانی کا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

اکبر کے یہاں جو طنز و مزاح ہے وہ ادنیٰ درجے کا نہیں بلکہ معیاری ہے جو آئندہ نسلوں کے لیے نہ صرف قابل تقلید ہے بلکہ یہ ان کے لئے مشعل راہ بھی ثابت ہوا۔ اکبر نے اپنے فن کو خاص آہنگ، منفرد لب و لہجہ، دلچسپ اسلوب اور شگفتہ انداز میں پیش کیا جس میں انھوں نے ایک نازک مگر اہم موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے فن کے تقاضوں اور ادب کے مقاصد کو بھی پورا کیا۔ اکبر کا زمانہ وہ زمانہ تھا جس میں قدیم تہذیب کا زوال اور اس کی جگہ نئی تہذیب کا استقبال ہو رہا تھا۔ مغرب پرستی، مغربی افکار و خیالات کی انتہا پسندی اور اس کے ساتھ لوگوں کے رہن سہن، تعلیم و تہذیب اور زبان و بیان پر مغرب کا گہرا اثر نمایاں تھا، چونکہ اکبر مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے اس لیے وہ اس انتہا پسندی کو طنز و مزاح کی ڈھال سے روکنا چاہتے تھے۔ طنزیہ شاعری بھی احتجاجی شاعری کے زمرے میں شامل ہے جس کا مقصد سماجی و سیاسی ناپسندیدگی کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔ اکبر کے یہاں اس طرح کا احتجاج نہیں جیسا ترقی پسندوں کے یہاں ہے بلکہ ان کا احتجاج ان کی طنزیہ شاعری کے پیچھے مخفی ہے جس کو وہ بڑے ہی بذلہ سنجی کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ چونکہ ان کی نگاہ دوررس نے مغربی تہذیب سے رونما ہونے والے خطرات کا اندازہ لگا لیا تھا لہٰذا انھوں نے مشرقی تہذیب کی خوبیوں کو ظاہر کرتے ہوئے مغرب پرستی کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ اکبر کے جدید تعلیم و تہذیب پر طنز سے متعلق سنجیدہ نقاد ڈاکٹر قمر رئیس اپنے مضمون 'نشاۃ ثانیہ کی روشنی اور اکبر کا کردار' میں فرماتے ہیں:

''اکبر بلاشبہ ایک نازک عبوری دور سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ایسا دور جس میں تہذیب و تعلیم کے قدیم و جدید ادارے باہمی طور پر متصادم تھے۔ اس آویزش نے فرد اور معاشرہ دونوں کی اندرونی دنیا میں بھی کشمکش ہی نہیں پیکار کی صورت پیدا کر دی تھی۔ خاص طور سے سوچنے والے انسان ایسے سوالوں کے نرغے میں تھے جن سے نجات پانا آسان نہیں تھا۔ اکبر کے اشعار اور دیگر تحریروں میں یہ سوال کثرت سے سر اٹھاتے ہیں اور قارئین کے دلوں میں بھی اسی طرح کا ہیجان اور ٹکراؤ پیدا کر دیتے ہیں جس نے اکبر کے وجود میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اکبر نئی پیڑھی کے جوانوں اور نئی تعلیم کے فرزندگان میں خود آگہی اور بیداری کے ساتھ ساتھ تکبر و احساس اور اقدار کے ایک نئے نظام کے طلوع ہونے کا منظر دیکھنے لگے تھے''۔

[فکر و تحقیق جلد 12، شمارہ 1، جنوری تا مارچ 2009]

جدید تعلیم و تہذیب سے متعلق چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب
عقل سپرد ماسٹر، مال سپرد آنجناب
جان سپرد ڈاکٹر، روح سپرد ڈارون
نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یوں ہی کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے
کالج میں بگڑ جاؤ گے وسواس یہی ہے
تم پاس رہو میرے بڑا پاس یہی ہے
تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

جدید تعلیم کے خلاف اکبر کا جو نظریہ ہے اس سے متعلق مشہور و معروف ناقد شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اظہار خیال کرتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اکبر پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں تعلیم، ترقی، اصلاح اور جدید مصنوعات اور وسائل کے قیام کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ دراصل نو آبادیاتی سیاست اور مغربی سرمایہ دارانہ پھیلاؤ کے استحکام کے لیے ہے۔ خاص کر نئی تعلیم کے تخریبی اثرات، اور اس کے باعث مشرق و مغرب کے درمیان ذہنی کشمکش کا احساس بھی اکبر کو اقبال سے پہلے ہوا۔''

[فکر و تحقیق، جلد 12، شمارہ 1، جنوری تا مارچ 2009]

کلام اکبر میں جدید تعلیم و تہذیب کے ساتھ ساتھ مذہب کے خلاف بھی احتجاج ملتا ہے، ان کے ذہن میں تعلیم کا مفہوم ہمیشہ مذہبی تعلیم سے متعلق رہا ہے اور ایسی تعلیم جو صرف مکتب میں ہی حاصل کی جائے۔ جس طرح علوم مشرقیہ کی تعلیم اس وقت دی جا رہی تھی۔ اکبر کا خیال تھا کہ کالج میں مذہبی تعلیم نہیں دی جائے گی اور اگر ایسا ہوا بھی تو وہ بس فیشن کے طور پر ہو گی اس کا مذہب سے کوئی خاص تعلق نہ ہوگا۔ مذہب کے نام پر لوگوں کو اور گمراہ کیا جائے گا جیسا کہ موجودہ دور میں اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مغربی تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں نے عربی پڑھنا اور تلاوت قرآن بھی ترک کر دیا اور اسی سبب وہ اخلاقیات اور دین و مذہب سے بیگانہ ہو رہے ہیں:

آگے انجن کے دین ہے کیا چیز
بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز
قلزم کی تہہ ٹٹولو یا ایرشپ میں جھولو
پھر بھی یہی کہوں گا اللہ کو نہ بھولو
عوض قرآن کے کے اب ہے ڈارون کا ذکر یاروں میں
جہاں تھے حضرت آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں
طفل دل محو طلسم رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا
شیطاں عربی سے ہند میں ہے بے خوف
لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں
مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ بات غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

مختصر یہ کہ اکبر کی شاعری میں مزاح کی چاشنی کے ساتھ طنز کی تلخی بھی موجود ہے۔ انھوں نے مغربی تہذیب پر طنز تو کیا لیکن اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا اور ویسے بھی طنز و مزاح محض شوق نہیں بلکہ سماج کی ایک ضرورت ہے جس کے سانچے میں ڈھل کر وہ شعر و ادب وجود میں آتا ہے جس سے دماغ کے بند دریچے کھل جاتے ہیں۔ اکبر قدامت پسند ہرگز نہ تھے، اور نہ ہی وہ تہذیب نو کے خلاف تھے بس ان کا خیال یہ تھا کہ اگر ہر جگہ مغربی تہذیب کی اکثریت ہوگی تو مشرقی تہذیب کہاں جائے گی۔ وہ ایک سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے لیکن اپنے اظہار خیال کے لیے طنز و مزاح کو وسیلہ بنایا، اگر وہ سیدھے اپنی بات کہتے تو شاید اس وقت ان کی آواز اور ان کے پیغام کی رسائی عوام تک نہ ہو پاتی اور ہم اس وقت کے حالات سے آشنا بھی نہ ہو پاتے۔ اکبر بڑے پیچیدہ شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں ذو معنویت اور احتجاج کے ساتھ ساتھ الجھاؤ بھی ہے لہٰذا ان کی تہہ دار شاعری کا ایک بار پھر سے گہرا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس شعر پر مقالے کو ختم کرنا چاہوں گی کہ:

کیوں کر نہ شعر اکبر آئے پسند سب کو
یہ رنگ ہی نیا ہے کوچہ ہی دوسرا ہے

■

**Arshia Sarfaraz**
Research Scholar, Dept of Urdu
Allahabad University
Allahbad - 211002 (UP)

پرویز عادل ماجی

# مُدینہ' کے مولوی مجید حسن

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اردو کے تین اخبار افق صحافت پر نمودار ہوئے اوران تینوں ہی اخبارات نے اردو صحافت کو نئی سمت اور نئی پہچان بخشی۔تحریک آزادی میں جو خدمات مذکورہ اخبارات نے انجام دیں اگران کا ذکرتحریک آزادی کی داستان یا افسانوں میں نہ کیا جائے تو ہم یقینی طور پر اس کتاب کے مستند اور معتبر ہونے پر سوال کھڑے کر سکتے ہیں۔ان اخبارات میں سب سے پہلے بجنور صدر مقام سے اخبار'مدینہ' جاری ہوا جس کو بجنور کے عظیم فرزند مولوی مجید حسن نے یکم مئی 1912 کو ہفت روزہ اخبار کی شکل میں جاری کیا تھا۔ مدینہ کے بعد جاری ہونے والا دوسرا اخبار ہفت روزہ 'الہلال' تھا جس کو اردو کے نامور ادیب اور صحافی مولانا ابوالکلام آزاد نے 13 جولائی 1912 کو دہلی سے جاری کیا تھا۔تیسرا اہم اخبار ہمدرد تھا جس کو مولانا محمد علی جوہر نے 23 فروری 1913 کو جاری کیا تھا۔ یہ تینوں ہی اپنے زمانے کے اہم ترین اخبار تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور محمد علی جوہر کے اخباروں کے درمیان مولوی مجید حسن کے اخبار'مدینہ' کا خود کو قائم رکھنا اور عالمی شہرت حاصل کرنا ایک بڑا کارنامہ اور تاریخ صحافت کا معجزہ ہے۔ مدینہ اخبار کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس نے طویل عمر پائی اور ہزار دقتوں کے باوجود 68 برس تک یہ اخبار اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ ملک وملت کی خدمت انجام دیتا رہا۔ اردو صحافت کے نامور اور سب سے کامیاب کہے جانے والے اخبار الہلال کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کو نکالنے والا شخص اپنے زمانے کا بڑا ادیب اور عظیم سیاسی رہنما تھا اور ایسے نوابین کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی جو مولانا آزاد کے الہلال کا مالی تعاون کرنا چاہتے تھے۔ تاہم یہ صداقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مولانا آزاد نے ایسی کسی پیش کش کو کبھی قبول نہیں کیا۔

23 فروری 1913 سے جاری ہوئے 'ہمدرد' کی حیثیت سے کون واقف نہیں ہے جب کہ اس کو نکالنے والی ذات خود محمد علی جوہر کی تھی۔ اس کے برعکس 'مدینہ' کے مالک مجید حسن تھے جو ستودہ صفات سے مزین ہونے کے علاوہ کسی بیک گراؤنڈ کے بظاہر مالک نہ تھے،ان کی غیر معمولی استعداد اور ذاتی خصوصیات کی بناء پر قوم نے ان کو مولوی کے لقب سے پکارا تھا۔ اخبار مدینہ کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی مجید حسن نے متعدد مقامات پر اس صداقت کا اعتراف کیا اور کہا کہ مدینہ کو جاری کرتے وقت اللہ رب العزت کی مدد و نصرت کے علاوہ بظاہر کسی دوسرے سروسامان سے میرا دامن خالی تھا۔ اس لیے یہ کہنا قطعاً مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ اخبار مدینہ کا الہلال و ہمدرد کے مقابلہ طویل عمر پانا اور تمام دقتوں کے باوجود 62 برس تک ملک وملت کی خدمت کے لیے آمادہ رہنا کے پس پشت مولوی مجید حسن کی وہ ذاتی خصوصیات تھیں جو اللہ نے خصوصی طور پر ان کو ودیعت فرمائی تھیں اور جس کا اعتراف ان کے انتقال کی خبر سننے کے بعد ملک و بیرون ملک سے آئے تعزیتی خطوط میں قارئین مدینہ نے کیا۔ یہاں پر اس حقیقت کا اعتراف نہ کرنا اخلاقی جرم ہوگا کہ اخبار مدینہ کی ترویج واشاعت میں ان کی اہلیہ کنیز فاطمہ کی قربانیاں لافانی اور لازوال تھیں۔کنیز فاطمہ نے اپنا وہ تمام اثاثہ مولوی مجید حسن کو یہ کہتے ہوئے سپرد کر دیا تھا کہ آپ اس کو فروخت کر دیں اور مدینہ کو اردو صحافت کا مثالی نمونہ بنا دیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ محترمہ کنیز فاطمہ کی قربانی اور تعاون کے بعد اخبار مدینہ نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا اور مولوی مجید حسن کو ضلع بجنور میں اردو صحافت کے عہدہ امامت پر فائز کرنے کے بعد خود اردو صحافت کا قبلہ کہلایا۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ اخبار مدینہ کو پھاڑا اور جلایا بھی گیا، مدیران مدینہ کو آوازحق بلند کرنے کی پاداش میں جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ مدینہ سے بار بار ضمانت طلب ہوئی لیکن مولوی مجید حسن کے پاؤں میں ذرا لرزش نہیں آئی اور وہ انگریزی قہرو استبداد کے آگے سینہ سپر رہے۔ مئی 1919 میں پنجاب کے جلیاں والا باغ میں انگریزوں نے بے گناہ اور نہتے ہندوستانیوں پر خوب گولیاں برسائیں جس میں سیکڑوں ہندوستانی شہید ہوئے۔ انگریزی حکومت کے ظلم اور قہرو استبداد کے خلاف اخبار مدینہ نے زبردست احتجاج کیا اور جنرل ڈائر کے ذریعے بے گناہ ہندوستانیوں پر گولی چلانے کے حکم کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ صدائے حق بلند کرنے اور انگریزی حکومت سے ٹکرانے کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ اخبار مدینہ پر پابندی کی شکل میں سامنے آیا لیکن مولوی مجید حسن کی ہمت و استقامت بڑھتی ہی گئی۔انھوں نے انگریزی حکومت کو خبردار کیا اور کہا کہ وہ ہندوستانیوں پر کیے جارہے ظلم ستم سے باز آئے۔ ساتھ ہی ایک دوسرا ہفت روزہ 'یثرب' کے نام سے جاری کیا۔ یثرب کی پیشانی علامہ اقبال کے شعر:

خاک یثرب از دو عالم خوشتر ست
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر ست

سے جھلمل ہوا کرتی تھی۔ ابھی یثرب کے محض چھ شمارے ہی شائع ہوئے تھے کہ انگریز حکومت یثرب کی شکل میں سامنے آئے مدینہ کے رنگ کو پہچان گئی۔ نتیجہ کے طور پر مولوی مجید حسن کے اخبار یثرب پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔ یثرب پر پابندی عائد کئے جانے کا شکوہ انھوں نے 13 اگست 1913 کو منظر عام پر آئے یثرب کے آخری شمارے میں اس طور پر کیا:

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

25 اگست 1919 سے اخبار مدینہ دوبارہ جاری ہوا اور مولوی مجید حسن کی آخری سانس تک متواتر جاری رہا جس نے ملک وملت کی عظیم خدمت انجام دی۔ اس سے قبل اخبار مدینہ یکم جنوری 1917 سے ہفتہ میں دوبار نکلنے لگا تھا۔

اخبار مدینہ عالمی صحافت کے معیار پر قائم رہ سکے۔ اس کے لیے انھوں نے ترقی یافتہ ملکوں کی اعلی صحافت کے اصول کار کو اپنایا۔ انھوں نے تجارتی اور ادارتی پہلو ایک دوسرے سے بالکل جدا رکھے۔ وہ

ادارتی عملے کو پوری آزادی دیے جانے کے حامی تھے اور وہ آخری وقت تک پوری ایمانداری سے اس اصول پر کار بند رہے۔ چنانچہ مدیران کی تقرری سے قبل ان کو لکھ دیا جاتا تھا ''مدینہ کی پالیسی قوم پرورانہ ہے۔ اس پالیسی سے اتفاق ہو تو براہ کرم تشریف لا کر ہماری عزت وہمت بڑھائیے اس پالیسی سے جو افراد متفق ہوتے اور وہ جب بجنور تشریف لاتے تو مولوی مجید حسن ان کو سر آنکھوں پر بیٹھاتے، ان کے آرام وآسائش کا پورا خیال رکھتے۔ اکثر مدیران مدینہ کو اپنے دستر خوان پر شریک رکھتے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیتے کہ انھیں مذکورہ پالیسی کے فریم ورک میں لکھنے کی پوری آزادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو صحافت کی زبوں حالی کے باوجود ملک کے ممتاز اہل قلم نے مدینہ کے ادارتی فرائض انجام دینے میں ہمیشہ مسرت محسوس کی۔ اس کے مدیران کی فہرست میں ہمیں علی الترتیب حافظ نورالحسن ذہین، آغا رفیق بلند شہری، مولا مظہرالدین شیرکوٹی، مولوی نصیرالحق دہلوی، مولوی اعتقاد حسین بریلوی، حافظ علی بہادر خاں مرادآبادی، شاہ خلیل الرحمٰن بہاری، قاضی عدیل عباسی، قاضی بدرالحسن جلالی، مولوی امین احسن اصلاحی، مولوی شبیرالحسن چاندپوری، مولوی نور الرحمٰن نچھرایونی، مولانا نصراللہ خاں عزیز، مولوی محمد احسن نچھرایونی، ابوسعید بزمی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولا ابواللیث اصلاحی، قدوس صہبائی، مولانا حامدالانصاری غازی، حمید حسن فکر، ضیاء الحسن فاروقی اور مولوی مجید حسن صاحب کے بیٹے سعید اختر جیسے مشہور اہل قلم کے نام نظر آتے ہیں۔

اخبار مدینہ کی مقبولیت اور قارئین کی زبردست تعداد کے مد نظر یکم جنوری 1933 سے اخبار مدینہ روزنامہ کی شکل میں جاری ہوا، پورے ملک نے روزنامہ مدینہ کا پر جوش خیر مقدم کیا اور روزانہ مدینہ کو آسمان حریت کا ایک تازہ آفتاب قرار دیا۔

اس کے پہلے مدیر مسئول مولانا نصراللہ خاں عزیز تھے لیکن بجنور سے ٹرانسپورٹ کی بہتر سہولیات نہ ہونے کے سبب جلد ہی روزنامہ مدینہ کو بند کرنا پڑا البتہ سہ روزہ مدینہ دنیا کے 40 ممالک میں پوری آب وتاب کے ساتھ ہندوستانی اردو صحافت کی نمائندگی کرتا رہا۔ عزیز لکھنوی کا یہ شعر:

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

مدینہ کی پیشانی کو مزین کرتا رہا اور قارئین کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے اخبار مدینہ کی پہچان بن گیا۔

مولوی مجید حسن بچوں سے بڑی محبت کرتے تھے اور بچوں کو ملک وملت کا عظیم سرمایہ سمجھتے تھے، اس لیے بچوں کی خصوصی تربیت پر کافی سے زائد توجہ دیے جانے کے حامی تھے۔ قوم کے بچے تعلیم وتربیت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر ملک وملت کی تعمیر میں ذمہ دار شہری کی طرح کردار نبھائیں۔ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے 1922 سے بچوں کے لیے ہفت روزہ 'غنچہ' جاری کیا جس کے سرورق پر وہی مقصد عیاں تھا جو غنچہ کی اشاعت کے پس پشت مولوی مجید حسن کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ مطلب یہ کہ ''بچوں کی تعلیم قومیت کی تعمیر ہے۔''

16 صفحات پر مشتمل یہ ہفت روزہ پوری طرح بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے وقف تھا۔ اخلاقی حکایات و افسانوں کے علاوہ بچیوں کے لیے کشیدہ کاری کے نمونے بھی غنچہ کے آخری صفحات پر دیے جاتے تھے۔ اسکولی طلبا کے لکھے مضامین بھی شامل اشاعت ہوتے تھے اور ان کو نظم ونثر کے نکات بھی سکھلائے جاتے تھے۔ 08 جنوری 1951 کو جاری ہوئے غنچہ کے سالنامہ پر حامد حسن قادری کا تحریر کردہ:

اس غنچہ کی دھوم ملک میں ہر سو ہو
اس گل کا نیا رنگ نرالی بو ہو
اس غنچہ کا ہر ورق تخن نجوں کو
آئینہ حسن شاہد اردو ہو

قطعہ آج بھی جھلملاتا نظر آتا ہے۔ غنچہ کے پہلے مدیر اپنے زمانے کے معروف ادیب وشاعر محمد وارث کامل تھے۔ غنچہ اپنے زمانہ کا انتہائی مقبول رسالہ تھا اور یہ ہر اس ملک میں پسند کیا جاتا تھا جہاں اخبار مدینہ کے قارئین تھے اور اس بات سے کون واقف نہیں کہ جاپان میں بھی اخبار 'مدینہ' کے پانچ خریدار ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ مولوی مجید حسن نابغہ روزگار شخصیت تھے اس لیے ان کا تحریکی واصلاحی کارواں مدینہ، یثرب اور غنچہ نکالنے پر ہی نہیں ٹھہرا بلکہ انھوں نے مارچ 1935 سے مذہبی افکار وخیالات پر مبنی ماہنامہ 'فاران' جاری کیا 80 صفحات پر مشتمل یہ ماہنامہ اس وقت 06 ہزار کی تعداد میں چھاپا جاتا تھا اور یہ ماہ کی 15 تاریخ کو دفتر مدینہ سے جاری ہوا کرتا تھا۔ فاران کی تقریب اجرا سے متعلق اردو کے مشہور شاعر میر افق کاظمی نے جو قطعہ مولوی مجید حسن کو تحریر کیا۔ اس کا ایک ایک حرف مولوی مجید حسن اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتا ہوا نظر آتا ہے:

ہو اہل مدینہ کو یہ فاران مبارک
مامون رہے جملہ مسلمانان ومدینہ
تاریخ دعائیہ افق لکھدو علی الفور
افزوں رہے یہ غنچہ وفاران ومدینہ

ماہنامہ فاران کے پہلے ایڈیٹر اپنے زمانہ کے مشہور عالم دین مولانا سعید انصاری تھے۔

مولوی مجید حسن اور ان کی حیات وخدمات پر تحریر کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ امید ہے عنقریب تحقیقی ذہن رکھنے والے نوجوان اپنے محسن ومربی کے زریں کارنامے عوام الناس کے سامنے لائیں گے۔

11 نومبر 1966 کا دن اخبار مدینہ کی زندگی کا سب سے تاریک دن ہے کہ اس دن اپنی محنت وکاوش سے مدینہ کو تناور درخت بنانے والے مولوی مجید حسن اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ سہ روزہ مدینہ میں شائع ہوئی مولوی مجید حسن کے انتقال کی خبر ملک و ملت کے دل ودماغ پر بجلی بن کر گری اور پورے ملک نے مولوی مجید حسن کی موت کو قومی نقصان سے تعبیر کیا۔ خوشتر مکرانوی نے نوحہ غم کیا لکھا بس دل نکال کر رکھ دیا ہے:

قوم وملت پر ترے احسان ہیں
کارنامے سب تیرے ذیشان ہیں
رہنمائے قوم ہوں کہ فلسفی
تیرے درس زیست پہ قربان ہیں
جتنے بھی اہل قلم ہیں ہائے ہائے
کتنے تیری موت سے حیران ہیں

مشہور عالم دین اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولوی مجید حسن کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''اگر ہماری قوم بیداری کا مظاہرہ کرتی اور اس میں ہیرے کو پہچاننے کی صلاحیت ہوتی تو وہ مولوی مجید حسن کی زندگی سے بڑا فیض اٹھا سکتی تھی۔''

افسوس کہ مولوی مجید حسن کے انتقال سے محض 8 برس بعد تک اخبار مدینہ زندہ رہا اور اپنی عمر کے 62 برس مکمل کر لینے کے بعد تاریخ کا زریں باب بن گیا۔

ایسا نہیں کہ مولوی مجید حسن کی اولاد میں وہ صلاحیت نہیں تھی جو کہ اخبار مدینہ کی ترویج واشاعت کے لیے ضروری تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ دور ہی ہفت روزہ اور سہ روزہ صحافت کے لیے سازگار نہیں رہ گیا تھا جب کہ وطن کی تقسیم ملت کے زریں مستقبل کا گلا گھونٹنے کے ساتھ اردو صحافت کی کمر پہلے ہی توڑ چکی ہو۔

شخص دنیا سے چلا جاتا ہے مگر شخصیت کبھی نہیں مرتی۔ مولوی مجید حسن ایسی ہی شخصیت تھے۔ یہ لکھتے وقت بڑا تعجب اور احساس ندامت سے گریباں چاک ہوتا ہے کہ آج اس سرزمین بجنور سے کتنے اردو اخبار نکل رہے ہیں... افسوس کہ ایک بھی نہیں۔

■

**Parvez Adil Mahi**
Qazi Sarai, Nagina (Bijnor)
Pin-246762

# سردار جعفری

## حکایاتِ خونچکاں کا شاعر

یونس غازی

علی سردار جعفری ترقی پسند شعرا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ترقی پسند رہنماؤں میں سجاد ظہیر کے بعد کوئی نام ادب و احترام کے ساتھ لیا جاسکتا ہے تو وہ سردار جعفری کا ہے۔ وہ مارکسی نظریات سے براہِ راست متاثر تھے اور آخر تک وہ اسی تحریک سے وابستہ اور سرگرم رکن رہے نیز اپنے خیالات اور ترقی پسند نظریات کی ترویج و تبلیغ کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرتے رہے۔

سردار جعفری کی پیدائش 29 نومبر 1913 کو بلرام پور ضلع گونڈہ میں ہوئی۔ والد کا نام سید جعفر طیار جعفری تھا۔ دہلی یونیورسٹی کے اینگلو عربک کالج سے بی اے کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم اے میں داخل ہوئے مگر 1936 میں یونیورسی سے انگریزوں کی مخالفت کرنے اور سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے اخراج ہوگیا۔ بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی میں 40-1939 میں ایم۔اے کے سال اوّل میں داخلہ لیا مگر یہاں بھی ان کو رہنا نصیب نہ ہوا، جنگ مخالف پروپیگنڈے کے جرم میں فائنل امتحان دینے سے پہلے ہی گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا۔ رہا ہونے کے بعد بھی بلرام پور میں نظر بند رہے۔ انھوں نے کبھی ملازمت کی اور نہ کسی کاروباری صیغے سے وابستہ رہے۔ یکم اگست 2000 کو ان کی وفات ہوئی۔

سردار جعفری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ 1938 میں ان کے افسانوں کا مجموعہ 'منزل' کے نام سے شائع ہوا اور شاعری کا پہلا مجموعہ 'پرواز' کے نام سے 1943 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد متواتر شعری مجموعے شائع ہوتے رہے۔ ان میں 'نئی دنیا کو سلام' 1948 میں اور 'خون کی لکیر' 1949 میں شائع ہوئے۔ 'ایشیا جاگ اٹھا' 1951 میں اور 'پتھر کی دیوار' 1953 میں منظر عام پر آئے۔ بعد میں تین مجموعے 'ایک خواب اور'، 'پیراہن شرر'، 'لہو پکارتا ہے' نیز 'آبلہ پا' اور 'نومبر میرا گہوارہ' شائع ہوئے۔

جعفری کو ان کی شاعری اور دیگر ادبی وسماجی سرگرمیوں پر بہت سے ایوارڈ بھی عطا کیے گئے۔ پدم شری بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ، سوویت یونین نہرو ایوارڈ، سنت گیانیشوری ایوارڈ، اور بہت سی اردو اکادمیوں نے بھی ان کی ادبی خدمات پر اپنے اپنے اعزازات سے نوازا۔

سردار جعفری جہاں تک ایک طرف حافظ، رومی، جامی، عرفی، نظیری، شیکسپیئر، ملک محمد جائسی، تلسی اور کبیر سے متاثر تھے تو دوسری طرف میر تقی میر، میر انیس اور نظیر اکبرآبادی کی ادبی وراثت اور روایات سے بھی استفادہ کیا۔ بعد میں وہ علامہ اقبال کے بھی مداح ہوگئے تھے۔ اگر وہ اپنی معرکتہ لآرا کتاب 'ترقی پسند ادب' میں ابال اور قرۃ العین حیدر کے متعلق ان کا رویہ اثباتی نہیں تھا مگر جب انھوں نے 'اقبال شناسی' کے نام سے کتاب لکھی اور اقبال صدی کی تقریبات میں گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تو اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ اقبال کی عظمت کے معترف تھے:

''میں اپنی جوانی میں اقبال کے بارے میں کچھ الگ ہی رائے رکھتا تھا، بعد میں اندازہ ہوا کہ اقبال پہلے شاعر ہیں جنھوں نے لفظ انقلاب استعمال کیا ہے۔''

اسی طرح قرۃ العین حیدر سے انھیں یہ شکایت رہی ہوگی کہ وہ اپنے نثری ادب میں اشرافیہ کی نمائندگی کرتی ہیں جبکہ سردار جعفری عوامی ادب کے ہم نوا اور رسیا تھے۔

اقبال کے متعلق جب ان کا رویہ بدلا تو ان کے کچھ مداحوں اور ترقی پسند ادب کے جذباتی ہمدردوں کو ناگوار گزرا مگر وہ اپنے بدلے ہوئے رویے پر اٹل اور ثابت قدم رہے۔ ان تمام معترضین کا جواب انھوں نے بعد کی ایک نظم 'نومبر میرا گہوارہ' کے وسیلے سے دیا۔

انھوں نے میر، میرابائی، اور کبیر کے انتخابات بھی اردو اور ہندی زبانوں میں اپنے مقدموں کے ساتھ شائع کیے جو بعد میں 'پیغمبرانِ سخن' کے نام سے کتابی شکل میں چھاپے گئے۔ ہندی والوں میں اردو کے عظیم شاعر غالب کو متعارف اور مقبول بنانے میں بھی ان کا اہم کردار رہا، غالب کی شاعری کا ہندی زبان میں ترجمہ بھی کیا جو ایک پائیدار اور یادگار کارنامہ ہے۔ اردو سے ان کو بے پناہ تعلق تھا۔ اس کے لیے انھوں نے پوری زندگی جدوجہد کی، وہ گجرال کمیٹی کے روحِ رواں تھے۔

اُن کے شعری سفر کا آغاز اس شعر سے ہوا، جو کم عمری میں کہا گیا تھا:

دامن جھٹک کے منزل غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گرد سفر مجھے

سترہ برس کی عمر میں انھوں نے جو پہلا مرثیہ کہا اس کا ایک بند یہ ہے:

آتا ہے کون شمع امامت لیے ہوئے
اپنے جلو میں فوج صداقت لیے ہوئے

ہاتھوں میں جام سرخ شہادت لیے ہوئے
لب پر دعائے بخشش امت لیے ہوئے
اللہ رے حسن فاطمہ کے ماہتاب کا
ذرّوں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

جب ان کی شعری مسافت زیادہ روشن اور تابناک ہوئی، زندگی کا شعور پختہ ہوا۔ نظر میں وسعت آئی اور سماجی مسائل نے راہ پکڑی اور عوامی ادب کی طرف توجہ مبذول ہوئی تو وہ اپنے ایک مضمون 'ترقی پسند مصنّفین کی تحریک' جو 1939 میں چھپا تھا، لکھتے ہیں:

''شاعر یا ادیب کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والے محرکات گرد و پیش کی اس دنیا میں پائے جاتے ہیں، جہاں تمام انسان زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ محرکات خود اس سماجی اور اقتصادی نظام کی پیداور ہوتے ہیں، جو انسانی زندگی کی شیرازہ بندی کرتا ہے، اس لیے اعلیٰ شاعری یا ادب ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا ترجمان ہوتا ہے۔''

یہ وہ احساس ہے جو سردار جعفری کی تمام شاعری کی روح ہے، اسی لیے ان کی شاعری میں تین چیزیں بڑی نمایاں ہیں:

(1) انسان دوستی: وہ کسی مذہب، فرقہ یا ذات گروہ کی بات نہیں کرتے آدمیت، انسانیت اور بھائی چارے پر زور دیتے ہیں۔

(2) حریت: وہ ہر طرح کی آزادی کے طلب گار ہیں۔

(3) وطنیت: وہ اپنی مادر وطن سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ اپنے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کا خواب دیکھتے ہیں اور آزادی کے بعد دونوں ملک ہند و پاک کی دوستی اور سالمیت پر بھی انھوں نے نظمیں کہی ہیں۔ ان میں سے ایک 'سرحد' کے نام سے ہے جو اس وقت تک گائی جاتی رہے گی جب تک یہ دونوں حقیقتیں وجود پذیر رہیں گی جس سے دلاسہ اور سہارا ملتا رہے گا۔ آج کے

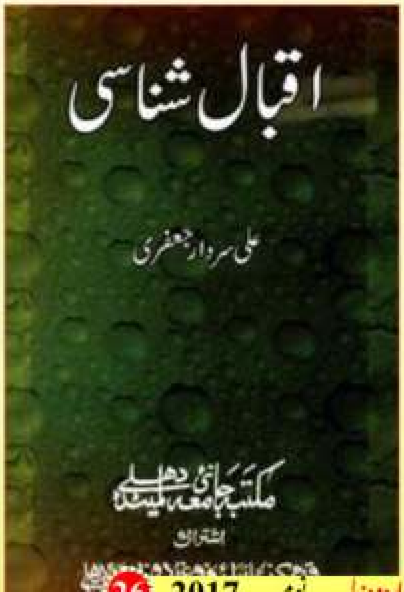


ماحول اور تناظر میں تو اس کی اہمیت اور افادیت اور سوا ہوگئی ہے:

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد ہی لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

اس نظم کا یہ بند تو ضرب المثل بن چکا ہے:

تم آؤ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں سے تازگی لے کر
پھر اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے

'پرواز' ان کا ایک ایسا مجموعہ کلام ہے جس کی نظموں میں وہ شدید طور پر مارکس وادی نظر آتے ہیں۔ اس کی کچھ نظمیں ایسی ہیں، جن کے عنوان اگر ہٹا دیے جائیں تو یہ مسلسل غزلیں کہلائی جاسکتی ہیں جیسے 'لکھنؤ کی ایک شام' 'نیا زمانہ، عہد حاضر، عورت کا احترام'، یہ اگرچہ نظم کی فارم میں کہی گئی ہیں مگر یہ داخلی اور خارجی اعتبار سے غزل ہی لگتی ہیں۔

ان نظموں میں ان کا وہ احساس پایا جاتا ہے جو انھوں نے بچپن میں جھیلا اور بھگتا تھا کیونکہ ان کا ابتدائی زمانہ بڑی غربت اور کسمپرسی میں گزرا تھا، اسی لیے یہ احساس ان کو کبھی کبھی زیادہ ہی پریشان کرتا ہے، کہ لوگ غریب کیوں ہوتے ہیں، ان کے اوپر ظلم کس وجہ سے کیے جاتے ہیں، ان کو کوئی روکتا کیوں نہیں؟ اس طرح کے اور نہ جانے کتنے احساسات تھے جن کو مہمیز اس وقت ملی جب وہ بیس برس کی عمر میں علی گڑھ گئے اور وہاں ان کی ملاقات اختر حسین رائے پوری، مجاز، جاں نثار اختر اور منٹو جیسے باغیوں سے ہوئی اور سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ وہاں ان کو ڈاکٹر محمد اشرف اور پروفیسر عبدالعلیم جیسے اشتراکی استاد مل گئے۔ سرمایہ دار لڑکیاں، مزدور لڑکیاں جیسی نظمیں بھی اشتراکی ادیبوں کی تربیت کا ثمرہ ہیں۔

اسی دوران انھوں نے کئی رومانی نظمیں بھی کہیں، جیسے 'لکھنؤ کی ایک شام، انتظار نہ کر، محبت کا فسوں اور حسن ناتمام مگر ان میں بھی انقلاب کی آہٹیں اور بغاوت کی سرسراہٹیں پائی جاتی ہیں اور 'جوانی، بغاوت، سماج اور بنگال میں تو بڑی حد تک اشتراکیت کی آمیزش اور پرچار ملتا ہے۔

بعض نظمیں عالمی تناظر میں بھی لکھی گئی ہیں جیسے 'ایشیا جاگ اٹھا' یہ ایک آزاد نظم ہے جس کا آغاز اور انجام پابند نظم جیسا ہے۔ یہ ایک رجزیہ ہے جو مرثیہ کے حوالے سے ان کے ذہن میں آئی یا اس میں پورے ایشیا کا ایک

المناک رجز ہے۔ اس نظم یا رجزیہ کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگتی کہ شاعر مادر وطن کی تاریخ اور اس کے کرب و درد سے آگاہ ہے اور پورا منظر نامہ اس کے سامنے ہے۔ مہابھارت، رامائن، اور شاہنامہ فردوسی بھی اس کے زیر نظر ہے، اسی تاریخی شعور کی بازگشت اس نظم میں پائی جاتی ہے:

یہ ایشیا کی زمین، تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
یہیں پہ انسانیت کی پہلی سحر نے رخ سے نقاب الٹی
یہیں سے اگلے یگوں کی شمعوں نے علم و حکمت کا نور پایا
اسی بلندی سے وید نے زمزمے سنائے
یہیں سے گوتم نے آدمی کو سمانتا کا سبق پڑھایا
یہیں سے مزدک نے عدل و انصاف اور محبت کے
راگ چھیڑے
ہماری تاریخ کی ہوائیں سچ کے بول سن چکی ہیں
ہمارا سورج محمد مصطفیٰ کے سر پر چمک چکا ہے''

اسی نظم کے ایک اور بند میں وہ امید جگاتے ہیں

ناگہاں شور ہوا
لو شب تار قیامت کی سحر آ پہنچی
انگلیاں جاگ اٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے
راہزن ہار گئے
راہرو جیت گئے

اسی مجموعے میں ایک اور نظم منفرد انداز کی بھی ہے جس کا عنوان 'نیند' ہے۔ یہ نظم انھوں نے جیل ہی میں اپنے بچے کی سالگرہ کے موقعے پر کہی تھی۔ اس کا آخری بند ملاحظہ ہو:

روز رات کو یوں ہی
نیند میری آنکھوں سے
بے وفائی کرتی ہے
مجھ کو چھوڑ کر تنہا
جیل سے نکلتی ہے
بمبئی کی بستی میں
میرے گھر کا دروازہ
جا کے کھٹکھٹاتی ہے
ایک ننھے بچے کی
انکھڑیوں کے بچپن میں
میٹھے میٹھے خوابوں کا

شہد گھول دیتی ہے
اک حسین پری بن کر
لوریاں سناتی ہے
پالنا ہلاتی ہے

ایشیا جاگ اٹھا، نئی دنیا کو سلام اور امن کا ستارہ ان کی ایسی نظمیں ہیں جن میں سماجی شعور اور انقلاب کا احساس شدت سے ملتا ہے، نئی نئی تشبیہوں اور استعاروں کے وسیلے سے جو وہ اپنے قاری اور سامع سے کہنا چاہتے ہیں اس کی ترسیل بھی آسانی سے ہوجاتی ہے ان میں زور خطابت بھی ہے جو ان کی شاعری کی ایک شناخت ہے، جو جوش کی اثر پذیری کا نتیجہ ہے کیونکہ جوش کو وہ اپنا آئیڈیل تصور کرتے ہیں۔

انھوں نے جو نظمیں جیل میں کہی ہیں ان میں تاثر، سوز و گداز بے پناہ ہے اور یہ دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ان تمام نظموں میں ایک خاص قسم کی رجائیت ہے، حوصلہ اور آرزو مندی ہے، جب اپنی ایک نظم 'آنسوؤں کے چراغ' میں مہاجر عورتوں سے خطاب کرتے ہیں تو ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں:

شریف بہنو!
غیور ماؤں!
تمھاری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک کے بدلے یہ
آنسوؤں کا وفور کیوں ہے
میں اپنے نغمے کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی شعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو
پھونک دیں گے

مثنوی اردو شاعری کی ایک مفید صنف ہے جسے مولانا حالی نے بھی اسے ایک کامیاب اور قوم و ملک کے لیے اچھی صنف قرار دیا ہے اور خود انھوں نے زیادہ تر اسی فارم میں نظمیں کہی ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی 'ساقی نامہ' اور کئی کامیاب نظمیں اسی ہیئت میں کہی ہیں۔

'نئی دنیا کو سلام' سے پہلے سردار جعفری بھی 'جمہور' کے نام سے ایک مثنوی کی ہیئت میں کہہ چکے تھے۔ جو شام، لبنان اور مصر وغیرہ میں سامراجیت کی گنی چنی سانسوں کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اب ہندوستان بھی انگریزوں کی غلامی کا پھندہ اپنے گلے سے جلد ہی نکالنے والا ہے۔

'نئی دنیا کو سلام' میں سردار جعفری نے تکنیک اور فارم کے نئے تجربے کیے ہیں۔ اس کا موضوع بھی نیا ہے۔ اس نظم کو تمثیل بھی کہا گیا ہے، اس کے تمام کردار بھی علامتی ہیں، اس کا اہم کردار بچہ ہے جو نئی دنیا اور آنے والے زمانے کا استعارہ ہے، اس میں جاوید اور مریم وہ اہم کردار ہیں جو میاں بیوی بھی ہیں۔ یہ سنگھرش کی

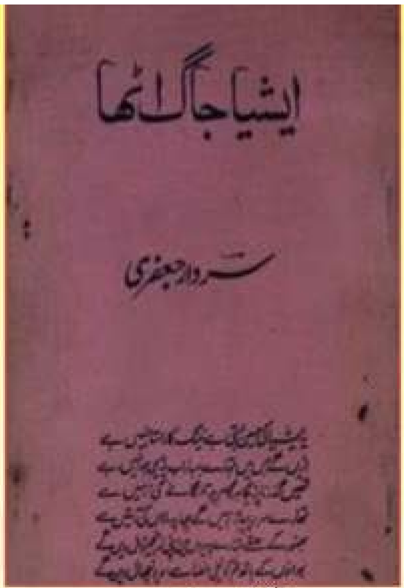


علامت ہیں اور فرنگی ظلم اور جبر کی علامت ہے۔ اس میں بڑی عمدہ قسم کی پیکر تراشی ہے جو سردار جعفری کی پوری شاعری کی ایک لازوال خوبی ہے۔

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے یہ رات سر اٹھائے ہوئے
سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مار سیاہ
سیاہ پھن میں یہ پھول مسکرائے ہوئے
سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے بل رہی ہے زمیں
یہ عقاب یہ آسماں پہ چھائے ہوئے
سیاہ وادی و صحرا سیاہ دریا میں
سیاہ دشت، یہ کھیت لہلہائے ہوئے

تمام شعرا کے یہاں موت اور زیست، ثبات یا بے ثباتی کا مسئلہ درپیش رہا ہے، سردار جعفری کے یہاں یہ وجود اور عدم کی کشمکش اور تصادم کے طور پر سامنے آیا ہے۔ یہ خود ان کا خیال ہے:

''وجود اور عدم کی کشمکش میری شاعری میں مختلف استعاروں میں آئی ہے۔''

ایک نظم میں کہتے ہیں:

سائے میں درختوں کے
بیٹھے ہوئے انسانو
اے وقت کے مہمانو
کس دیس سے آئے ہو
کس دیس کو جانا ہے
اے سوختہ سامانو
یہ وسعت میداں ہے
یا درد کا صحرا ہے
ایک دھوپ کا جنگل ہے
یا پیاس کا دریا ہے

جعفری صاحب نے خود اس ریگستان کو عدم کی اور انسان کو وجود کی علامت بتایا ہے۔ گویا کہ ان کے یہاں مثبت اور منفی دونوں طاقتیں باہم ملی ہوئی ہیں۔ وہ 'میرا سفر' میں کہتے ہیں:

پھر ایک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیئے بجھ جائیں گے
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھوجائیں گے

وہ وجود اور عدم کی کشمکش کی اور وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ موت کی حکمرانی ہے لیکن یہ واقعہ نہیں، کیونکہ اگر موت کی حکمرانی ہوتی تو یہ دنیا قبرستان ہوتی۔ آبادی بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اس لیے زندگی موت پر حاوی ہے۔''

سردار جعفری اپنے نظریات، ترقی پسندی اور اشتراکت سے عین زوال کے زمانے میں بھی مایوس نہیں ہوئے بلکہ امیدوں کے خواب دیکھتے رہے، مگر ان کو آخر میں یہ احساس بجا طور پر ہونے لگا تھا کہ اب زمانہ، ادب، شعری قدریں اور پوری ادبی کائنات بدل رہی ہے اور جدیدیت کا نیا رجحان سامنے آنے لگا ہے۔ اس کا احساس ان کی نظم 'شکستِ خواب' مجموعے 'ایک خواب اور' میں بھی پایا جاتا ہے۔ جب ان پر اور تمام ترقی پسند ادب اور ادیبوں پر اعتراضات ہونے لگے تو انھوں نے 'گفتگو' کے نام سے ایک رسالہ نکالا جس کے صفحات میں نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پہلے ہی شمارے میں شہریار کی ایک چھوٹی سی نظم بھی شائع کی۔

مطلع اور صاف ہوا۔ کمیونزم اپنی جائے پیدائش روس جہاں یہ پھلا پھولا اور پروان چڑھا تھا، رفتہ رفتہ ناکامی کے ساحل پر پہنچ گیا اور بہت سے ترقی پسند ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے اپنا لباس اور وفاداری بدل لی تو اس وقت یہ عظیم اور انتہا پسند شاعر بھی یہ اعتراف کرنے پہ مجبور ہوا:

''کمیونزم دراصل ایک تصور ہے، بہتر زندگی کا جو کچھ سوویت یونین میں تھا، وہ کمیونزم نہیں تھا بلکہ کمیونزم کی طرف جانے کا صرف ایک راستہ تھا۔''

اسی اپنے نئے احساس اور ہوا کی تبدیلی کے رخ کو بھانپتے ہوئے۔ بددلی کے ساتھ کہا:

الوداع اے سرخ پرچم سرخ پرچم الوداع
اے نشانِ عزمِ مظلومانِ عالم الوداع
اے فراتِ تشنہ کامانِ جہادِ زندگی
قلزمِ تشنہ لبی کی موجِ برہم الوداع
رزم گاہِ خیر و شر میں یاد آئے گی تری
ہم ہیں اور اب لشکرِ ابلیسِ اعظم الوداع

■

**Younus Ghazi**
Head, Dept of Urdu, Meerut College
Meerut - 250003 (UP)

# اختر الایمان کے کلام میں ماضی کا رنگ

نیہا اقبال

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو نظم نے ایک نئی سمت کی جانب اپنے سفر کا آغاز کیا جس کا اہم سبب اس دور کا منتشر سماجی اور سیاسی ماحول تھا۔ اس وقت اردو ادب میں وہ اصناف مقبول ہو رہی تھیں جن میں اس دور کی بھرپور عکاسی بآسانی کی جاسکے اسی لیے غزل جیسی صنف نقادوں کی تنقید کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ لہٰذا بیشتر شعرا نظم کی جانب متوجہ ہوئے اور اس کے دامن کو وسیع کرنے کی کامیاب کوشش کرنے لگے۔ نظم میں ہیئتی تجربے بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔ یعنی معرا نظم، آزاد نظم اور نثری نظم وجود میں آئیں۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جو نظم گو شعرا منظر عام پر آئے ان میں اختر الایمان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس زمانے میں جہاں ایک طرف ترقی پسند تحریک اپنے بام عروج پر تھی وہیں دوسری جانب حلقۂ ارباب ذوق بھی وجود میں آ چکا تھا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا ایک طے شدہ نظریہ کے تحت شاعری کر رہے تھے۔ وہیں حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ شعرا اپنی آزادہ روی کے مطابق شاعری کر رہے تھے۔ جہاں تک اختر الایمان کا تعلق ہے، وہ ان دونوں میں سے کسی تحریک سے بھی باقاعدہ طور پر وابستہ نہ تھے۔ البتہ وہ حلقۂ سے کچھ حد تک متاثر ضرور نظر آتے ہیں۔

اختر الایمان کی شاعری کی کئی جہات ہیں۔ انھوں نے نئی روش اور منفرد انداز بیان اختیار کیا۔ اس بارے میں باقر مہدی کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''اختر الایمان نے اپنی شاعری کی بنیاد عام اردو شاعروں کی طرح نہیں رکھی بلکہ بہت سے ترقی پسند اور جدید شعرا سے ہٹ کر نئی طرز فکر کی راہ اختیار کی اور ہمیں ان کی ابتدائی نظمیں پڑھتے ہوئے یہ بار بار احساس ہوتا ہے کہ شاعر صرف نئی بات کہنے کے درپے نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنی انفرادیت کی تشکیل کے لیے ایک نئے لب ولہجہ کو جنم دے رہا ہے۔''

باقر مہدی نے اپنے اس تحریر کردہ بیان میں اختر الایمان کی نئی طرز فکر اور نئے لب ولہجے کی بات کی ہے جو ترقی پسند اور جدید شعرا سے ہٹ کر ہے۔ اختر الایمان کی نظموں میں ہمیں ان کے معاصرین سے منفرد انداز بیان تو نظر آتا ہے مگر طرز فکر وہی ہے جو اس دور میں بیشتر شعراء کی تھی۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ شاعر یا ادیب کے کلام میں اپنے عہد کے واقعات و حادثات کی مکمل ترجمانی ہوتی ہے کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور زندگی کے واقعات سے ادب کا براہ راست تعلق ہے۔ اسی نسبت سے اختر الایمان کی نظموں میں بھی اپنے عہد کے سماجی وسیاسی ماحول کی ترجمانی ان کی کوئی منفرد طرز فکر نہیں ہے۔ ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ کسی شاعر کے یہاں وسیع پیمانے پر اور کسی کے یہاں وسیع تر پیمانے پر اپنے ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔ اختر الایمان کے کلام میں اپنے دور کے واقعات وحادثات کا خوبصورت استعاراتی بیان ہے۔ جدید دور کی بیشتر علامتوں کے ذریعے انھوں نے اپنی نظموں کو مزید تہہ داری بخشی ہے، جیسے ماضی کی مٹتی ہوئی اقدار، بے بسی و محرومی، اداسی و احساس بیگانگی وغیرہ کو انھوں نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ماضی ان کی بہت سی نظموں کا موضوع ہے۔ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے وہ اس کی خوبصورت منظر کشی کرتے ہیں:

رنگوں کا چشمہ سا پھوٹا ماضی کے اندھے غاروں سے
سرگوشی کے گھنگرو کھنکے گرد وپیش کی دیواروں سے
یاد کے بوجھل پردے اٹھے، کانوں میں جانی انجانی
لوچ بھری آوازیں آئیں جیسے کوئی ایک کہانی
دور پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا پھولوں سے کہتا ہو
جیسے جھرنا قطرہ قطرہ رس رس کر بہتا رہتا ہو
مدت بیتی ان باتوں کو منظر آج تلک رہتا ہے
دشتِ ہویدا کا دیوانہ تند بگولوں سے کہتا ہے
آگ ہے میرے پاؤں کے نیچے دکھ سے چور مری نس نس ہے
ایک دفعہ دیکھا ہے اس کو ایک دفعہ کی اور ہوس ہے!

(شفقی)

اختر الایمان کے ذہن وقلب میں ماضی زندہ و تابندہ ہے۔ ان کی شاعری میں یادوں کا سایہ ہے جو ان کو مسلسل اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔ ان یادوں کے بارے میں اپنے مجموعہ 'یادیں' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''یادیں تلخ اور شیریں، یادیں ماضی کی اور ماضی بعید کی، یادیں ان کی جنھیں میں نے عزیز رکھا اور ان کی جنھوں نے مجھے عزیز رکھا۔ یادیں ان مذہبی اور سیاسی عقیدوں کی جنھوں نے انسان کو پرکاہ سے زیادہ نہیں سمجھا۔ یادیں اس معاشرے سے وابستہ جہاں اخلاقی قدروں میں ٹکراؤ ہے اور اعلےٰ قدریں ایک دوسرے کی ضد ہیں یہ اور ایسی بہت سی یادیں میری زندگی ہیں اور میری زندگی میں ان اخلاقی اور معاشی قدروں کا عمل ردعمل میری شاعری ہے۔''

یہ امر فطری ہے کہ جب انسان کا ماضی اس کے حال سے زیادہ خوشگوار ہوتا ہے تو وہ ماضی کی یادوں میں کھویا رہتا ہے اور اس کو پھر سے جینے کی تمنا رکھتا ہے۔ وہ ماضی کی بہترین یادوں کو ہی یاد رکھتا ہے اور حال میں اس کے پہلو بہ پہلو چلتا ہے۔ وقت ہر پل متحرک ہے، ہر لمحہ ہم اپنے ماضی کی جانب سفر کرتے ہیں اور مستقبل میں قدم رکھتے ہیں۔ اس طرح ہمارا آج ہی کل ماضی میں تبدیل ہو جاتا ہے لہٰذا ہمارا ماضی ہمارے آج پر منحصر ہے۔ ماضی میں جو پیار، محبت، رشتوں کی اہمیت، انسان کی اہمیت، جذبات کی اہمیت، صداقت وخلوص تھا وہ حال کی اس بے رحم و بے وفا دنیا میں کھو سا گیا ہے۔ شاعر اس کا بیان اس طرح کرتا ہے:

جب حنائی انگلیوں کی جنبشیں آتی ہیں یاد
جذب کر لیتا ہوں آنکھوں میں لہو کی بوند بھی
اب مگر ماضی کی ہر شے پر اندھیرا چھا گیا
اور ہی راہوں سے گزری جا رہی ہے زندگی
ذہن میں ابھرے ہوئے ہیں چند بیجاں سے نقوش
اور ان میں نہیں ہے کوئی ربطہ باہمی

(لغزش)

اختر الایمان کی نظموں کا خاص موضوع اقدار ہے۔ موجودہ

دور میں اقدار کی شکست کی بدولت زندگی کی ہر شے میں بے بسی و مایوسی پیدا ہوگئی ہے۔اس کو شاعر نے شدت سے محسوس کیا اور اپنی نظموں میں اس کو پیش بھی کیا۔'مسجد'، 'موت'، 'پرانی فصیل'، 'قلوپطرہ، ایک لڑکا' وغیرہ ان کے ماضی پر لکھی گئی بہترین نظمیں ہیں۔ان میں اختر الایمان نے ماضی کی مٹتی ہوئی اقدار کا بیان ایک مجبور و بے بس تماشائی کی طرح کیا ہے۔ جس کی بدولت ایک کرب جنم لے لیتا ہے۔اور یہ کرب ان کو مضطرب کیے رہتا ہے۔'نیا آہنگ' کے پیش لفظ میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری شاعری کیا ہے، اگر ایک جملے میں کہنا چاہیں تو میں اسے انسان کی روح کا کرب کہوں گا... یہ کرب مختلف اوقات میں مختلف محرکات کے تحت الگ الگ لفظوں میں ظاہر ہوتا ہے۔''

اختر الایمان اپنی شاعری کو روح انسانی کے کرب سے تعبیر کرتے ہیں۔اصل میں ان کی شاعری انسان کی داخلی کیفیت کا المیہ ہے، جو اس متبدل زمانے میں بے بسی و بے حسی کا شکار ہو چکا ہے۔ پرانی تہذیب اس جدید دور میں کہیں کھو سی گئی ہے۔قدیم تہذیب کے نقش شاعر اپنے زمانے میں ڈھونڈتا ہے کہ کاش وہ تہذیب پھر سے پیدا ہو جائے:

یہاں اسرار ہیں، سرگوشیاں ہیں، بے نیازی ہے
یہاں مفلوج تر ہیں تیز تر باز و ہواؤں کے
یہاں بھٹکی ہوئی روحیں کبھی سر جوڑ لیتی ہیں
یہاں پر دفن ہیں گزری ہوئی تہذیب کے نقشے

(پرانی فصیل)

اختر الایمان کی شاعری دنیا کی بدلتی ہوئی سماجی و سیاسی اقدار کی غماز ہے۔ بلکہ یہ کہنے میں کیا تامل کیا جائے کہ انھوں نے اپنے ماحول کی بہترین عکاسی کی ہے، جس کی بدولت وہ معاصر شعرا میں ممتاز ہیں۔مٹتی ہوئی سماجی اقدار پر ان کی عمدہ نظمیں مسجد، موت، پرانی فصیل وغیرہ ہیں جو ان کے پہلے مجموعہ کلام 'گرداب' میں شامل ہیں۔نظم مسجد میں انھوں نے مسجد کو علامتی طور پر پیش کیا ہے۔ مسجد کی شکستہ حالت دیکھ کر انھیں دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس ہوتا ہے انھوں نے خود مسجد کو مٹتی ہوئی تہذیب کا المیہ قرار دیا ہے۔ مسجد کی شکستہ حالی اصل میں اس دور کی شکستہ حالی اور شکستہ تہذیب کی علامت ہے۔ پوری نظم میں علامتی رنگ و آہنگ غالب ہے۔

اختر الایمان کے یہاں ماضی کی باز آفرینی مختلف اشکال میں ہمارے سامنے آتی ہے۔کہیں علامتی لب و لہجہ میں اور کہیں طنزیہ اسلوب میں۔

یہی سبب ہے کہ ماضی کی مٹتی ہوئی اقدار کو پیش کرتے ہوئے اختر الایمان کی نظموں میں طنز کا عنصر غالب آ جاتا ہے۔انھوں نے اپنے دور کے تضادات اور تلخی کو محسوس کیا ہے۔لوگ اپنی زمین اور اپنوں کو چھوڑ کر بڑے شہروں کی پر فریب دنیا کی جانب سفر کر رہے ہیں۔ اختر الایمان بڑے شہروں کی بے ثباتی کے ساتھ چھوٹے شہروں اور گاؤں کی معصوم و سادہ زندگی کو یاد کرتے ہیں۔ان بڑے شہروں میں انسان کی تنہائی، اجنبی ماحول اور افراتفری کو طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔نظم 'عروس البلاد' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

وسیع شہر میں اک چیخ کیا سنائی دے
بسوں کے شور میں ریلوں کی گڑگڑاہٹ میں
چہل پہل میں بھڑوں جیسی بھنبھناہٹ میں
کسی کو پکڑو سر راہ مار دو چاہے
کسی عفیفہ کی عصمت اتار دو چاہے!
وسیع شہر میں اک چیخ کیا سنائی دے!

(عروس البلاد)

اس افراتفری کے عالم میں جہاں انسان محض اپنے بارے میں سوچ رہا ہے۔اس کی تہذیب، اس کے اپنے اس سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ مگر جب کبھی اس کو ان کے ساتھ زندگی کے خوشگوار لمحوں کی یاد آتی ہے تو وہ ان لوگوں کو اس بے رحم دنیا میں ڈھونڈنے نکلتا ہے، جہاں صرف دھند کا سایہ رہ گیا ہے۔نظم 'یادیں' میں شاعر اپنوں سے دوری کا کرب اس طرح بیان کرتا ہے:

ساری ہے بے ربط کہانی دھندلے دھندلے ہیں اوراق
کہاں ہیں وہ سب جن سے جب تھی پل بھر کی دوری بھی شاق

(یادیں)

اختر الایمان کی شاعری میں ماضی اور حال کا تصادم نظر آتا ہے۔ وہ ماضی کے خوشگوار لمحوں کو حال پر فوقیت دیتے ہیں۔ ماضی کی یادوں کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے اپنی نظموں میں گزرے ہوئے وقت کا تماشا دکھایا ہے۔جگہ جگہ شاعر نے ماضی کے گزر جانے کا المیہ اور مستقبل میں ماضی کی اقدار کو پھر سے قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔'نشاۃ ثانیہ' میں وہ ماضی کے خوبصورت لمحوں کا آئندہ نہ آنے کا افسوس کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ بھی اور بہت سی نظموں میں شاعر نے اپنی اسی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ ماضی کی خوشگوار راہیں وہ حال کی تاریکی میں اس طرح ڈھونڈتے نظر آتے ہیں:

تاریکی میں ڈھونڈتا ہوں راہیں
سورج کو ترس گئیں نگاہیں!

(واپسی)

اختر الایمان کا ماضی ان کی زندگی اور شاعری میں اس درجہ حاوی ہے کہ اگر وہ خود بھی اس کی زنجیروں کو توڑنا چاہے تو نہیں توڑ سکتے۔ وزیر آغا لکھتے ہیں:

''گرداب کا شاعر ایک ایسے سنگم پر ایستادہ ہے، جہاں ایک طرف ماضی کی عمارت گر رہی ہے اور دوسری طرف مستقبل کے اندھیرے سے غیب کی آوازیں اسے مسلسل سنائی دے رہی ہیں۔ خود شاعر ماضی کی تباہی کا منظر دیکھ چکا ہے اور اس ماضی اور ماضی کے ساتھ وابستہ تصورات کے لیے اس کے پاس بجز ایک جلتے ہوئے آنسو کے اور کچھ نہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود ماضی کی زنجیریں اس سے بری طرح لپٹی ہوئی ہیں۔''

حال میں جہاں ماضی کی اقدار ایک ایک کر کے پامال ہو رہی ہیں۔ ایسے ماحول میں شاعر کو اس کا قوی امکان ہے کہ آئندہ زمانے میں محبت جیسا پاک و پاکیزہ جذبہ بھی اس بے مروت دنیا میں کہیں کھو جائے گا۔اس بات کو شاعر نے سہل ممتنع میں بہ حسن و خوبی پیش کیا ہے:

اور یہ میری محبت بھی تجھے جو ہے عزیز
کل یہ ماضی کے گھنے بوجھ میں دب جائے گی

(موت)

وقت کے مسلسل بہاؤ کی بدولت دنیا کے ساتھ ساتھ ہر چیز بدل رہی ہے۔ یہاں تک کہ اب محبت کا بھی کوئی اعتبار نہیں کہ مستقبل میں رہے یا نہ رہے۔تنہائی اور بے بسی کا یہ عالم ہے کہ انسان قوت احساس بھی کھوتا جا رہا ہے۔غم و نشاط میں اس کو کوئی فرق نظر نہیں آتا، نہ اب اس کو کسی چیز کی خوشی ہے نہ کسی کا غم۔اختر الایمان اس کا بیان کس شاندار انداز میں کرتے ہیں:

ساقی و بادہ بھی نہیں، بام و لب جو بھی نہیں
تم سے کہنا تھا کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں

(جمود)

اختر الایمان کو جذبات، احساسات اور کیفیات کے ختم ہونے کا بے حد افسوس ہے۔ انھوں نے اپنی پوری شاعری میں اسی درد و غم کو استعاراتی اور علامتی انداز میں پیش کیا۔ گزرتے ہوئے وقت نے شاعر سے اس کے خوشگوار ماضی کے ساتھ اس کا سب کچھ چھین لیا ہے اب وہ تنہائی و بے بسی اور ماضی کی یادوں کے سہارے اپنی باقی زندگی گزار رہا ہے۔ الغرض اختر الایمان کی شاعری کا مختصر جائزہ لینے کے بعد ان کی شاعری میں ماضی کا رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔

■

**Neha Iqbal**
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

# منفرد ردیفوں کا شاعر جون ایلیا

منتجاب شبلی

اُردو شعریات میں قوافی اور ردیفوں کے ذریعہ خوبصورتی و بانکپن پیدا کرنے والے متعدد، مقبول و ممتاز شعراء پہلے بھی تھے اور آج بھی بہت ہیں۔ پرانے زمانے کے شعراء میں بھی اس سلسلے میں حسن و اسلوب کی کمی نہیں رہی۔ غزل کی ابتدا سے اب تک یہ سلسلہ بدستور جاری و ساری ہے۔ اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں کہ زبان و بیان کی روانی و بیباکی، محاوراتی طرز بیان، استعارے، علامتیں، فلسفیانہ سوچ و فکر اور دیگر ان گنت خوبصورتیوں کے ساتھ ہی ردیفوں اور قوافی کے حسن سے اشعار کے بنیادی تخیلات میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور مضامین ان سب کی مدد سے جیسے سیدھے دل میں پیوست ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں موجودہ دور کے کتنے ہی شعرا قابل ذکر اور قابل صد ستائش ہیں جیسے فیض احمد فیض، احمد فراز، ناصر کاظمی، ندا فاضلی، راحت اندوری وغیرہ اور بھی کتنے ہی نام......

اُردو شاعری میں اُسلوب کی تقلید اور پیروی کرنے والے شعراء اور انھیں پسند کرنے والے شائقین بھی ہر دور میں موجود ہوتے ہیں، لیکن جون ایلیا کی اپنی منفرد و مخصوص شخصیت ہے۔ ان کی کتنی ہی غزلوں میں بالخصوص ردیفوں کا حسن تو بس دیکھتے، سمجھتے اور محسوس کرتے ہی بنتا ہے اور ان کی طرز اپنی الگ ہی شناخت بھی کراتی ہے، اور بعد میں بھی وہ ردیفیں ذہن میں رس گھولتی رہتی ہیں۔ ایسے اکثر اشعار تو سنتے یا پڑھتے ہی جیسے فوراً یادداشت سے لپٹ کر جبراً حفظ ہو جاتے ہیں۔ علاقائی، وطنی الفاظ اور مخصوص محاوروں والی زبان اشعار میں عجیب و غریب آویزش سے روشناس کراتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی یہ خوبصورتی بس پڑھتے، سنتے جایئے اور مسحور کن کیفیات سے دوچار ہوتے رہیے۔

جون ایلیا کے یہاں رومانیت، جمالیاتی و تخلیقی انداز، فرقت کے درد و سوز اور ایک بے ساختہ دیوانہ پن، یہ سب کچھ اپنے الگ ہی رنگوں میں ہیں۔ کہیں ایسا لگتا ہے جیسے رومانیت ایک سرسری سا جذبہ ہے۔ کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ رومانیت ابدیت میں تبدیل ہو کر سارے کائناتی جذبوں پر چھا گئی ہے۔ اسی طرح فرقت کے موضوعات بھی ہیں، ایسا لگتا ہے کہ فرقت تمام انسانی احساسات کی روح میں اتر گئی ہے اور اس سے جو دیوانگی پیدا ہوئی ہے وہی زندگی کا حاصل و مقصود ہے۔ مگر باوجود اس شدت کے ہر جگہ دور کہیں روشنی کی ایک کرن بھی پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ رومانیت، وصلت و فرقت اور دیوانگی سے لبریز چند مطلعے ملاحظہ فرمائیں......

بہت دل کو کشادہ کر لیا کیا؟
زمانہ بھر سے وعدہ کر لیا کیا؟

---

نظر حیران، دل ویران، میرا جی نہیں لگتا
بچھڑ کے تم سے میری جان، میرا جی نہیں لگتا

---

اگر چاہو تو آنا کچھ نہیں دشوار، آنکلو
شروعِ شب کی محفل ہے، میری سرکار آنکلو

---

ہم ترا ہجر منانے کے لیے نکلے ہیں
شہر میں آگ لگانے کے لیے نکلے ہیں

---

عذابِ ہجر بڑھا لوں، اگر اجازت ہو
اک اور زخم میں کھا لوں، اگر اجازت ہو

---

دل جو ہے آگ لگا دوں اس کو
اور پھر خود ہی ہوا دوں اس کو

جون ایلیا کی شاعری میں وطن کی یاد ایسی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ہے کہ سنیے یا پڑھیے بہر حال رقت طاری ہونے کی کیفیت سے گزرنا ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو پہاڑی علاقوں میں جیسے بارش نہ ہونے پر بھی بادل جسم کو گیلا کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں، ویسے ہی جون ایلیا کے یہ اشعار آنکھوں میں نمی ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ ہجرت کا درد بھی ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ہے اور ہر لمحہ دل کو چھوتا ہوا گزرتا ہے۔ اس ضمن میں کچھ مطلعے حاضر ہیں:

زندانیانِ شام و سحر خیریت سے ہیں
ہر لمحہ جی رہے ہیں، مگر خیریت سے ہیں

---

بد دلی میں بے قراری کو قرار آیا تو کیا
پاپیادہ ہو کے کوئی شہ سوار آیا تو کیا

---

طلسمی سرزمیں ہے، جانے کیا ہو؟
یہاں کچھ بھی نہیں ہے، جانے کیا ہو؟

---

نویدِ عشرتِ فردا، کسے مبارک ہو؟
خیالِ انجمن آرا، کسے مبارک ہو؟

---

آپ اپنا غبار تھے ہم تو
یاد تھے، یادگار تھے ہم تو

بے کیفی، بے یقینی اور احتجاج کی فلسفیانہ طرز نگارش کے مدنظر جون ایلیا کی شعریات جس اذیت اور جن ذہنی تکالیف کے تجربات سے بھی گزرتی ہو یا پھر شاعری کے لیے ان کی اپنے وجود کی سپردگی اور ہر قسم کے انسانی احساسات میں پوری طرح اُتر کر وہ اپنے فلسفیانہ اندازِ فکر کو ظاہر کرتے ہوں، یہ سب قاری اور سامع کو عجیب سے جہانوں کی سیر کراتے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ ان کی اپنی ہی سیدھے دل میں اتر جانے والی زبان و طرز ہیں، ملاحظہ کریں چند اشعار:

ہے فصیلیں اُٹھا رہا مجھ میں
جانے یہ کون آ رہا مجھ میں

---

میں بے حسابِ سود و زیاں، کیا کروں بھلا
کوئی یقین ہے نہ گماں، کیا کروں بھلا

---

عیش اُمید ہی سے خطرہ ہے
دل کو اب دل دہی سے خطرہ ہے

جون ایلیا نے نہ صرف یہ کہ رباعیات سے ملتے جلتے اوزان میں بھی بڑی تعداد میں غزلیں کہیں، بلکہ وہ طرح طرح کی نت نئی ردیفوں کے استعمال اس میں بھی ویسی ہی چابک دستی سے عمل میں لاتے رہے ہیں۔ ردیفوں کے حسن نے یہاں بھی اسی طرح مزہ دیا۔ ساتھ ساتھ جمالی، فنی کیفیات نے بھی وہی جوہر دکھائے جیسے کہ عام غزلوں میں۔ رومانی فضاؤں اور فراق کی کیفیات سے مرصع کچھ مطلعے حاضر ہیں:

خاموشیِ بام بڑھ رہی ہے
تاریکیِ شام بڑھ رہی ہے

---

وحشت کو سوا نہ کیجیو اب
تم ذکرِ وفا نہ کیجیو اب

---

یادوں کا حساب رکھ رہا ہوں میں
سینے میں عذاب رکھ رہا ہوں میں

فلسفیانہ سوچ اور اس کا اظہار خیال وہ بھی ردیفوں کے انفرادی حسن کے ساتھ فکر کی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ اس مزاج کے چند مطلعے پیش ہیں:

اپنے سب یار کام کر رہے ہیں
اور ہم ہیں کہ نام کر رہے ہیں

---

خود میں ہی گزر کے تھک گیا ہوں
میں کام نہ کر کے تھک گیا ہوں

جون ایلیا نے مشہور زمانہ ایرانی شاعرہ قرۃالعین طاہرہ (فاطمہ زرّیں تاج) کے حسین وجمیل کلام کے انداز میں بھی طبع آزمائی کی جو ان کی شعریات میں علیحدہ ہی ایک نمونہ بن گئی۔ وہ غزل الگ ہی اپنا حسن رکھتی ہے۔ اس غزل کے دو اشعار، مطلع ومقطع حاضر ہیں:

بخشش نرگسِ صنم، دور بہ دور، دم بہ دم
مینا بہ مینا، مے بہ مے، جام بہ جام، جم بہ جم
ورثہ عجب شبیہ کا، جون تمھیں دیا گیا
آہ بہ آہ، اُف بہ اُف، غزدہ بہ غزدہ، غم بہ غم

عشق وطن اور وطن سے دُوری کا درد اُن کی شاعری میں، ان کے شہر کی ندیوں، درگاہوں، محلوں اور گلیوں تک کے ناموں کی یاد کی صورت میں بھی ملتے ہیں، ملاحظہ کریں:

جاؤ قرار بے دلاں! شام بخیر، شب بخیر
صحن ہوا دھواں دھواں، شام بخیر، شب بخیر

---

ہم جان و دل سے یار تھے، ہم کون تھے، ہم کون تھے
ہم میں سے کچھ دلدار تھے، ہم کون تھے، ہم کون تھے

---

جو بھی ہے یاں ہے یادگار، آخرِ شب ہے دوستاں
ہے شبِ آخرِ بہار، آخرِ شب ہے دوستاں

---

مت پوچھو کتنا غمگین ہوں، گنگا جی اور جمنا جی
میں جو تھا اب میں وہ نہیں ہوں، گنگا جی اور جمنا جی

---

ہم رہے پر نہیں رہے آباد
یاد کے گھر نہیں رہے آباد

فلسفیانہ اظہار خیال، تلمیحات اور بعض افعالی کیفیات و علاقائی مثالیں جون ایلیا کی شاعری میں دُور تک اور دیر تک سوچنے پر مجبور کرتی ہیں:

شمشیر میری، میری سپر کس کے پاس ہے؟
دو میرا خود، پر مرا سر، کس کے پاس ہے؟

منظر سا تھا کوئی کہ نظر اس میں گم ہوئی
سمجھو کہ خواب تھا کہ سحر اس میں گم ہوئی

جون ایلیا کی غزلوں میں بہت سی ردیفیں تو منفرد ہونے کے ساتھ ہی اتنی عجائبات میں سے ہیں کہ وہ اُن کی بالکل ہی الگ پہچان ومقام کے لیے سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اسلوب، بیان، تخیل کی بلندی، زبان کا فطری محاوراتی استعمال، بے ساختگی اور کتنی ہی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایسی بے مثال ردیفیں، یہ سب قاری کو ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جو اسے جون ایلیا کا گرویدہ اور ان کی غزلوں کا عاشق بناتی ہیں۔

اظہار عشق کا الگ اپنا انداز، اور مایوسیوں سے مسلسل گزرتا عشق، امتیازی حیثیت کا حامل ہونے کے ساتھ ہی وقت کی نزاکتوں کے بارے میں بھی سوچنے پر مجبور کرتا چلا جاتا ہے:

یہ غم کیا دل کی عادت ہے، نہیں تو
کسی سے کچھ شکایت ہے، نہیں تو

---

نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم

---

گاہے گاہے بس اب یہی ہو کیا؟
تم سے مل کر بہت خوشی ہو کیا؟

---

کسی سے عہد و پیماں کر نہ رہیو
تو اس بستی میں رہیو، پر نہ رہیو

---

کیا یقیں اور کیا گماں، چپ رہ
شام کا وقت ہے میاں، چپ رہ

---

اپنے گھر کی یاد اور اس کے چھوٹ جانے کا غم اور اُس پر پردیس میں بیگانے پن کا احساس، اپنوں کی چھوٹی سے چھوٹی خوبیاں، کمیاں، بے کیفیوں کے احساسات ان کے یہاں خوب تر ہیں:

ہم تو جیسے یہاں کے تھے ہی نہیں
بے اماں تھے، اماں کے تھے ہی نہیں

---

دل نے کیا ہے قصدِ سفر، گھر سمیٹ لو
جانا ہے اس دیار سے، منظر سمیٹ لو

---

یہاں تابِ سخن ہے، کچھ نہ کہیو
بڑا بے گانہ پن ہے، کچھ نہ کہیو

زندگی جینے کا اپنا فلسفہ اور دماغ میں سرایت کرتا ہوا دکھوں کا انبار اور شکایات کے ذکر بھی اچھوتے انداز بیان کے مظہر ہیں:

جانے یہاں ہوں، میں یا میں
اپنا گماں ہوں، میں یا میں

---

ہر نفس پیچ و تاب ہے، تا حال
ہوس انقلاب ہے، تا حال

---

میرے مطلوب و مدعا! تو جا
تجھ سے مطلب نہیں ہے جا، تو جا

---

بخشش ہوا یقین، گماں بے لباس ہے
ہے آگ جامہ زیب، دھواں بے لباس ہے

Mustajab Ahmad Siddiqui
105, Begum Sarai Khurd
Amroha - 244221 (UP)
Mob.: 9897103834
E-mail: shelle.mustajab@gmail.com

نایاب حسن

# پروین شاکر

## اردو شاعری کی ماہِ تمام

حیران آنکھوں، شبنمی رخساروں، کشادہ پیشانی اور اداس مسکراہٹ والی ایک لڑکی نے محض 25 سال کی عمر میں اردو شاعری کی دنیا میں اس شکوہ کے ساتھ قدم رکھا کہ معاصر اہلِ ادب و شعر کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ اردو ادب میں شعرا کی فہرست تو طویل تر ہے، مگر شاعرات اور وہ بھی ایسی شاعرات، جن کے لب و لہجے نے، انداز و اسلوب نے، مضامینِ شعر نے، خیالات کی ندرت و جدت نے اور البیلے طرزِ اظہار و ادا نے ایک دنیا کو مسحور کر دیا ہو، کم از کم اردو ادب میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ پروین شاکر (24 رنومبر 1952 - 26 ردسمبر 1996) سے پہلے اردو میں چند نامور خاتون شاعرات تھیں اور خود ان کے دور میں بھی ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض وغیرہ اعلیٰ پایے کی شاعرات موجود تھیں، جن کی قدر پروین شاکر بھی دل سے کرتی تھیں، مگر اس کے باوجود اردو شاعری کو جو لہجہ پروین نے دیا، وہ سب سے اچھوتا، انوکھا اور دل چسپ تھا، انھوں نے صنفِ نازک کے مسائل، مشکلات، خانگی الجھنوں، انفرادی مشکلوں، معاشرتی جکڑ بندیوں، حسن و عشق کی خاردار راہوں کی آبلہ پائیوں کا ذکر اپنی شاعری میں بڑے منفرد انداز میں کیا۔ پروین شاکر بلا کی ذہین ہونے کے ساتھ اعلیٰ علمی لیاقتوں سے بھی آراستہ تھیں، انگریزی زبان و ادب میں جامعہ کراچی، ہارورڈ یونیورسٹی اور ٹرینٹی کالج (امریکہ) سے انھوں نے اعلیٰ علمی ڈگریاں حاصل کی تھیں، شعور و آگہی ان کا نمایاں ترین وصف تھا، وہ آگہی، جس نے ان پر شہرِ ذات کے دروازے کھولے اور جس کے بعد ان کی خلاقانہ قوت و صلاحیت نے اردو شاعری کو مالا مال کر دیا۔ پروین شاکر نے پہلی بار صنفِ نازک کے متذکرہ بالا مسائل کو آشکار کرنے کے لیے 'ضمیرِ متکلم' کا استعمال کیا، جس نے ان کے سامعین و قارئین کی توجہات کو اپنی جانب مبذول کرنے میں غیر معمولی مقناطیسی کردار ادا کیا، جن مسائل کا انھوں نے اپنی شاعری میں ذکر کیا ہے، ہوسکتا ہے، وہ سارے مسائل خود انھیں درپیش نہ ہوئے ہوں، مگر ان کی شاعری کو پڑھنے، مطالعہ کرنے اور سمجھنے سے یہ اندازہ بخوبی طور پر لگایا جاسکتا ہے کہ اجتماعی طور پر صنفِ نازک کا ہر زمانے میں اُن مسائل سے سامنا رہا ہے، جن کا ذکر مختلف پیرایوں میں پروین شاکر نے اپنی شاعری میں کیا ہے؛ شاید یہی وجہ ہے کہ جوں ہی اردو شاعری میں اُن کا ظہور ہوا، انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، ان کے کلام کا پہلا مجموعہ 'خوشبو' 1976 میں منظرِ عام پر آیا اور صرف چھ ماہ کے اندر اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ پھر یکے بعد دیگرے 'صد برگ' (1980)، 'خود کلامی' (1980)، 'انکار' (1990) ان کی زندگی میں شائع ہوئے اور سب کو بے پناہ مقبولیت، پذیرائی اور تحسین کی نگاہ سے دیکھا گیا، پروین شاکر کا پانچواں شعری مجموعہ ان کی جواں مرگی کے سانحے کے دوسرے سال 'کفِ آئینہ' کے نام سے ان کی بڑی بہن نسرین شاکر کی نگرانی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا، اپنی وفات سے قبل وہ اسے ترتیب دے رہی تھیں اور 'کفِ آئینہ' خود انھی کا تجویز کردہ نام ہے، 'ماہِ تمام' کے نام سے ان کی مکمل کلیات دستیاب ہے۔ پروین شاکر کی شاعرانہ عظمت و بلند قامتی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں پہلی ہی کتاب 'خوشبو' پر 'آدم جی ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا، جبکہ 1990 میں پاکستان کا اعلیٰ شہری اعزاز 'تمغۂ حسن کارکردگی' بھی انھیں تفویض کیا گیا، 1982ء میں جب وہ سی ایس ایس کے امتحان میں بیٹھیں، تو اردو کے پرچے میں ایک سوال خود ان کی شاعری کے تعلق سے تھا، ان کی زندگی میں ہی ان کی شاعری کے انگلش، جاپانی و سنسکرت زبانوں میں ترجمے شروع ہو چکے تھے۔ پروین شاکر کو متعدد ناقدین نے بیسویں صدی کی مشہور ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد (5 رجنوری 1935 - 13 رفروری 1967) سے تشبیہ دی ہے اور واقعتاً دونوں کی خانگی و معاشرتی زندگی سے لے کر، شاعری کی تھیم اور جواں مرگی تک میں عجیب و غریب مماثلت پائی جاتی ہے، پروین شاکر کو فروغ سے ذہنی وابستگی بھی تھی، انھوں نے فروغ کے لیے ایک نظم بھی لکھی تھی، جو ان کے شعری مجموعہ 'خود کلامی' میں شامل ہے:

مصاحبِ شاہ سے کہو کہ
فقیہِ اعظم بھی تصدیق کر گئے ہیں
کہ فصل پھر سے گناہ گاروں کی پک گئی ہے
حضور کی جنبشِ نظر کے
تمام جلاد منتظر ہیں
کہ کون سی حد جناب جاری کریں....

پروین شاکر کی ممتاز شاعرانہ خصوصیت جذبے کی صداقت ہے، وہ اپنے خیال و فکر کو پوری وضاحت، دیانت اور شفافیت کے ساتھ بیان کرتی ہیں، چاہے معاملاتِ عشق ہوں یا کاروبارِ معاشرت و سیاست، کسی بھی پہلو پر جب وہ گویا ہوتی ہیں، تو کسی قسم کا ابہام، اغلاق اور اُلجھاؤ نہیں چھوڑتیں، لطافت، شوخی، خیال کا جمال اور احساس کی ناز کی بھی نسوانیت کے تمام تر حسن و دل کشی کے ساتھ پروین شاکر کے یہاں جلوہ گر ہیں، بارش، شبنم، نور، روشنی،

رنگ، دھوپ، جنگل، آندھی، ہوا، گلاب، تتلی، سانپ وغیرہ مظاہرِ فطرت وہ استعارے ہیں، جو پروین کی شاعری کو کردار فراہم کرتے اور جن میں تفکر و تدبر سے ان کی شاعری کا تانا بانا تیار ہوتا ہے، خواب اور نیند بھی پروین کی شاعری میں استعمال ہونے والے اہم استعارے ہیں۔ تشبیہ، استعارہ و کنایہ شاعری اور خاص طور سے غزلیہ شاعری کی جان ہوتی ہے اور یہ وصف پروین شاکر کی شاعری میں کمال کی حد تک پایا جاتا ہے، ذیل کے کچھ اشعار سے پروین شاکر کی مذکورہ شعری خصوصیات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

تری ہنسی میں نئے موسموں کی خوشبو تھی
نوید ہو کہ بدن سے پرانے خواب اترے
سپردگی کا مجسم سوال بن کے کھلوں
مثال قطرۂ شبنم ترا جواب اترے

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

جانے کب تک تری تصویر نگاہوں میں رہی
ہوگئی رات ترے عکس کو تکتے تکتے
میں نے پھر تیرے تصور کے کسی لمحے میں
تیری تصویر پہ لب رکھ دیے آہستہ سے

چہرہ میرا تھا، نگاہیں اس کی
خامشی میں بھی وہ باتیں اس کی
شوخ لمحوں کا پتہ دینے لگیں
تیز ہوتی ہوئی سانسیں اس کی
ایسے موسم بھی گزارے ہم نے
صبحیں جب اپنی تھیں، شامیں اس کی
دور رہ کر بھی سدا رہتی ہیں
مجھ کو تھامے ہوئے بانہیں اس کی

کھلی آنکھوں میں سپنا جاگتا ہے
وہ سویا ہے کہ کچھ کچھ جاگتا ہے
تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن مور بن کر ناچتا ہے
میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

تجھ کو کھو کر بھی رہوں خلوتِ جاں میں تیری
جیت پائی ہے محبت نے عجب مات کے ساتھ

**پروین شاکر کی شاعری میں رومانوی خیالات کی بھی فراوانی ہے، جو خاص طور سے نوجوان نسل کے لیے باعث کشش ہے۔حسن و عشق کے لمحۂ وصال کی تعبیروترجمانی میں انھوں نے کمال ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے اور سرشاری، وابستگی و سپردگی کی کیفیات کو بڑے لطیف و حسین پیرایے میں بیان کیاہے۔ خاص طور سے 'خوشبو' کی غزلوں کا زیادہ تر حصہ اسی قسم کے خیالات کا اظہار ہے۔**

پروین شاکر نے محبوب کی بے رخی، بے توجہی، عدمِ التفات یا بے وفائی کو بھی اپنی شاعری میں جگہ جگہ بیان کیا ہے، مگر یہاں بھی وہ طرزِ ادا میں دیگر شعرا سے ممتاز ہیں، اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ان کا لہجہ شاکیانہ تو ہے ہی، مگر ملتجیانہ اور پرامید بھی ہے، وہ محبوب کی بے رخی سے دل گیر ہوتی ہیں، مگر در پردہ اس کا اظہار بھی کرتی ہیں کہ وہ کسی نہ کسی صورت ان کی طرف متوجہ ہو:

اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی

اسی کوچے میں کئی اس کے شناسا بھی تو ہیں
وہ کسی اور سے ملنے کے بہانے آئے
اب نہ پوچھوں گی میں کھوئے ہوئے خوابوں کا پتہ
وہ اگر آئے، تو کچھ بھی نہ بتانے آئے

کوئی تو ہو، جو مرے تن کو روشنی بھیجے
کسی کا پیار ہوا میرے نام لائی ہو

اپنی تنہائی مرے نام پہ آباد کرے
کون ہوگا جو مجھے اس کی طرح یاد کرے
اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے

ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی، اس نے کمال کر دیا!

ہمیں خبر ہے ہوا کا مزاج رکھتے ہو
مگر یہ کیا کہ ذرا دیر کو رکے بھی نہیں!

تو بدلتا ہے تو بے ساختہ میری آنکھیں
اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں الجھ جاتی ہیں

پروین شاکر کی شاعری میں رومانوی خیالات کی بھی فراوانی ہے، جو خاص طور سے نوجوان نسل کے لیے باعثِ کشش ہے۔ حسن وعشق کے لمحۂ وصال کی تعبیر وترجمانی میں انھوں نے کمال ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے اور سرشاری، وابستگی و سپردگی کی کیفیات کو بڑے لطیف وحسین پیرایے میں بیان کیا ہے، خاص طور سے 'خوشبو' کی غزلوں کا زیادہ تر حصہ اسی قسم کے خیالات کا اظہار ہے، ایک غزل:

سبز مدھم روشنی میں سرخ آنچل کی دھنک
سرد کمرے میں مچلتی گرم سانسوں کی مہک
بازوؤں کے سخت حلقے میں کوئی نازک بدن
سلوٹیں ملبوس پر، آنچل بھی کچھ ڈھلکا ہوا
گرمیِ رخسار سے دہکی ہوئی ٹھنڈی ہوا
نرم زلفوں سے ملائم انگلیوں کی چھیڑ چھاڑ
سرخ ہونٹوں پر شرارت کے کسی لمحے کا عکس
ریشمیں بانہوں میں چوڑی کی کبھی مدھم دھنک
شرمگیں لہجوں میں دھیرے سے کبھی چاہت کی بات
دو دلوں کی دھڑکنوں میں گونجتی تھی اک صدا
کانپتے ہونٹوں پہ تھی اللہ سے صرف اک دعا
کاش یہ لمحے ٹھہر جائیں، ٹھہر جائیں ذرا!

معاملاتِ حسن وعشق کے علاوہ معاشرت و سیاست میں پائی جانے والی ناانصافی و نابرابری، استحصالی سسٹم، چہار سمت بکھرے ہوئے خوف، زیر دستوں کے تئیں زبردستوں کے آمرانہ و ظالمانہ رویے کے خلاف کھلا احتجاج بھی پروین شاکر کی شاعری میں متعدد مقامات پر دیکھنے کو ملتا ہے:

میرا سر حاضر ہے، لیکن میرا منصف دیکھ لے
کر رہا ہے میری فردِ جرم کو تحریر کون
میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری پھر دے گیا تشہیر کون

وہ خوف ہے کہ سرِ شام گھر سے چلتے وقت
گلی کا دور تک جائزہ ضروری ہے

لہو جمنے سے پہلے خوں بہا دے
یہاں انصاف سے قاتل بڑا ہے

کسی بستی میں ہوگی سچ کی حرمت
ہمارے شہر میں باطل بڑا ہے

انھوں نے معاشرے کے دبے کچلے، مزدور و کامگار طبقے کے مختلف کرداروں پر بھی شاعری کی ہے اور ان لوگوں کی طرف حمایت کا ہاتھ بڑھایا ہے، جن کی شب و روز کی جفاکشی سے دوسرے لوگ تو خوب فیضیاب ہوتے ہیں، مگر وہ بے چارے ساری زندگی تہی مایہ و بے سروساماں ہی رہتے ہیں۔ 'انکار' کی نثری نظموں کا بیشتر حصہ ایسے ہی کرداروں کو منسوب ہے۔

پروین شاکر کا ایک اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک مخصوص شعری صنف 'نثری نظم' کو نئی بلندیوں اور مقبولیت کی نئی منزلوں تک پہنچایا، ان کے دور میں اور ان سے پہلے بھی کئی بڑے شاعروں نے اس صنف کو اختیار کیا تھا، مگر پروین شاکر کی بدولت اس صنفِ شاعری کا جغرافیہ مزید وسیع و عریض ہوگیا۔

پروین شاکر کی دلکش و سحر طراز شاعری نے اردو کے لفظیاتی ذخیرے اور تعبیراتی و اسلوبی نظام کو بھی نئی اور خوش رنگ، لطیف و حسین تعبیروں سے آشنا کیا، انھوں نے اپنے خیال کو الفاظ و اظہار کا جامہ پہنانے کے لیے لفظوں کی ایسی تراکیب نو تراشیں، جن سے اردو ادب کو ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت پیرایہ ہائے اظہار ملے، انھوں نے اپنی پوری شاعری میں جو نئی اور انوکھی تعبیریں استعمال کیں، ان کی صحیح تعداد کئی سو ہو سکتی ہے۔ مگر اپنی رسائی کے بقدر راقم ان کی شاعری کا مطالعہ کر کے جنھیں اکٹھا کر سکا ہے، وہ یہ ہیں: شیشہ رُو، بنفشی ہاتھ، دریچۂ گل، موجۂ گل، سایۂ گل، پایۂ گل، چشمِ گل، قامتِ شعر، سروبدن، قریۂ جاں، خانہ بجاں، شجرِ جاں، تجلۂ جاں، نقدِ جاں، جاں گزارنا، رخشِ جاں، پیشِ جاں، عرصۂ جاں، آتشِ جاں، کلبۂ جاں، طائرِ جاں، شیشۂ جاں، خیمۂ جاں، تہہ خانۂ جاں، عکسِ خوشبو، حرفِ سادہ، موج ہوا، ذہین نگاہ، دستِ صبا، پہاڑ دن، اُجاڑ رات، زبان رنگ، لمسِ مرگ، گلابی دھوپ، سانپ راتیں، اُلوہی لمحے، قبائے خاک، دل زدہ، پھول بدن، شہرِ ناسپاس، اُجلی خواہش، سحاب لہجہ، خزاں زاد، نایافت شہریت، خواب آسا سکوت، بے چہرہ وجود، قرطاس بدن، ہوا برد ہو جانا، شبنم بدست، شب گزیدہ، خوش بدن، درکم باز، زردائی ہوئی رُت، شہرِ سخن فروشگاں، مادرزاد منافق، شہرِ صد آئینہ، شبنم رنگ پیشانی، گلابی لذت، لمسِ گریزاں، نرم فامی، لالہ فامی، سبک نام، چھاؤں اُگانا، موسم بے اختیاری، چہرہ اُگانا، دست بستہ شہر، بے فیض بدن، بھوکی آنکھ، جلتا فقرہ، شب زاد، موجۂ خواب، سہم ناکی، عنکبوتی ہنر، کوفۂ عشق، سورج خور، شاخ گریہ، خواب یکتائی، لمحۂ جمال، حرفِ اندمال، ناخن وصال، گونگے سناٹے، خوش چشم، دل شب زاد، تہی زاد، جمشید کلاہی، خنجر گل فام، شہرِ رسن بستہ، کلاہِ زخم زدہ، سفاک لمحے، نشاطِ حسن بازی، کنارۂ روح، شہادت گہہِ وفا، حرفِ سبز، صاعقہ مزاج، بدن گیر غراہٹ، ستارہ ساز ہاتھ، زمزمہ آثار، ہوا نژاد، کفِ گلاب، آئینہ نژاد، فصیلِ شوق، آئینے کی آنکھ، دیدۂ بے خواب، اصل شناس، افراطِ خواہش، تفریطِ وقت، درہم خودداری، دینارِ عزتِ نفس، منسوخ شدہ قدریں، آدابِ مسافرداری، صلیب خوں آشام، صیغۂ عقد، ہوا مزاج، ستارہ سوار، قیمتِ شگفت، نیم بیدار منظر، بیضوی موڑ، شاخ بدن، خوش لمس ہوا، زندگی کمانا، تیر شناسائی، سنسان زندگی، ہجومِ ہم خوابگاں، بنجر ذہنوں میں پھول اگانا، ناخنِ ملال، تہہ خانۂ غم، دیوارِ خواہش، بدن کے موسم، ذہن فگن مسئلہ، فصیلِ جسم، آوارگانِ شب، طائرِ امید، آسماں جناب، سوچ سے خوشبو بنانا، یرقانی سوچ، گرگ زاد، غم خواری، دل کی آبروریزی، ہمہ تن چشم، بساطِ زیست، زمیں زاد، نشتر بدست شہر، فرشِ فلک، عہدِ مہرباں، دہلیزِ سماعت، فضائے حرف و صوت، توازن گر طبیعت، خانۂ آئینہ ساماں، گلابی خوشبو، حدِ بصارت، جنتِ خاشاک نہاد، عظمتِ یک لحظہ، وقت کی ہم گامی، نصابِ تملّق، کوئے جفا، عذابِ دربدری، سفید پوشی دیوار و در، خرقۂ غم، پوششِ رسوائی، چادرِ دل داری، حصارِ دعا، جگنوی زمیں، کفِ آسماں، قبائے شجر، دیارِ غزال چشماں، شب پیمائی، موسمِ بے چہرگی، آئینہ بردوش، عکسِ بے منظر، پرندِ خوش خبر، مداراتِ الم، سبزۂ بیگانہ، ریشمیں فرصت، شعلہ رُو، فرش خوابی، ہوائے شہرِ ستم، قبائے سخن، مجاورِ سنِ ادب، طائرِ خوں بستہ، بوسیدہ بیوی، جنسی درجۂ حرارت، محبت کی گلینگل موت، نوخیز خوشبو، منصبِ دلبری، نرم روشنی، وعدہ گہہِ ہستی، صبح چہرہ، آواز کا چہرہ چھونا، جنوں خیز خوشبو، موسم عنبر فشاں۔

پروین شاکر کا آبائی وطن ہندوستان کے شہر دربھنگہ سے متصل ایک بستی ''چندن پٹی'' تھا، 1947 میں ان کے والد کراچی ہجرت کر گئے تھے اور پروین شاکر کی پیدائش و نشو و نما وہیں ہوئی، مگر اس کے باوجود انھیں ہندوستانیت سے گہری وابستگی تھی اور اسی نسبت سے یہاں کی ہندی زبان اور ہندوستانی تہذیب سے بھی وہ آگاہ تھیں، انھوں نے اپنی شاعری میں بعض خالص ہندی الفاظ کو جس چابک دستی و ہنرمندی سے برتا اور استعمال کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندی زبان و ادب پر بھی دستگاہ رکھتی تھیں، ان کے یہاں دیوتا، مدھر، سنگیت، سے، سنسار، پریم، روپ، من موہن، سکھی، سُر، انگ، رُت، سنگم، دیس، بَن، جنم، سندیس، ساگر، آدرش، گمبھیر، راج کماری، بھور، سنگ، ساجن، گوری، مکھ، نین، مُسکانا، سہاگن، سندرتا، جگ، پروَیا، پجاری، سادھو، منتر، بن باس لینا، ریکھا، وِیر، مہکار، سیندور، گجرا، ہردے، چتا، داسی، درشن، امرت، شریر، کول سر، پوتر، چرن، بھوَن، بھیتر، سنجوگ، پتی، آکاش، چندرما، آتما، چھایا، راجا، بدھائی، جل، بنتی، سینتا، سانجھ سویرے، سمبندھ، سمان، راج رتھ، آرتی اتارنا، آدھت، آشا، پُرش، بھاگ، اپمان، بلیدان، سمپورن، شبد، ادھیکار، دان کرنا جیسے الفاظ جگہ جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے کئی غزلوں میں مذہبی علامتوں مثلاً دیوالی، مندر، گنگا، کرشن، گھنشیام جیسے کرداروں کو بھی مضامینِ غزل کے طور پر استعمال کیا ہے۔

الغرض پروین شاکر اردو کی ایک مکمل، ہمہ جہت اور کامیاب ترین شاعرہ ہیں، جن کی شاعری دلوں کے تار چھیڑتی اور احساساتِ دروں کی سچی ترجمانی کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کو ایک عرصہ گزر گیا، مگر ہنوز ان کا نام دنیائے ادب و شعر میں روشن و تابناک ہے اور آئندہ بھی رہے گا (ان شاء اللہ)، خود پروین کو بھی اس کا ادراک ہوگا، سو انھوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ:

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

■

**Nayab Hasan**
A/22, Seema Apartment
St No.7, Batla House
New Delhi - 1100255
nh912823@gmail.com

# آواز کا جادوگر خاموش ہو گیا

غضنفر

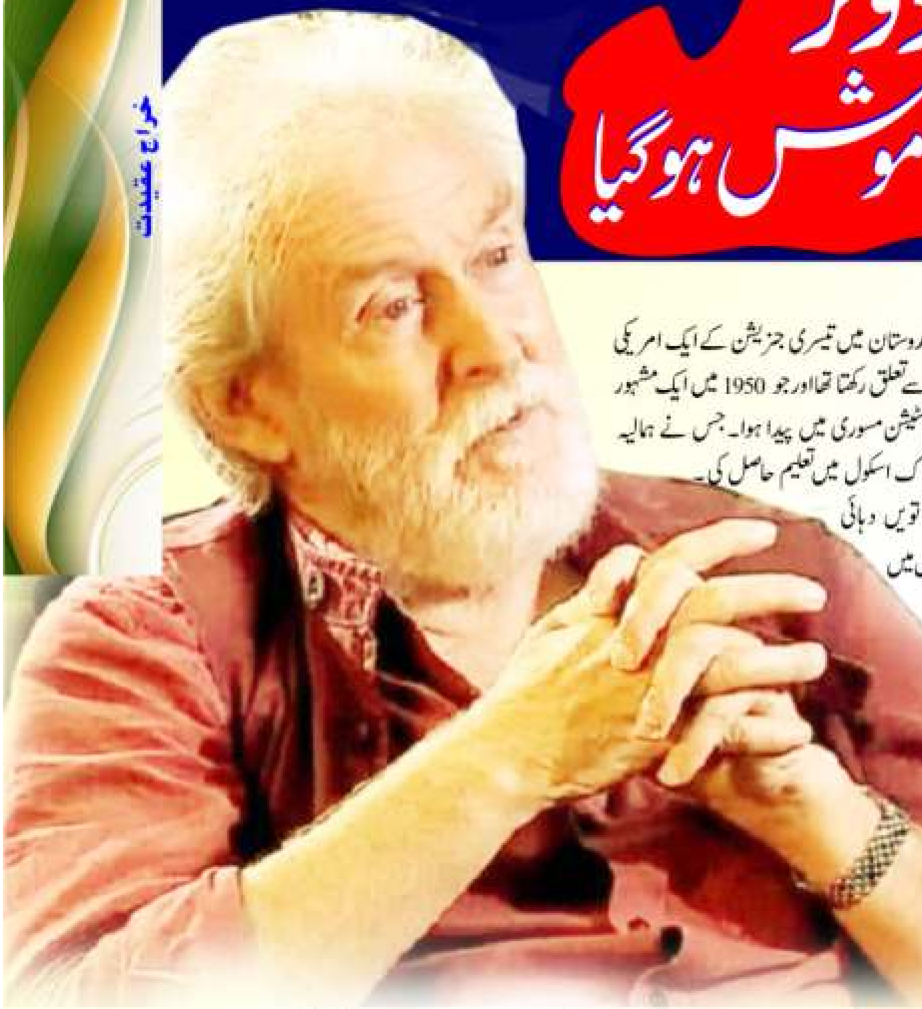

زبان شیریں کے شیدائیوں کی فہرست میں پریم چند، کرشن چندر، گیان چند، گوپی چند، حکم چند، بال مکند عرش ملسیانی، مچھندہ بانی، آنند نرائن ملا، رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری، دیا شنکر نسیم، برج نرائن چکبست، منشی نول کشور، مالک رام، رام بابو سکسینہ، لالہ جگت نرائن، جگن ناتھ آزاد، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، بلراج مین را، بلراج کومل، بلراج ورما، سریندر پرکاش، پرکاش پنڈت، دیویندر اسر، دویندر ستیارتھی، پریم مٹل، گلزار، گلزار دہلوی، آنند بخشی وغیرہ کے ساتھ ساتھ ایک ایسا شخص بھی شامل ہے جس نے اردو میں کوئی شعر تو نہیں کہا اور نہ ہی کوئی افسانہ لکھا اور جس کا نام بھی ایسا ہے کہ جو اردو زبان سے کسی طرح سے بھی لگا نہیں کھاتا اور جس میں ایک ایسی آواز بھی شامل ہے جو ایک بار نہیں بلکہ دو دو بار ذہن کے پردے پر ٹائیں کرتی ہے اور جو اردو کے مزاج کی رو سے غیر فصیح گردانی جاتی ہے مگر دو دو 'ٹ' والا یہ نام اردو زبان سے ایسا جڑ گیا ہے کہ جب بھی فصیح، سلیس اور شیریں اردو بولنے والوں کا ذکر آتا ہے تو یہ نام بھی ضرور سماعت میں گونج پڑتا ہے اور ذہن و دل میں دیر تک اپنے لب و لہجے کا جادو جگائے رکھتا ہے۔ یہ اس شخص کا نام ہے جس کے بال، گال، کھال، خصال سبھی سفید ہیں۔ ایسے سفید جن سے روشنی پھوٹتی ہے۔ ایسی روشنی جو ادراک و شعور کو روشن کرتی ہے۔ جن سے شفافیت چھلکتی ہے۔ ایسی شفافیت جو دیکھنے والے کے دل و دماغ میں کیف و سرور بھر دیتی ہے۔ جی ہاں آپ نے صحیح سمجھا وہ نام آلٹر ہی ہے۔ وہی ٹام آلٹر جس کے 'ٹام' میں بھی 'ٹ' اور 'آلٹر' میں بھی 'ٹ' موجود ہے۔ جس کے ولایتی رنگ میں بھی ہندوستانی رنگ کی چمک دمک موجود تھی۔ جس کے دل، دماغ، روح، سنسکار سب میں شیام رنگ رچا بسا تھا۔ جس کی صلاحیتوں سے ملاحتیں جھانکا کرتی تھیں۔ جو فلم ایکٹر، ڈائریکٹر، اسپورٹ جرنلسٹ، ٹیلی ویژن اور اسٹیج آرٹسٹ کے ساتھ ساتھ کمپیئر اور پریزنٹر کی حیثیت سے بھی کافی مشہور تھا۔

جو ہندوستان میں تیسری جنریشن کے ایک امریکی خانوادے سے تعلق رکھتا تھا اور جو 1950 میں ایک مشہور تاریخی ہل اسٹیشن مسوری میں پیدا ہوا۔ جس نے ہمالیہ کے ووڈ اسٹاک اسکول میں تعلیم حاصل کی۔

جس نے ساتویں دہائی کے بالکل اوائل میں ہندوستان آنے سے قبل امریکہ کے Yale یونیورسٹی میں بھی تھوڑی مدت کے لیے پڑھائی کی۔ جو ان تین خوش نصیب لوگوں (بنجامن گیلانی اور پھونسک لدافی) میں سے ایک تھا جو پورے شمالی ہندوستان میں آٹھ سو سے اوپر درخواست دہندگان میں سے پونے کے مشہور فلم اور ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ (1972 کے لیے) منتخب کیے گئے تھے۔ جس نے دو سال بعد اداکاری میں طلائی تمغہ کے ساتھ گریجویشن کی ڈگری مکمل کی تھی۔

جس کی پہلی ریلیز فلم 1976 میں رامانند ساگر کی چرس تھی جس میں اس نے ایک سی آئی ڈی آفیسر اور دھرمندر بوس کا کردار ادا کیا تھا۔ جس نے مشہور ہدایت کار ستیہ جیت رے کی فلم شطرنج کے کھلاڑی (1977)، شیام بینیگل کی فلم جنون (1979) منوج کمار کی فلم کرانتی (1981) اور راج کپور کی فلم رام تیری گنگا میلی (1985) میں بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ جس نے تمبر اور اسی کی دہائیوں میں وی شانتا رام، رشی کیش مکھرجی، منموہن دیسائی، سبھاش گھئی، چیتن آنند، دیو آنند جیسے عہد ساز فلم سازوں کی فلموں میں یادگار اداکاری کر کے فلمی دنیا میں اپنے نام کا ڈنکا بجا دیا۔ جس نے مشہور ہدایت کار مہیش بھٹ کی ہدایت میں فلمی دنیا کو تین ایسی فلمیں دیں جن میں عاشقی جنون تک پہنچی اور جنون میں عقل کو گمراہ ہونا پڑا۔

جس نے نہ صرف یادگار اداکاری کی بلکہ بعض فلموں اور سیریلوں میں زبردست ہدایت کاری کا بھی مظاہرہ کیا۔ جس کا ایک سیریل تو ٹی وی چینل پر مسلسل پانچ سالوں تک چلتا رہا اور جس میں ایک سیدھا سادا صاف شفاف اور شریف انسان ایک لمبی مدت تک ایک خطرناک ڈاکو کا کردار نبھاتا رہا۔

جس نے نہ صرف ہندی فلموں میں کامیاب اداکاری کی بلکہ مقامی بولیوں بنگلہ، آسامی، تیلگو، تمل، کمایوں کے علاوہ انگریزی فلموں میں بھی اپنی صلاحیت کا

بھر پور مظاہرہ کیا اور دیسی سانچوں میں ڈھل کر یہ دکھا دیا کہ انسان کسی بھی رنگ روپ کا کیوں نہ ہو اس کا خمیر ایک ہے اور شاید ضمیر بھی ایک۔ اپنی محنت، جدوجہد اور تخلیقی صلاحیتوں سے یہ احساس بھی دلا دیا کہ بدیسی چہرے پر دیسی رنگ اس وقت تک نہیں چڑھتا جب تک کہ دل و دماغ دوسرے رنگ میں پوری طرح رنگ نہیں جاتے اور دوسرے رنگ میں انسان اسی وقت پوری طرح رنگ پاتا ہے جب وہ اپنے رنگ کی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ جس کو سنیما کے میدان میں اس کی بہترین کارکردگی کے لیے حکومت کی جانب سے پدم شری جیسا پروقار ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ جس نے اسپورٹس جرنلسٹ کی حیثیت سے بھی اپنا زمانے سے لوہا منوایا اور مشہور عالمی کریکیٹر سچن تیندولکر کا اس وقت ٹی وی انٹرویو کیا جب انھیں بھارت کے لیے پہلی بار کھیلنا تھا مگر اردو والے ان سب کارناموں سے بڑھ کر اس 'ٹ' والے ٹام آلٹر کو اس لیے زیادہ جانتے ہیں کہ اس نے انڈیا وِنس فریڈم، میں مولانا ابوالکلام آزاد، غالب میں مرزا غالب اور لال قلعہ کے آخری مشاعرے میں بہادر شاہ ظفر کا ایسا کردار نبھایا کہ ان بڑی ہستیوں کو ماضی سے نکال کر زمانۂ حال میں لاکر کھڑا کر دیا۔ ان ڈراموں میں ایسی کردارنگاری کی اور اردو لب و لہجے کا وہ کمال دکھایا کہ 1857 کے غدر والے غالب اور بہادر شاہ ظفر موجودہ صدی میں دکھائی دینے لگے۔ ابوالکلام آزاد پھر سے زندہ ہو گئے۔ ان کی تقریریں پھر سے سماعتوں میں گونجنے لگیں۔ وہ اردو زبان

> **اپنی مادری زبان کی عادتیں ایسی راسخ اور مضبوط ہوتی ہیں کہ دوسری زبان کی آوازوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتیں اور اگر دوسری زبانیں قریب آنے کی کوشش بھی کرتی ہیں تو انہیں مار مار کر ان کی لسانی ٹانگیں توڑ دیتی ہیں مگر ٹام آلٹر نے اردو کے لیے اپنے لسانی مزاج میں وہ جگہ بنائی کہ اردو ان کی مادری زبان انگریزی پر بھی غالب آگئی۔**

کا مخصوص کردار بن گیا اور اردو رنگ و آہنگ اس قدر رچ بس گیا کہ اب اس کی پہچان اردو زبان کے حوالے سے ہونے لگی۔ غالب، بہادر شاہ ظفر اور ابوالکلام آزاد اپنے حرکات و سکنات کے ساتھ سماعتوں اور صوت و صدا کے ساتھ بصارتوں اور سماعتوں میں نظر آنے لگے۔ جس نے اپنی شیریں زبانی اور سحرالبیانی سے ان فنکاروں کو اس

طرح پیش کیا کہ یہ مخصوص ادبی محفلوں سے نکل کر عوام کے گھروں تک پہنچ گئے۔

اردو زبان و ادب کی تہذیبی فضا کے بجائے کسی اور تہذیبی و لسانی ماحول میں پلنے بڑھنے والا شخص اردو تہذیب و ثقافت میں اس قدر رچ گھل مل گیا اور اپنے آپ کو اردو زبان کے رنگ و آہنگ سے اس طرح ہم آہنگ کر لیا کہ وہ ٹام آلٹر کی جگہ سننے والوں کو کوئی زرغام آذر یا شجاع خاور محسوس ہونے لگا۔

اس کے لبوں سے جب اردو کے الفاظ نکلتے ہیں اور جس لب و لہجے میں جس زیر و بم کے ساتھ اردو کی صدائیں گونجتی ہیں تو لگتا ہے کہ واقعی اس کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ بولتے وقت یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ اردو کوئی انگریز بول رہا ہے بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ نواب واجد علی شاہ لکھنوی کے دربار کا کوئی نقیب یا مرزا غالب کے زمانے کا کوئی شاعر یا ادیب بول رہا ہو۔

ٹام آلٹر صرف شعر ہی اچھا نہیں پڑھتے بلکہ نثر خوانی بھی بہت عمدہ کرتے ہیں۔ وہ جس انداز سے بولتے ہیں وہ ایسی دلکش، پُرکشش اور پُرلطف ہوتا ہے کہ ہزاروں کا مجمع دل تھام کر سنتا ہے اور ان کے ایک ایک جملے پر اپنا سر دُھنتا ہے۔

اپنی مادری زبان کی عادتیں ایسی راسخ اور مضبوط ہوتی ہیں کہ دوسری زبان کی آوازوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتیں اور اگر دوسری زبانیں قریب آنے کی کوشش بھی کرتی ہیں تو انھیں مار مار کر ان کی لسانی ٹانگیں توڑ دیتی ہیں مگر ٹام آلٹر نے اردو کے لیے اپنے لسانی مزاج میں وہ جگہ بنائی کہ اردو ان کی مادری زبان انگریزی پر بھی غالب آ گئی۔

ٹام آلٹر نے اپنی اردو کو یوں ہی اتنا پُرکشش نہیں بنایا بلکہ اس کے لیے انھوں نے کافی محنت کی۔ باقاعدہ اردو سیکھی۔ علامہ جالب مظہری سہرامی کی شاگردی اختیار کی۔ لب و لہجے پر خاص توجہ صرف کی۔ اردو کے اشعار یاد کیے اور انھیں ادا کرنے کی مشق کی۔ ڈائیلاگ ڈلیوری کے وقت اردو آوازوں اور اردو زبان کے لب و لہجے پر نہ صرف یہ کہ موسیقی کی طرح ریاضت کی بلکہ اپنی لسانی عادتوں سے جنگ بھی کی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے اپنی شخصیت میں ایسی حلاوت اور لطافت پیدا کی کہ بدیسی ساز سے دیسی سُر تال نکلنے لگے۔ طبیعت کی روانی نے صوت و صدا میں وہ فصاحت پیدا کی کہ لفظ منہ سے نکلتے ہی سماعتوں کے لیے سُر بن گیا۔ اس سُر نے سننے والوں کو اتنا مسحور کیا کہ انھیں یاد نہیں رہا کہ ٹام آلٹر نے دوسرے بڑے بڑے کام بھی کیے ہیں۔

ٹام آلٹر کا اردو میں یہ وہ کارنامہ ہے جو کبھی دلوں سے محو نہیں ہوگا اور یہ ان کو دنیائے اردو میں اسی طرح زندہ رکھے گا جس طرح میر، غالب اور اقبال کے کلام نے ان کو زندہ رکھا۔ زندگی اگر وفا کرتی تو ٹام آلٹر غالب، بہادر شاہ ظفر اور ابوالکلام آزاد کی طرح بہت سے دوسرے شاعروں اور ادیبوں کو بھی اپنی کردارنگاری اور لسانی ہنرمندی سے دنیا کے سامنے لانے میں کامیاب ہوتے اور بہت سے دوسرے ادیب بھی ادبی محفلوں سے نکل کر عوام کے گھروں اور دلوں میں پہنچ جاتے۔ مگر افسوس کہ زندگی نے وفا نہیں کی اور 1950 میں اتراکھنڈ کے مشہور تاریخی شہر مسوری میں پیدا ہونے، امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور ممبئی کی فلمی دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے اور ایک عالم کو اپنی آواز سے لطف و انبساط پہنچانے والا ٹام آلٹر ایک دن کینسر کا شکار ہوا اور 67 کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

آواز کے اس جادوگر کی خاموشی پر آج ساری دنیا ماتم کناں ہے اور دعا گو ہے۔ وہ آج اس دنیا میں جسمانی طور پر نہیں ہے لیکن ذہنوں میں چلتا پھرتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔

■

**Ghazanfar Ali**
Director, APDUMT
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

# عزیز ربانی عزیز

تابش مہدی

مولانا عزیز ربانی عزیز (1925-1984) ہمارے عہد کے اُن شعرا، ادبا، دانش وروں اور قومی وملی خدمت گزاروں میں تھے، جنھوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ کسی بھی صلہ وستایش سے بے نیاز ہوکر اپنی اہمیت تسلیم کرائی اور دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش تین دہائیاں گزر جانے کے باوجود ہندستان خصوصاً شیراز ہند جون پور کے ارباب علم ودانش کے ایک بڑے طبقے کے ذہن ودل میں وہ اب بھی موجود ہیں۔

مولانا عزیز ربانی عزیز جون پور کے اس خانوادے کے لائق و فائق چشم و چراغ تھے، جس کی، علم و ادب، مذہب وتصوف، تہذیب وثقافت اور سیاست ودانش وری کی تاریخ میں اپنی ایک شناخت رہی ہے۔ اُن کے والد محترم مولانا حافظ ابوالفیض محمد یعقوب صابری چشتی المتخلص بہ انیق جون پوری اپنے عہد کے نام ور علما و واعظین میں تھے۔ تصوف سے انھیں خاص شغف تھا۔ درجنوں تشنگان رشد و اصلاح ان کے دامنِ فیض سے وابستہ تھے۔ سخن وری میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی سے انھیں شرف تلمذ حاصل تھا۔ اس عہد کے بڑے بڑے شعرا اُن کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ انھوں نے متعدد علمی وادبی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کا مجموعۂ سخن 'مینائے حجاز' ارباب ذوق کے لیے سرمۂ چشم بصیرت کی حیثیت رکھتا ہے۔ نعت وقصائد اور تاریخ گوئی میں انھیں خصوصی شہرت حاصل تھی۔ ان کے برادر بزرگ فخر مشرق علامہ شفیق جون پوری اپنے فنی کمالات اور استاذانہ مہارت کے لیے پوری اردو دنیا میں متعارف ہیں۔ آج بھی ہند و پاک میں اُن کے متعدد باکمال تلامذہ موجود ہیں۔ انھیں نثر ونظم دونوں پر عبور حاصل تھا۔ کم وبیش 61 کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں تقریباً دو درجن شعری مجموعے شامل ہیں۔ سفینہ، فانوس، خرمن، خرمنِ عشق، شانہ، نے، طوبیٰ، صبحِ سعادت اور روداد چمن کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ متعدد اخبارات و رسائل سے بھی وابستہ رہے، خود بھی کئی رسائل نکالے۔ دوسرے بھائی مولانا نظام الدین صدیقی اپنی ملی غیرت اور سیاسی بصیرت کے لیے پورے ہندستان میں شہرت رکھتے تھے۔ کانگریس کے بنیادی رہ نماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ کانگریس کے اسٹیج سے جب وہ تقریر کرتے تھے تو پورا مجمع ہمہ تن گوش ہوجاتا تھا۔ ایک شخص بھی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ تیسرے بھائی مولانا ظفر الحسن ظفر صدیقی جون پوری ایک جید عالم دین بھی تھے اور قادر الکلام شاعر بھی۔ ہندستان کے متعدد عربی مدارس میں انھوں نے تدریسی خدمات انجام دیں اور شعرا وادبا کی شعری وادبی تربیت بھی فرمائی۔ شاعری میں انھیں اپنے والد مولانا انیق جون پوری، بڑے بھائی علامہ شفیق جون پوری اور مولانا محوی صدیقی لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ خاندان کے اسی علمی، ادبی اور روحانی ماحول نے حضرت عزیز ربانی عزیز کو متاثر کیا اور پوری زندگی اسی کے زیر اثر رہے کسی اور طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

عزیز ربانی عزیز 1925 میں جون پور کے تاریخی محلے قاضی ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد محترم مولانا انیق جون پوریؒ اور اپنی والدۂ محترمہ سیدہ رابعہ خاتون بنت مولانا حافظ سید امام الدین لاہوریؒ سے حاصل کی۔ اس کے بعد اس عہد کے مشہور مدرسے مدرسہ حنفیہ جون پور میں داخلہ لیا۔ وہاں عربی وفارسی کے اعلیٰ درجات کی کتابیں پڑھنے کے بعد مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ وہاں سے 1945 میں سند فراغت حاصل کی۔ 1949 میں الہ آباد بورڈ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور جامعہ اردو علی گڑھ کے تمام امتحانات بھی پاس کیے۔ شعروسخن سے فطری دل چسپی تھی۔ طالب علمی کے ابتدائی دور میں ہی مشق سخن شروع کردی تھی۔ اپنے والد محترم حضرت انیق جون پوری اور برادر بزرگ علامہ شفیق جون پوری کی خصوصی اصلاح وتربیت نے انھیں بہت جلد فارغ الاصلاح کردیا۔ اردو وفارسی دونوں زبانوں میں مشق سخن کی۔ 1948 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا تو مشہور ناقد وسخن ور مولانا ماہرالقادری نے اُسے بے حد سراہا اور ان اشعار کو خصوصی اہمیت دی:

غیروں کے سہارے کہیں تعمیر ہوئی ہے
اے ننگ عمل یہ ہوس خام کہاں تک

ابھی تو خشک لبی کا گلہ ہے رندوں کو
بجھے گی پیاس تو روئیں گے تشنگی کے لیے

واضح رہے کہ یہ مجموعہ اس وقت شائع ہوا تھا، جب عزیز ربانی عزیز کی عمر اکیس یا بائیس برس کی تھی۔ اس عمر میں ماہرالقادری جیسے نباض سخن سے داد حاصل کرلینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

عزیز ربانی عزیز ایک شاعر نغز گو بھی تھے اور جادو بیان خطیب ومقرر بھی اور شائستہ رقم ادیب وصحافی بھی۔ لیکن شاعری سے انھیں خصوصی دل چسپی تھی۔ شاعری میں نظم وغزل دونوں پر انھیں کامل دست رس حاصل تھی۔ فخر مشرق علامہ شفیق جون پوری کی خصوصی تربیت اور ان کی شب وروز کی معیت ورفاقت نے ان کی فطری شعری وادبی صلاحیت کو چار چاند لگا دیا تھا۔

جناب عزیز کی شاعری کو عام سطح پر رکھ کر دیکھنا یا اس کی تعیینِ قدر کرنا ان کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی۔ ان کی شعری وادبی سوچ عام مذاق سے بہت آگے تھی۔ جب ہم ان کی غزلیں پڑھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ غزل کا عام مفہوم 'یا معشوق گفتن' کا شائبہ تک ان کے ہاں نہیں ملتا۔ وہ زندگی کے پیامی تھے۔ زندگی کا یہ پیام ان کی نظموں اور غزلوں دونوں میں ملتا ہے۔ ان کے کلام میں سوز وساز، رنگینی الفاظ اور شکوہِ مضامین کی بہتات ہے۔ ان کے کلام کو پڑھ کر قاری میں جوش وولولہ بھی پیدا ہوتا ہے اور سوچ اور فکر کی بلندی بھی پروان چڑھتی ہے۔ جب ہم ان کی نظمیں پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملت کا عظیم وحساس قائد ورہ نما ہم سے مخاطب ہے اور ہمیں اپنے ماضی کو بھی یاد دلا رہا ہے اور مستقبل سے بھی باخبر کرایا ہے۔ ہمیں پستیوں سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کے لیے ساعی وکوشاں ہے۔ انھوں نے اقبال کے فلسفۂ انسانیت سے بھی اثر لیا ہے اور فکرِ

مشرقیت سے بھی۔ انھوں نے ایک جگہ خود بھی کہا ہے:

مے خانۂ اقبال کا مے نوش ہوں اے دوست!
مجھ کو ادب نو سے کوئی کام نہیں ہے

یہ چیز انھیں اپنے گہرے مطالعے اور اپنے مربی حضرت شفیق جون پوری سے حاصل ہوئی ہے۔ ان کے اس قطعے میں ان کا پورا فکری منظر نامہ آ جاتا ہے:

رہبر فکر ہیں میرے لیے اقبال و شفیق
میرے افکار ہیں عالی، مری نظریں ہیں عمیق
عہد حاضر کو میں پرنور بنا دوں نہ اگر
تم مجھے آج سے کہنا نہ عزیز ابن انیق

عزیز ربانی عزیز کی شاعری ایک علم بردار انقلاب کی شاعری ہے۔ لیکن وہ اس انقلاب کے علم بردار نہیں تھے، جو مشرقی تہذیب وثقافت اور اس کے معیار انسانیت کے منافی ہو۔ ان کے تصور انقلاب میں وہ حیرت فکر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی، جو انسانوں خصوصاً بنت حوا کو اسلامی حیا و شرافت اور مشرقی تہذیب وثقافت سے یکسر بے نیاز کر دے۔ وہ خالص اسلامی فکر اور مشرقی تہذیب وتمدن والے انقلاب کے حامی و پاس دار تھے۔ ان کا یہ شعر ان کی اسی سوچ اور اسی انداز نظر کا مظہر ہے:

مریم کی شان عصمتِ بلقیس چاہیے
نسوانیت کا حسن یہ آزادیاں نہیں

عزیز ربانی عزیز قومی، ملی، مذہبی، سماجی، بلکہ غرض کہ ہر محاذ پر خامہ بردار رہتے تھے۔ جب اور جس محاذ پر بھی ضرورت پڑتی تھی اپنی تقریر و تحریر اور نثر و نظم کے ذریعے سے اس کا مقابلہ کرتے تھے۔ جس صنف کو بھی کام میں لاتے تھے، خوب لاتے تھے۔ 'جنگ کے محاذ پر جانے والے بھارتی نوجوانوں کے نام' اپنی ایک نظم کا آغاز یوں کیا ہے:

ہنستے ہوے جاتے ہو ہنساتے ہوئے آنا
ہر گام پہ اک دھوم مچاتے ہوئے آنا
رکھنا نہ فقط آتش و آہن پہ بھروسا
تہذیب کی طاقت بھی دکھاتے ہوئے آنا
وہ امن کے خرمن کو اگر آگ لگائیں
تم آگ کو گلزار بناتے ہوئے آنا
تلوار اٹھانے کا وہ کرتے ہیں ارادہ
یہ شوق برا ہے یہ جتاتے ہوئے آنا
پھر سرحد گلشن پہ نہ آئیں کبھی رہزن
اک آہنی دیوار اٹھاتے ہوئے آنا

نظم ختم کرتے ہوئے کہتے ہیں: اگر اب تو نے

بھارت پہ حریصانہ نظر ڈالی
دکھا دیں گے تجھے اپنے جوانوں کی صف آرائی

ایک جگہ انھوں نے ملت کی زبوں حالی اور غیروں کی خوش حالی و سرخ روئی کو دیکھ کر یوں اشک فشانی کی ہے:

جو بیاباں تھا وہ ہے آج گلستاں کی طرح
ہر گلستاں ہے مگر آج بیاباں کی طرح
صورت و نام تو اب بھی ہے مسلماں کی طرح
کب ہے کردار مگر بوذرؓ و سلمانؓ کی طرح
ہے وہی جہل نظر اور وہی ذہن غریب
تجھے جینا بھی میسر نہیں انساں کی طرح

ارباب اقتدار کی غفلت و بے راہ روی پر انھیں متوجہ کرتے ہوے کہا:

جبکہ صیاد چمن کا نگراں ہوتا ہے
پھر تو گلشن میں قیامت کا سماں ہوتا ہے
چیر دیتے ہیں وہی بڑھ کے پہاڑوں کا جگر
جن کے دل میں شرر سوز نہاں ہوتا ہے
پھر وہ مغرب کے لٹیروں نے کمندیں پھینکیں
پھر کوئی خود ہی گرفتار زیاں ہوتا ہے
بین الاقوامی ترقی کا سہارا آخر
ایک دن درپے آزار جہاں ہوتا ہے
نظم جمہور میں ہیں سب کے برابر کے حقوق
بات کہنے کی ہے، لیکن یہ کہاں ہوتا ہے
یہ غم ملک، غم قوم کہ ہے غل جس کا
آج ایوانِ حکومت میں کہاں ہوتا ہے

جناب عزیز ربانی عزیز کی ایک نظم 'نوائے مومن' ہے۔ جب ہم اُسے پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اقبال اور ان کے ہم عصر شفیق جون پوری کو پڑھ رہے ہیں۔ وہی قومی و ملی درد و سوز اور وہی آفاقی فکر کا رنگ و آہنگ ایک ایک شعر میں ملتا ہے، جو ان بزرگوں کی شناخت رہی ہے۔ ہو بہو اسلوب بھی وہی اور زبان و بیان کا رکھ رکھاؤ بھی وہی۔ ملاحظہ کریں:

مرا درسِ صداقت ذمہ دار امن و راحت ہے
اخوت ہے، محبت ہے، عدالت ہے، شجاعت ہے
مجاہد ہوں مرے ہاتھوں میں دنیا کی قیادت ہے
مری ایک ایک انگڑائی پیامِ فتح و نصرت ہے

چند اشعار کے بعد کہتے ہیں:

مٹا دے ذہن سے عقل فسوں پیشہ کی تاریکی
کہ تجھ کو جلوۂ نور حقیقت کی ضرورت ہے
یہ کیسی باغبانی ہے کہ ڈر ہے برق و صرصر کا
وہ مالی ہو کہ جس کو اختیار رنگ و نکہت ہے

حضرت عزیز ربانی عزیز جملہ اصناف پر قادر تھے، ان کے شعری ذخیرے میں نظمیں اور غزلیں بھی ملتی ہیں اور قطعات و رباعیات بھی، قصائد و مراثی بھی ملتے ہیں اور نعت و مناقب اور سلام بھی۔ لیکن ہم انھیں جس صنف میں دیکھتے یا پڑھتے ہیں، وہ ہمیں ایک قومی و ملی دردمند اور محبت و اخوت کے پیام بر کے طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کے ایک ایک شعر میں سوز مصطفوی کی ضیا پاشی ملتی ہے۔

نمونے کے طور پر ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

اب شیشہ و شراب نہ جامِ نظر ملے
اے میرِ مے کدہ مجھے تیغ و تبر ملے
وہ مرکزِ سکوں، وہ جہانِ نظر ملے
دل کے سوا جہاں نہ کوئی ہم سفر ملے
تجھ کو اگر بلندیِ ذوقِ نظر ملے
وہ حسن پردہ دار ابھی جلوہ گر ملے
وہ آ رہے ہیں دیکھیے زلفیں سنوار کے
سامان پھر ہیں برہمی روزگار کے
دلوں میں نور تھا وہ بھی عجب زمانہ تھا
بغیر شمع بھی معمور آستانہ تھا

اختصار کا خیال رکھتے ہوے چند اشعار میں نے نقل کیے ہیں۔ چوں کہ ان کے ہاں پُر گوئی بہت ہے، ان کا ہر شعر 'کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست' کا منظر پیش کرتا ہے اور انتخاب ایک دشوار کام ہو جاتا ہے اس لیے میں نے نمونے کے طور پر چند غزلوں کے صرف مطلعے ہی نقل کیے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں حسن تغزل بھی ہے اور وسعتِ فکر و نظر بھی، شگفتگی و نغمگی بھی ہے اور زبان و بیان کی شیرینی و حلاوت بھی اور ان کے پیش رو اقبال و شفیق کا لہجہ و آہنگ اور سوز و گداز بھی۔

حضرت عزیز ربانی عزیز کی شاعری کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے پیش رووں کے شعری ذخیرے کا گہرائی سے مطالعہ کر کے اُسے اپنے فکر و فن میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ بلا شبہ حضرت عزیز ربانی عزیز ہم سے جدا ہو چکے ہیں اور ان کے غربت و افلاس نے انھیں اپنا کلام شائع کرنے یا اُسے عام کرنے کا موقع نہیں دیا، وہ تنگی و عسرت کی زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے، لیکن جہاں جہاں اور جس انداز سے بھی ان کی شاعری پہنچے گی، وہ دیر تک زندہ رہے گی۔ وہ ان حقیقی شعرا میں تھے جنھیں قوم و ملت کا عظیم سرمایہ کہا جانا چاہیے۔

■

**Dr. Tabish Mehdi**
G5/A - Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar
New Delhi - 110025 (INDIA)
Ph:26970736 Cell: 9818327947, 9999223268
E-mail: drtabishmehdi@gmail.com

عالم رنگ و بو میں ہزاروں انسان ایسے پیدا ہوئے ہیں جن کی طبیعت میں شاعری ودیعت کی گئی ہے جنھوں نے خالق کائنات کے اس بخشے ہوئے انمول تحفے کا صحیح استعمال کر کے بندگان خدا کو روحانی غذا دے کر انھیں اپنے خالق و مالک کے بہت قریب کرنے کی سعی بھی کی ہے۔عربی زبان میں حسان بن ثابتؓ،عبداللہ بن رواحہؓ، فارسی میں جلال الدین رومی، شیخ سعدی اور اردو میں حالی،حفیظ جالندھری،اقبال اور مجذوب وغیرہ ان شعراء میں چند نام ہیں۔

خواجہ عزیزالحسن مجذوب 12 جون 1884 بمطابق 16 شعبان 1301ھ بروز بدھ پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام خواجہ عزیز اللہ تھا جو پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے۔ خواجہ صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔گھر کے دینی ماحول اور والد محترم کی تربیت سے یونیورسٹی میں بھی اسلامی وضع قطع کے پورے پابند رہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ ان کے متعلق کہا کرتے تھے کہ یہ جس عہدے پر بھی پہنچے گا اس عہدے کے معیار کو بلند کر دے گا۔اسی زمانے میں مولانا اشرف علی تھانوی سے تعلق پیدا کیا اور پھر یہ تعلق عمر بھر رہا۔اسی زمانے سے شعر بھی کہنے لگے۔پہلے حسن تخلص کیا اور بعد میں مجذوب۔

ابتداءً ڈپٹی کلیکٹری کے عہدے پر مامور ہوئے اور سات برس تک اپنی خدمات انجام دیں۔اس کے بعد ڈپٹی انسپکٹر تعلیم کے عہدے پر تبادلہ کرالیا۔حکومت نے آپ کی بلند شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے 'خان صاحب' کا خطاب عطا کیا اور پھر 'خان بہادر' کا۔انسپکٹری سے سبکدوش ہونے کے بعد اکثر وقت خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون میں گذارا۔تھانوی سے ان کی عقیدت کس درجے کی تھی اس کا اندازہ ان ہی کے اس ارشاد سے ہوتا ہے کہ:

''الحمدللہ سب سے بڑا اشرف جو احقر کو بفضلہٖ تعالیٰ حاصل ہوا وہ یہ ہے کہ حضرت اشرف المخلوقات علیہ و التحیات جیسے اشرف الرسل کی امت مسلمہ میں ہوں اور حضرت اشرف الزمن جیسے اشرف المشائخ کے ارادت مندوں سے ہوں''

شعری پیرایہ میں بھی جگہ جگہ تھانوی صاحب سے اپنی عقیدت کا اظہار والہانہ طور پر کرتے ہیں۔

ہے احد معبود اپنا اور نبی خیرا لوریٰ
شیخ بھی ہے قطب دوراں میں تو اس قابل نہ تھا
میں نظر کردہ ہوں اُس پیر مغاں کا صوفیو
جس کے دل کی سرزمین ذرہ ذرہ طور ہے

آخر کار گلستان عالم میں ایک مدت تک نغمہ سُرائی کرنے کے بعد 17 اگست 1944 کو یہ بلبل چمنستان اشرف ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

عزیزالحسن مجذوب کے عارفانہ کلام کا دیوان بنام 'کشکول مجذوب' پہلی دفعہ 1950 میں جب شائع ہوا تو اس کا اس قدر چرچہ ہوا کہ کئی دوسرے شعرا نے قطعہ تاریخ تدوینِ کشکول مجذوب لکھا۔مولانا سعداللہ صاحب کا یہ قطعہ تو بہت ہی مشہور ہوا۔

یہ دیوان خواجہ عزیز الحسن کا
مدون ہوا اور چھپا بھی بہت خوب
یہ نکلی ہے چھپنے کی تاریخ ہجری
ہوا طبع کیا عمدہ کشکول مجذوب

ایک دفعہ خواجہ صاحب نے شعری ذوق رکھنے والے اپنے ایک ارادت مند مولانا نجم الحسن تھانوی سے فرمایا کہ جب میرا دیوان مرتب ہوجائے تو اس کا نام اس طرح رکھا جائے کہ پہلی سطر میں 'کلام مجذوب' لکھا جائے پھر اس کے نیچے 'مطلب بہ' خفی قلم سے لکھا جائے اور جلی قلم سے 'پیام محبت' اور سب سے اوپر یہ شعر لکھا جائے

کلام مجذوب والہانہ ہمیشہ دہرائے گا زمانہ
کسی حسیں کا نہیں فسانہ، یہ ایک عاشق کی داستاں ہے

اور نیچے یہ شعر لکھا جائے

جو مجذوب کا ہے کلام محبت
وہ دنیا کو ہے اک پیام محبت

دیوان کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سچ ثابت ہوجاتی ہے کہ پورا کلام 'کلام محبت' کے سوا کچھ بھی نہیں۔ صاحب قال لوگوں کے لیے شاید اس میں کوئی شراب الست نہیں لیکن صاحب حال کے لیے یہ عرفان کا بیش بہا سرمایہ ہے۔

خواجہ صاحب نے اردو کی مشہور اصناف شعر یعنی غزل، حمد، نعت، نظم وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر ایک صنف میں عرفانیات کا دریا بہایا ہے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز بھی ہے اور جذب و شوق بھی، محبت الٰہی کی بھی داستان ہے اور محبت شیخ میں دیوانہ ہونے کا بیان بھی۔ ان کی شاعری کا ایک ایک شعر حقائق و بصیرت سے اس درجہ پُر ہے کہ شاعری نہیں بلکہ الہام معلوم ہوتی ہے۔

یہ حقائق، یہ معانی، یہ روانی یہ اثر
شاعری تیری ہے اے مجذوب یا الہام ہے

خواجہ صاحب حلقۂ شعراء میں اس قدر مشہور تھے کہ ہر ایک ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ آل انڈیا اردو مشاعرے ان کے بغیر ادھورے سمجھے جاتے۔ ایک دفعہ دہلی میں آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مشاعرے میں ملک کے بلند پایہ شاعر ہی مدعو کیے گئے۔ خواجہ مجذوب کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا لیکن انھوں نے عذر لکھ بھیجا کہ اب ان کی طبیعت شعر و شاعری میں نہیں لگتی۔ ناظم مشاعرہ نے پھر خط لکھا کہ آپ کا آنا بہت ضروری ہے اور آپ کی شرکت کے بغیر مشاعرہ نامکمل رہ جائے گا۔ خواجہ صاحب نے جواب میں یہ قطعہ لکھ بھیجا۔

چھوڑ مینا و جام کی باتیں
اب ہوں پیری میں کام کی باتیں
دن کی باتوں کا اب یہ وقت نہیں
شام ہے اب ہوں شام کی باتیں

ناظم مشاعرہ خود بھی شاعر تھے انھوں نے جواب میں پھر اصرار کا ایک لمبا خط لکھا اور اسی زمین میں ایک نظم تحریر کی جس کے چند اشعار یوں ہیں۔

کیوں ہوں مینا و جام کی باتیں
کیجیے آکے کام کی باتیں
آیئے لوگ سننا چاہتے ہیں
ایک شیرین کلام کی باتیں
آپ بزم عوام میں آکر
کیجے اپنے مقام کی باتیں

خواجہ صاحب جب مشاعروں میں اپنا کلام پڑھنے کے

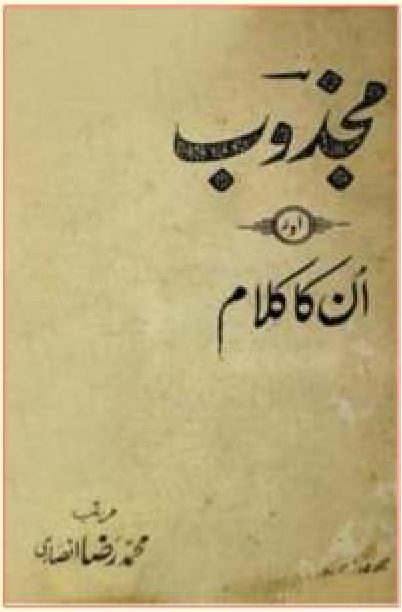


لیے اسٹیج پر جلوہ افروز ہوجاتے اور اپنا کلام سنانا شروع کرتے تو لوگ کھڑے ہو ہو کر ان کا استقبال کرتے اور خواجہ صاحب انھیں اطمینان کے ساتھ بیٹھنے کی مودبانہ گذارش کرتے۔

غزل پڑھنے کو وہ مجذوب بے تابانہ آتا ہے
سنبھل بیٹھو سنبھل بیٹھو کہ اب دیوانہ آتا ہے

پھر غزل کے مطلع سے ہی مکرر مکرر، واہ واہ، کیا خوب کہا ہے کی آوازیں فضا میں گونجنے لگتیں۔ یہاں تک کہ پچاسوں اشعار سنا کر بھی سامعین 'اور کچھ سناؤ اور کچھ سناؤ' کی آوازیں لگاتے۔

اردو کا وہ کون سا شاعر ہے جس نے اپنی شاعری پر ناز نہ کیا ہو۔ مجذوب کو بھی اپنی شاعری پر ناز تھا چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں

شکر خدائے عزوجل لکھی ہے میں نے وہ غزل
جس کا کہیں کوئی بدل کہتا ہوں بر ملا نہیں

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہم عصر اور قدیم شعراء کے اچھے کلام کو بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک دفعہ مجلس میں بیٹھے ہوئے تسبیح لیے کچھ گنگنا رہے تھے تو فرمایا شوکت تھانوی کا یہ شعر مجھے بہت پسند ہے۔

ہر انساں فرض انسانی سے غافل ہوتا جاتا ہے
زمانہ آگ دے دینے کے قابل ہوتا جاتا ہے

پھر نہ صرف شوکت تھانوی کو اس شعر پر کافی داد دی بلکہ اسی زمین اور ردیف و قافیہ میں ایک غزل بھی کہی اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

نگاہ خلق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے
مری نظروں میں پھیکا رنگ محفل ہوتا جاتا ہے
خدا پر چھوڑ دو چارہ گرو اب مرحلہ میرا
تم آساں کرتے جاتے ہو یہ مشکل ہوتا جاتا ہے

ایک مرتبہ اپنا یہ شعر ترنم کے ساتھ بار بار پڑھ رہے تھے

زیست کیا ہے ابتدائے درد دل
موت کیا ہے انتہائے درد دل

شبیر علیؒ بھی تشریف فرما تھے، بولے کہ غالب نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر یوں فرمایا ہے۔

قید حیات بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مجذوب پھڑک اٹھے اور بولے کہ غضب کر دیا۔ واقعی استاد استاد ہی ہے میرا شعر پھیکا پڑ گیا۔

مجذوب نے دوسروں کی زمین میں غزلیں و نظمیں کہی ہیں جس کی ایک مثال علامہ اقبال کی مشہور نظم 'ترانہ ہندی' ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

کی زمین میں 'ترانہ مسلم' ع

آثار سے ہے ماضی ہر سو عیاں ہمارا

ہے) انھوں نے دوسرے شعراء کے اشعار کو اپنے مفہوم میں ادا بھی کیا ہے۔ میر تقی میر کا مشہور شعر ہے

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

امیر مینائی نے اس شعر کو یوں ادا کیا

یہ کس نے آتے ہی الٹی نقاب چہرے سے
کہ جھلملانے لگے سب چراغ محفل کے

اور اب خواجہ صاحب کے اسی مفہوم کا شعر دیکھیے

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لو شمع کی
پتنگوں کے عوض اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

مجذوب کی ایک ایک غزل پچاسوں اشعار پر مشتمل ہے۔ دراصل آمد اس طرح کی ہوتی تھی کہ قلم کو لکھنے کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑتا بلکہ آمد مضمون کو انتظار میں رہنا پڑتا چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں

میں اور غزل ہیں آمد مضموں سے دونوں تنگ
لیتا ہوں ایک کو تو ہیں دس انتظار میں

غزل میں جب پچاسوں اشعار ہوں تو ضرور ہر شعر عمدہ نہیں ہوگا یہی ان کی غزل کے ساتھ بھی ہوا چنانچہ شوکت تھانوی صاحب اپنے مضمون 'شیش محل' میں ان کی غزلوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''خواجہ صاحب بہت ہی عمدہ کہتے ہیں اور نہایت ہی کیف کے ساتھ پڑھتے ہیں مگر کسی غزل میں اڑھائی سو اشعار سے کم نہیں کہتے اور پھر انتخاب نہیں کر سکتے کہتے

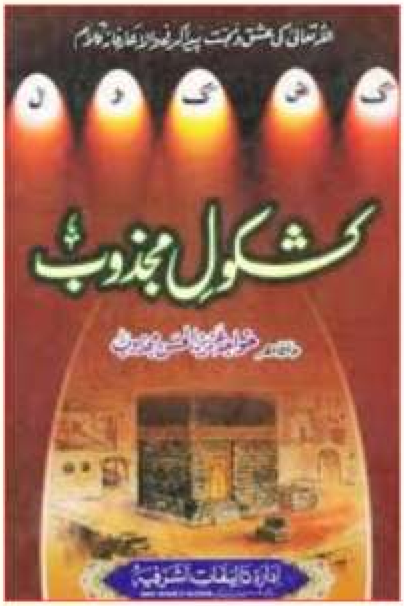


چلے جاتے ہیں اور پھر کہہ چکنے کے بعد سناتے چلے جاتے ہیں۔ اشعار کے ان انباروں میں اچھے برے سبھی قسم کے شعر ہوتے ہیں مگر اچھے زیادہ اور معمولی کم.....''

خواجہ صاحب صرف غزل کے شہنشاہ نہیں تھے بلکہ انھوں نے صنفِ نظم میں بھی قلم کے جوہر دکھلائے ہیں۔ ان کی نظمیں خاصی طویل ہیں مگر پڑھتے جاؤ اور سر دھنتے جاؤ اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ طوالت کی وجہ سے ان کی غزلیں اتنی مقبول نہیں ہوئیں جتنی ان کی نظمیں مقبول عام ہوئیں جس نے بھی ان کی نظم پڑھی وہ خراج تحسین پیش کرنے کے بغیر نہیں رہا۔ انھوں نے ملتِ خوابیدہ کو بیدار کرنے اور انھیں عمل صالح پر اُبھارنے کے لیے ایک طرح کی ہلچل برپا کی۔ مراقبہ موت، درس عبرت، پیغام بیداری، مسٹر اور ملا کی نوک جھونک، مسلم کی بیداری، اسلامی سہرا وغیرہ ان کی مقبول نظمیں ہیں۔

'مراقبہ موت' مسدس ہئیت میں انتالیس بندوں پر مشتمل ایک ایسی نظم ہے جو نہ صرف موت کو یاد دلاتی ہے بلکہ آخرت پر یقین رکھنے والے قارئین کو موت کی تیاری کرنے کے لیے بھی اُبھارتی ہے۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ نبیوں اور ولیوں نے بھی اس کا سامنا کیا ہے یہ پیر و جوان شاہ و گدا کی تمیز بھی نہیں رکھتی بقول شاعر۔

نہ نبی رہے نہ ولی رہے، نہ غنی رہے نہ سخی رہے
چلے جارہے ہیں کشاں کشاں کوئی قید پیر و جواں نہیں

لیکن کامیاب و کامران وہی لوگ ہیں جو آخرت کی تیاری کر کے اس دارفانی سے رخصت ہو گئے یہی اس نظم کا مرکزی خیال بھی ہے۔ 'اصلی گھر' نام سے بھی یہ نظم بہت مشہور ہوئی ہے۔

دارِ دنیا کی سجاوٹ پر نہ جا — نیکیوں سے اپنا اصلی گھر سجا
پھر وہاں بس چین کی بنسی بجا — اِنَّہٗ قَدْ فَازَ فَوْزاً مَنْ نَجَا

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کرلے جو کرنا ہے آخرت موت ہے

اس بند کا آخری شعر بطور ٹیپ شعر نظم کے ہر بند میں دہرایا گیا ہے۔

'درس عبرت' بھی ایک ایسی نظم ہے جو سیکڑوں لوگوں کے لیے رشد و ہدایت کا ذریعہ بنی ہے۔ اس نظم کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ دنیا جی لگانے کے قابل نہیں بلکہ عبرت کی جگہ ہے۔

تجھے پہلے بچپن نے برسوں کھلایا
جوانی نے پھر تجھ کو مجنون بنایا
بڑھاپے نے پھر آکے کیا کیا ستایا
اجل تیرا کر دے گی بالکل صفایا
جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

آخری شعر نظم کے ہر بند میں بطور ٹیپ شعر استعمال ہوا ہے۔

'مسلم کی بیداری' مجذوب کی ایک ایسی نظم ہے جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ یہ نظم اپنے دور کی مقبول ترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے اور ہر خاص و عام سے اس نظم نے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

مجذوب نے جو دور پایا وہ سیاسی اتھل پتھل اور رسہ کشی کا زمانہ تھا ایک طرف مادیت کے حق میں زور دار تحریک چل رہی تھی کہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ایک لقمے کے لیے بھی لوگ برسرِ پیکار ہوجائیں۔

بقول مجذوب:

پیٹ کی خاطر سے جو برسر پیکار ہے
لقمۂ تر کے لیے بس ہاتھ میں تلوار ہے

مجذوب نے اس نظم میں خاص طور پر مال و زر اور جاہ و حشم کے جھمیلوں سے دور رہنے اور اعلائے کلمۃ اللہ میں سرگرم رہنے کی تلقین کی ہے مثلاً

مال و زر جاہ و حشم قوم و وطن رنگ و نسب
آئے دن دنیا میں جھگڑے ہیں انھیں کے تو سب

لیکن مجذوب کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ مسلمان تب تک سو فیصد کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے جب تک نہ ان کی سیرت و اخلاق صحابہؓ کے مانند ہو جائے تبھی تو فرماتے ہیں کہ۔

صدق صدیقؓ دکھا تو عدل فاروقؓ دکھا
عفت و حلم و حیا شرمِ عثمانؓ دکھا
حیدرِ کرارؓ کی شیری و شہ زوری دکھا
اپنے سب جوہر دکھا کر اپنی یکتائی دکھا

43 بندوں پر مشتمل مسدس ہیئت کی یہ فکر انگیز نظم شروع سے آخر تک ایک خاص تاثر میں ڈوبی ہوئی ہے اور قاری اس تاثر کو لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غزل اور نظم کے اپنے خاص اسلوب اور تاثر میں مجذوب کا جہاں کوئی ثانی نہیں وہیں سہرا لکھنے میں بھی ان کی کوئی نظیر نہیں۔ حافظ سید شمس الحسن تھانوی کی شادی خانہ آبادی جب مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ کی صاحبزادی کے ساتھ ہونا قرار پائی تو حافظ صاحب کی ماں نے خواجہ مجذوب کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا کہ شمس الحسن کی شادی پہ ایک سہرا لکھ دیجیے۔ خواجہ صاحب ان دنوں 'سوانح حکیم الامت' کی ترتیب و تہذیب میں مصروف تھے اس لیے کہلا بھیجا کہ اس کے لیے وقت نکالنا

**خواجہ صاحب صرف غزل کے شہنشاہ نہیں تھے بلکہ انہوں نے صنف نظم میں بھی قلم کے جوہر دکھلائے ہیں۔ ان کی نظمیں خاصی طویل ہیں مگر پڑھتے جاؤ اور سر دھنتے جاؤ اکتاھٹ محسوس نہیں ہوتی۔ طوالت کی وجہ سے ان کی غزلیں اتنی مقبول نہیں ہوئیں جتنی ان کی نظمیں مقبول عام ہوئیں جس نے بھی ان کی نظم پڑھی وہ خراج تحسین پیش کرنے کے بغیر نہیں رہا۔**

بہت مشکل ہے اور جب شادی کی تاریخ قریب آگئی ان کو کوئی چارہ نہیں رہا اور سہرا لکھ کر شادی سے دو چار روز قبل دولہا کی خدمت میں پیش کر کے پورا سہرا خود اپنے خاص لہجے اور ترنم میں سنایا۔ سامعین ہر ہر شعر پر جھوم اُٹھے اور ہر شعر کو کئی کئی بار پڑھنے کے لیے کہا گیا۔ یہی سہرا جب لکھنؤ کے ایک سہرا کہنے میں استاد شاعر نے سنا تو ہر ہر شعر پر تڑپ گئے اور اُچھل کر کہتے تھے کہ ''مجذوب غضب کر دیا کہاں سے لائیں یہ تشبیہیں اور کیسے ترتیب دیا ان مضامین کو''۔ اس سہرا کے چند اشعار نقل کرنے کو دل چاہتا ہے۔

تجھے ہرگز نہیں درکار اے شمس الحسن سہرا
تجھے ہے خود تیرا فضل و ہنر اور علم و فن سہرا
یہ وہ سہرا نہیں جو بعد شادی کے اتر جائے
رہے گا پاس یہ تا عمر مثلِ جان و تن سہرا

تری نیچی نگاہیں کیا ہیں یہ سہرے کی لڑیاں ہیں
مجھے تو زیب دیتا ہے یہی ہے جان من سہرا

حافظ شمس الحسن کی شادی اور رخصتی کے بعد مجذوب نے 'مبارک بادی مظہر تاریخ شادی' عنوان کے تحت دلہن کو بہت سراہا اور ان کی صورت وسیرت کو پری وحور پر فوقیت دی۔ اور آخر پر ان کی خانہ آبادی اور اولاد سے گھر میں خوشیاں بھر جانے کی دعائیں دے دیں۔

اے نوشہ تجھے شادی مبارک ہو مبارک ہو
یہ قید غم سے آزادی مبارک ہو مبارک ہو
دلہن ایسی ملی ہے، جس کی صورت اور سیرت پر
پری کیا حور شرمادی مبارک ہو مبارک ہو
خدا وہ دن کرے اولاد سے بھر جائے گھر تیرا
تجھے یہ خانہ آبادی مبارک ہو مبارک ہو

فی البدیہہ اشعار کہنے میں بھی مجذوب کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ کسی نے اگر مٹھائی پیش کی تو دوسرے دن شکریہ کے طور اس پر قطعہ تحریر کیا اور اگر کسی نے سردی سے بچنے کے لیے انگھیٹی بھیج دی تو اس پر بھی اشعار کہے اور اگر کسی نے ناشتہ کروایا تو اس کو خوش کرنے کے لیے دوسرے ہی دن چند اشعار کہہ ڈالے۔ اس کی مثالیں تو بہت ہیں یہاں پر صرف ایک دو مثالیں پیش کرنا مناسب رہے گا۔

ایک دفعہ انعام تھانوی کے بہنوئی محمد کاظم فاروقی صاحب کی بڑی بیٹی نجمہ جس کی عمر اس وقت صرف پانچ چھ سال کی تھی مگر بہت ہی سنجیدہ اور خوبصورت تھی مجذوب کے سامنے آگئی تو انھوں نے اسے گود میں لیا اور کاظم صاحب سے فرمایا کہ یہ بچی تو بہت خوبیوں کی مالک ہے اس کا نام کیا ہے۔ کاظم صاحب نے بتایا کہ نجمہ خورشید نگین اس کا نام ہے۔ مجذوب نے نام سن کر فرمایا کہ اس نام کو شعر میں لانا کٹھن ہے۔ مگر دوسرے ہی روز ان کی خدمت میں یہ اشعار پیش کیے۔

بیٹی ہے مری نجمہ خورشید نگین ایسی
دیکھی نہ حسین ایسی، دیکھی نہ متین ایسی
اس شان کی لڑکی کو تو اس کی ضرورت ہے
نکلے نہ کبھی باہر، ہو پردہ نشین ایسی

یہی کاظم صاحب سگریٹ نوشی کے عادی تھے ایک دفعہ ان کے سامنے سگریٹ پینے کے لیے احتراماً اجازت چاہی اور معذرت کے انداز میں فرمایا کہ میں اس عادت سے مجبور ہوں ورنہ یہ آپ کے سامنے بہت بڑی گستاخی ہے۔ مجذوب نے اجازت مرحمت فرمائی اور مزاحاً کہا کہ آپ پئیں مگر ہمیں نہ دیں اور پھر یہ شعر فرمایا۔

نہ لوں گا میں سگریٹ وہ دیں جتنا چاہیں
کہ میں کھینچتا ہوں دھواں دھار آہیں

ایک روز میاں ظہیر علی مرحوم کے ہاں جب چائے پیش کی گئی تو علاوہ متفرق چیزوں کے ظہیر صاحب نے ایک پلیٹ میں مصنوعی پھل بھی لا رکھے۔ رات کا وقت تھا مگر اس کے باوجود خواجہ صاحب نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا اور سمجھے کہ میری نظر کا امتحان کرنے کے لیے مصنوعی پھلوں کا پلیٹ سامنے رکھا گیا ہے۔ ایک ایک چیز کو بار بار اٹھا کر دیکھتے اور تعریف فرماتے۔ اگلے روز اس پر بھی دو شعر فرمائے۔

ذرا چشم حقیقت بیں سے تو دیکھ ظہیر ان کو
جو تم لائے ہو سیب، اخروٹ اور بادام مصنوعی
نہ سمجھ ان کو یہ سبق آموز عبرت ہے
اسی صورت سے اس دنیا کا ہے ہر کام مصنوعی

عزیز الحسن مجذوب کا کلام سراسر واردات سے پُر ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں مشیت ایزدی کو سامنے رکھ کر مشاہدہ اور یقین کی بناء پر کہتے ہیں۔

جبھی کچھ میں کہتا ہوں جب دیکھتا ہوں
کہ دل بھی مرا ہم زبان ہو رہا ہے

مجذوب نے اگرچہ ہر قسم کی شاعری کی ہے لیکن اصل میں وہ اپنے کلام سے خدا کی محبت وعظمت دلوں میں جاگزین کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انعام الرحمٰن تھانوی فرماتے ہیں:

''تعلق مع اللہ ہی صالح فکر وعمل کی بنیاد اور انسانی درد ومصائب کا مداوا ہے اور اسی کی تلقین پر ان کا تمام کلام مشتمل ہے وہ ظاہر میں عشق ومحبت اور دوسری ہر قسم کی شاعری فرماتے ہیں مگر اصل میں ان کے پیش نظر دعوت حق ہے اور وہ اپنے عارفانہ کلام سے خدائے قدوس جل مجدہٗ کی محبت وعظمت کے زریں آثار قلوب میں جاگزیں کرنا چاہتے ہیں''۔

منظوم انداز میں بھی یہی بات 'نذر عقیدت' عنوان کے تحت یوں کہی ہے۔

باوصف شیخ وعارف وصوفی وحق شناس
تو شاعر وادیب ہے بے مثل وبے عدیل
ہر لفظ تیرا دعوت تبلیغ و انقلاب
تو شاہراہ اقدس کا ہے داعی و وکیل
عرفان و آگہی کا مرقع تیرا کلام
شمع رہ حیات تیری کاوش جمیل

اردو شاعری کو کچھ ایسے مشہور ومعروف شاعر بھی ملے ہیں جنھوں نے کچھ وقت تک سخن دانی کر کے اس کو بعد میں چھوڑنا چاہا لیکن اساتذہ یا یار دوستوں کے اسرار پر سخن دانی کی مشق جاری رکھی اس سلسلے میں علامہ اقبالؒ کی مثال دی جاسکتی ہے۔ مجذوب کی زندگی میں بھی ایک وقت ایسا

**مجذوب کی زندگی میں بھی ایک وقت ایسا آیا جب وہ شاعری کو خیرباد کرنا چاھتے تھے۔ اس کی انھوں نے خود دو وجھیں بتا ئیں ھیں ایک یہ کہ اب مجذوب وہ مجذوب نہیں رھا جو تھانوی صاحب کی صحبت میں آنے سے پھلے تھا۔ اب تو وہ باضابطہ کسی کی نگا ہ میں تھے اس لیے وہ اپنا قیمتی وقت شعر و شاعری میں ضائع نہیں کرنا چاھتے تھے۔**

آیا جب وہ شاعری کو خیر باد کرنا چاہتے تھے۔ اس کی انھوں نے خود دو وجہیں بتائیں ہیں ایک یہ کہ اب مجذوب وہ مجذوب نہیں رہا جو تھانوی صاحب کی صحبت میں آنے سے پہلے تھا۔ اب تو وہ باضابطہ کسی کی نگاہ میں تھے اس لیے وہ اپنا قیمتی وقت شعروشاعری میں ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ نگاہ ولی نے مجذوب کی تقدیر کیا بدلی کہ اس کا دل حقیقت سے آشنا ہو گیا چنانچہ فرماتے ہیں۔

حقیقت سے دل آشنا ہو گیا
میں اب شاعری چھوڑنا چاہتا ہوں

مجذوب کی شاعری کے قدردان خاص وعام تھے یہی تو وجہ تھی کہ ملکی اور بین الاقوامی سطح کے مشاعروں میں انھیں دعوت سخن دی جاتی تھی لیکن ان کی شاعری کے خاص قدردانوں میں ان ہی کے مرشد حضرت اشرف علی تھانوی صاحب تھے اس کا اندازہ آپ تھانوی صاحب کے اس بیان سے کر سکتے ہیں:

''خواجہ صاحب کا کلام حال ہی حال ہے، قال کا نام نہیں کیوں کہ قال میں یہ اثر ہونا ناممکن ہے''

ایک دفعہ حضرت حکیم الامت نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ آپ کا ایک شعر مجھے اتنا پسند ہے کہ میرے پاس اگر ایک لاکھ روپیہ ہوتا تو میں آپ کو اس شعر کے انعام کے طور دے دیتا۔ جب یہ شعر میری زبان پر آتا ہے تو میں کم سے کم تین دفعہ تو ضرور پڑھتا ہوں شعر یہ ہے

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

■

**Dr. Faiz Qazi Abadi**
Super Naghama Handwara,
Kashmir - 193302 (J&K)

سید شاہد اقبال

# سری لنکا میں بہار کا ایک خادم علم و ادب
# سید اختر امام

سری لنکا ایک بڑے جزیرہ کی حیثیت سے جزیرہ نمائے ہند کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ کسی زمانے میں ہندوستان سے ملا رہا ہوگا اور بہت سی باتوں میں یہ ہندوستان سے مشابہ بھی ہے۔ سراندیپ لنکا کو سیلون کہا جاتا تھا۔ پہلا حوالہ 'قصص الانبیا' کا تھا جس میں ذکر ہے کہ جنت سے نکالے جانے کے بعد حضرت آدمؑ کا پہلا قدم وہیں پڑا تھا اور اس لیے وہاں کوہ آدمؑ موجود ہے۔

دوسرا حوالہ ریڈیو سیلون سے نشر ہونے والا گانوں کا فرمائشی پروگرام تھا۔ اس زمانے میں 'بنا کا گیت مالا' کی دھوم تھی۔

سری لنکا کی خاص نسل سنہالیز ہے جو دو تین ہزار سال گذرے شمالی ہند سے آئے تھے اور لنکا پر قابض ہو گئے۔ سنہالیز بودھ مذہب کے پیرو ہیں۔ کینڈی میں 'دانت کا مندر' ہے یہاں گوتم بودھ کا ایک دانت محفوظ ہے۔

ڈاکٹر سید اختر امام نے اپنے خط (مورخہ 24 نومبر 1979) میں کینڈی (Kandy) کے دانت کے مندر کا ذکر کیا ہے۔ پھر سری لنکا میں بودھ مت کے مقدس مندر سے نکلنے والے ایک جلوس کے منظر نامے کا ذکر کیا ہے جو اس مندر میں مہاتما بودھ کے رکھے ہوئے دندان مبارک کی یاد میں نکلا کرتا ہے۔ (بحوالہ: مکتوبات اختر امام ص 45)

سری لنکا کے شمالی حصے میں تامل آباد ہیں۔ مورس، مسلمان تاجر، ملاح یا ماہی گیر ہیں۔ قدیم پرتگالیوں اور ڈچ باشندوں کی نسل کے لوگ 'برگر' کہلاتے ہیں۔

1505 میں یورپین باشندے جو سری لنکا جزیرے میں آباد ہوئے وہ پرتگالی تھے اس کے بعد ڈچ آئے۔ پھر انگریز، پرانے ڈچ بندرگاہ 'گالے' اور دوسرے مقامات پر اب بھی نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سید اختر امام کا تعلق نواب سید امداد امام اثر کے خانوادے سے تھا۔ امداد امام اثر کے والد کا نام سید وحید الدین خان بہادر تھا۔ ان کے جد امجد کا تعلق سید حسن خنگ سوار کے بھائی سید حسین خنگ سوار سے تھا۔ سید حسین خنگ سوار کا مزار مبارک موضع نیورہ، ضلع پٹنہ میں ہے۔ ان کے برادر بزرگ سید حسن خنگ سوار کا مزار مبارک اجمیر شریف میں تارا گڑھ پہاڑ پر ہے جن کی شہادت 1303 میں ہوئی تھی۔ پروفیسر سید حسن عسکری نے ان کے ایک اور بھائی (سید احمد) کا ذکر کیا ہے جن کا مزار موضع جرہ بانزد حاجی پور (شمالی بہار) میں ہے۔ اور مزار ماموں بھانجہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس جگہ سید احمد اور سید محمد آسودۂ خواب ہیں۔ سید احمد، سید محمد کے ماموں تھے۔ راجامان سنگھ نے مذکورہ مزار ماموں، بھانجہ کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک شاہی فرمان 21 ذی الحجہ 999ھ مطابق یکم اکتوبر 1591 کو جاری کیا تھا۔ اس میں مزار کے متولی شیخ بخش کے نام چودہ 14 بیگھہ قطع اراضی تفویض کیا گیا تھا۔

(بحوالہ: رموز تحقیق (نیا ایڈیشن) ص 146-47)

شمس العلماء نواب سید وحید الدین خان بہادر کے والد سید امداد علی، دادا کا نام سید امام علی تحصیلدار مقام کوئیلور (آرہ) پردادا بقیت اللہ تحصیلدار مقام باڑھ ضلع

پٹنہ کے تھے، سید بقیت اللہ کے والد سید احمد اللہ ساکن کرائے پر کرائے ضلع پٹنہ (موجودہ نالندہ) کے تھے۔

جناب سید شتر امام کے مختلف حوالوں سے لکھا ہے کہ شمس العلماء نواب سید وحیدالدین خان بہادر کی تین شادیاں ہوئی تھیں۔

پہلی شادی سید تقی امام ساکن نیورہ ضلع پٹنہ کی بہن سے ہوئی تھی۔

ان کے بطن سے چار لڑکے اور ایک لڑکی رشید النساء (مصنفہ اصلاح النساء مطبوعہ 1980) تولد ہوئیں۔

دوسری شادی ایک انگریز کمشنر (مظفر پور) مسٹر لیزر (Mr. Liyer) کی لڑکی سے ہوئی تھی۔

ان سے امداد امام اور یوسف امام تھے۔

تیسری شادی (اورائی مونگیر) سے جعفر امام کے والد آل امام تھے۔

سید امداد امام کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔

پہلی شادی جسٹس شرف الدین (ساکن نیورہ ضلع پٹنہ) کی بہن سے ہوئی ان سے (1) سید علی امام (2) سید حسن امام (3) حلیمہ خاتون زوجہ سید حفیظ امام (مظفر پور) محل ثانی سے (1) سید حسن امام (2) سید کاظم امام (3) سید عابد امام (4) سید صادق امام (5) عالم آرا (6) حسن آرا (7) جہاں آرا بیگم زوجہ مرزا اسد رضا (ایڈووکیٹ الہ آباد) تھیں۔

سید یوسف امام کے صاحبزادے سید وصی امام تھے۔

سید یوسف امام اور سید وصی امام مستقلاً کرائے پر سرائے میں سکونت پذیر رہے اور اس کی خاک میں پیوند ہیں۔

سید وصی امام کی پانچ اولادیں تھیں:

(1) سید اختر امام (2) سید جعفر امام (3) سید قیصر امام (4) سید جواد امام (5) نزہت امام (6)۔

ڈاکٹر سید اختر امام کی دو شادیاں ہوئی تھیں:

(1) محل اول (پٹنہ سٹی) [تفصیلات نامعلوم]

(2) محل ثانی/منیرہ خانم سے 1947 میں ہوئی تھی۔

منیرہ خانم جو جناب ماریکا مشہور قانون داں کینڈی (Kandy) (سری لنکا) کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ ان سے تین اولادیں ہوئیں: (1) سید عشرت امام (2) عاصیہ امام (3) نزہت امام

سید عشرت امام کی زوجہ کا نام عائشہ امام ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ سید عشرت امام کولمبو ہائی کورٹ کولمبو (سری لنکا) میں جج کے عہدے پر فائز ہیں

سید اختر امام کی پیدائش 10 دسمبر 1910 کو موضع کرائے پر سرائے (ضلع پٹنہ موجودہ نالندہ) میں ہوئی۔

**ڈاکٹر سید اختر امام کا تعلق نواب سید امداد امام اثر کے خانوادے سے تھا. امداد امام اثر کے والد کا نام سید وحیدالدین خان بہادر تھا. ان کے جدامجد کا تعلق سید حسن خنگ سوار کے بھائی سید حسین خنگ سوار سے تھا. سید حسین خنگ سوار کا مزار مبارک موضع نیورہ ضلع پٹنہ میں ہے. ان کے برادر بزرگ سید حسن خنگ سوار کا مزار مبارک اجمیر شریف میں تاراگڑھ پہاڑ پر ہے جن کی شہادت 1303 میں ہوئی تھی۔**

ان کے والد کا نام سید وصی امام تھا۔ سید اختر امام نے ابتدا تا ایم اے کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی جہاں سے 1936 میں عربی زبان وادب میں ایم اے پاس کیا۔ اس کے بعد اختر امام اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلے گئے اور یونیورسٹی آف بون (جرمنی) سے 1939 میں پی ایچ ڈی (عربی) کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے تحقیقی کام کا موضوع تھا 'آرامی (Syriac) زبان کا مطالعہ' اس کے بعد وہ اپنے وطن ہندوستان واپس آگئے۔

ڈاکٹر سید اختر امام 1940 تا 1944 اسلامیہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) کلکتہ میں عربی، فارسی اور اسلامی تاریخ کے استاد برائے ایم اے Post Graduate Lecturer مقرر ہوئے۔ 1944 میں ڈاکٹر سید اختر امام کولمبو (سری لنکا) منتقل ہوگئے۔ 1947 میں ڈاکٹر سید اختر امام کی (دوسری) شادی سنہالیز لڑکی منیرہ خانم سے ہوئی۔ منیرہ خانم سری لنکا کے مشہور قانون داں جناب ماریکا کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ ڈاکٹر سید اختر امام 1947 تا 1950 صدر شعبہ عربی یونی ورسٹی آف سیلون (سری لنکا) میں جوائن کیا۔ اس کے بعد ستمبر 1960 میں بحیثیت صدر شعبہ عربی یونی ورسٹی آف پیرادینہ (سری لنکا) / (University of Peradeniya, Sri Lanka مقرر ہوئے۔ ان کی سبک دوشی 1978 میں ہوئی تھی۔ سبکدوشی کے باوجود پیرادینہ اور کولمبو دونوں جامعات میں تاحیات جزوقتی درس وتدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر سید اختر امام کے شاگرد رشید ڈاکٹر ایم۔ زیڈ۔ ایم نفیل (Dr. M. Z. M. Nefeel) صدر شعبہ عربی اور اسلامی تاریخ یونیورسٹی آف پیرادینہ (سری لنکا) میں ہیں۔

ڈاکٹر سید اختر امام نے 1950 سے 1960 تک حکومت پاکستان کے سفارت کار کی حیثیت سے مختلف ممالک میں اپنی اپنی خدمات انجام دی تھی۔ ان میں جکارتا، ناروے، ہالینڈ اور بیرونی شامل ہیں۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ 17 اکتوبر 1958 میں جنرل ایوب خان کے ذریعے پاکستان میں مارشل لا نافذ کیے جانے کے بعد ساڑھے تین سو مہاجر اعلیٰ سول سرونٹ [C.S.P] کو برخاست کر دیا گیا تھا ان میں ڈاکٹر سید اختر امام بھی شامل تھے۔

ان کے علاوہ شہاب الدین رحمت اللہ (پ: 1909 / م: 1991) کمشنر راج شاہی ڈویژن (مشرقی پاکستان) اور مصطفیٰ حسن زیدی (سکریٹری بنیادی جمہوریت مغربی پاکستان) پ: 1929 /م: 1970) کا نام بھی شامل تھا۔ شہاب الدین رحمت اللہ کا وطن شیر آرہ تھا اور مصطفیٰ زیدی الہ آباد (یوپی) کے تھے۔ مذکورہ دونوں حضرات مشہور شاعر اور نامی ادیب بھی تھے۔ اس بات کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ پٹنہ کالج کے پہلے ہندوستانی پرنسپل سید ضیاء الدین وارثی آف نیورہ شہاب الدین رحمت اللہ کے سگے نانا تھے۔

شہاب الدین رحمت اللہ کی اردو کتب (1) مرقع شہاب (2) بحر جلال شاعری (3) یادیں اور روایتیں (خودنوشت) (4) شہاب بیتی شامل ہیں۔ ان کی انگریزی کتب

1-Art in Urdu Poetry, 2-Hundred Gems of Ghalib, 3-The Call of the Bel

”
**ڈاکٹر سید اختر امام نے 1950 سے 1960 تک حکومت پاکستان کے سفارت کار کی حیثیت سے مختلف ممالک میں اپنی خدمات انجام دی تھی۔ ان میں جکارتا، ناروے، ہالینڈ اور بیرونی شامل ہیں۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ 17 اکتوبر 1958 میں جنرل ایوب خان کے ذریعے پاکستان میں مارشل لا نافذ کیے جانے کے بعد ساڑھے تین سو مہاجر اعلیٰ سول سرونٹ [C.S.P] کو برخاست کر دیا گیا تھا ان میں ڈاکٹر سید اختر امام بھی شامل تھے۔**
“

> ڈاکٹر سید اختر امام کی اردو مادری زبان تھی۔ عربی، فارسی، انگریزی اورجرمن زبان کی استعداد امتیازی تھی۔ فرانسیسی اوربنگلہ اورپالی بھی جانتے تھے۔ الغرض عربی کے استاد کے علاوہ ماہر لسانیات اور محقق کی حیثیت سے پاکستان، سری لنکا اور ہندوستان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں نے اپنار کن بنایا۔

مصطفیٰ زیدی کی شعری کتب: شہرآذر، زنجیریں، روشنی، گریباں، موج میری صدف صدف، کوہ ندا، قبائے ساز— شہاب الدین رحمت اللہ نے اپنی برخواستگی کے خلاف (Supreme Court of Pakistan,) میں دس سال تک مقدمہ لڑا اور معاوضہ (Compensession) وصول کیا تھا— جبکہ مصطفیٰ زیدی نے 14 اکتوبر 1970 کو خودکشی کرلی تھی— راقم کا خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر سید اختر امام بھی 1960 میں واپس سری لنکا چلے گئے اور دوبارہ درس وتدریس میں لگ گئے—!

ڈاکٹر سید اختر امام کی اردو مادری زبان تھی۔ عربی، فارسی، انگریزی اورجرمن زبان کی استعداد امتیازی تھی۔ فرانسیسی اور بنگلہ اور پالی بھی جانتے تھے۔ الغرض عربی کے استاد کے علاوہ ماہر لسانیات اور محقق کی حیثیت سے پاکستان، سری لنکا اور ہندوستان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں نے اپنار کن بنایا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکٹر سید اختر امام ایک سیمینار میں شرکت کرنے کے لیے کراچی (پاکستان) گئے تھے اور 4 ستمبر 1993 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کا مدفن سخی حسن قبرستان کراچی (پاکستان) میں ہے۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ان کے لڑکے کا نام سید عشرت امام ہے۔ جن کی اہلیہ کا نام عائشہ امام ہے۔ اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ سید عشرت امام کولمبو ہائی کورٹ (سری لنکا) میں جج کے عہدے پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر سید اختر امام نے انگریزی میں بہت سے اہم موضوع پر مقالے تحریر کیے ہیں۔ ان کی یہ تحریریں سنہالیز انسائیکلو پیڈیا/ ایرانی انسائیکلو پیڈیا/ دی سیلون آبزرور وغیرہ میں شائع ہوچکی ہیں۔

ان کے چند اہم مقالات کی فہرست درج ذیل ہیں:

1۔ عرب—سیلون ثقافتی تعلقات (سنہالی انسائیکلو پیڈیا)
2۔ ایران سیلون کے ثقافتی تعلقات (ایران انسائیکلو پیڈیا)
3۔ عمر خیام 1972 (سنہالی انسائیکلو پیڈیا)
4۔ اردو زبان (سنہالی انسائیکلو پیڈیا)
5۔ دیباچ کاروائی لسانی سوسائٹی (یونیورسٹی آف سیلون 1961)
6۔ ابتدائی عرب حوالے۔ بودھ مذہب (دی سیلون آبزرور۔ اپریل 1961)
7۔ ہارون رشید کے بغداد پر ہندو اثرات (سیوا تھنڈن 1962)
8۔ اسلامی کتب خانے 1962
9۔ سندھ صدیوں کے آئینہ میں (یہ مقالہ مارچ 1975 میں کراچی میں پیش کیا گیا)
10۔ تاریخ قرآن شریف (دی سیلون آبزرور 1970)
11۔ ایک مقالہ سلسلہ تقریبات ہجری کانفرنس منعقدہ پشاور (پاکستان) 1980 میں پیش کیا گیا۔

ڈاکٹر اختر امام کی علمی وادبی لیاقت کی وجہ سے وہ سری لنکا کے مختلف اداروں اور دانش گاہوں کے سرکاری رکن اور چیئرمین بھی رہے ہیں۔ جن کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

(1) رکن نیشنل ایجوکیشن کمیشن سیلون 62-1961
(2) چیئرمین، پینل آف اسلامک فائن آرٹس وزارت ثقافت سیلون 66-1962
(3) چیئرمین آف اسلامک عربی سری لنکا ساہتیہ منڈا کیہ 1966
(4) چیئرمین مدرسہ تنظیم نو کمیٹی سیلون، وزارت تعلیم 1966
(5) ممتحن برائے پی ایچ ڈی عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 1972
(6) ممتحن برائے پی ایچ ڈی عربی عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد 1974
(7) مہمان عالم، مرکز تحقیقات اسلامیہ، مرکزی لندن 70-1969

ڈاکٹر اختر امام کی دو کتابیں یادگار ہیں:

1۔ مکتوب اختر امام مرتبہ ڈاکٹر سید قیصر امام ناشر ادب نما، کراچی (پاکستان) 2001
2۔ سات ستارے غیر مطبوعہ مملوکہ جناب سید عشرت امام (جج ہائی کورٹ کولمبو فرزندار جمند ڈاکٹر سید اختر امام/ ان کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں غیر مطبوعہ خطوط بھی ہیں ان میں وہ خطوط بھی ہیں جو ڈاکٹر اختر امام کو جواباً لکھے گئے تھے— ان سب کے مکتوب الیہ اور مکتوب نگار ڈاکٹر اختر امام ہیں اور یہ سب خطوط سری لنکا میں ان کی وفا شعار بیگم منیرہ خانم اور ان کے لائق صاحبزادے جج کولمبو ہائی کورٹ جناب سید عشرت امام کی ملکیت میں ہیں۔

ڈاکٹر سید اختر امام کے خطوط کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خطوط نگاری ان کی طبیعت کو بہت راس ہے لہٰذا انھوں نے اس کے ذریعے دنیا کی باتیں کی ہیں۔

محترمہ زاہدہ حنا اور جناب ادیب سہیل کی تحریریں شامل ہیں۔ لہٰذا مذکورہ دو مشاہیر ادب کے حوالے سے گفتگو کی جائے گی۔

ڈاکٹر اختر امام کے اس مجموعہ خطوط میں تحریر اور اسلوب کے تین رخ کی شناخت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ایک رخ وہ ہے جو مولانا عبدالمالک آروی کا نام خطوط میں ظاہر ہوا ہے— دوسرا رخ وہ ہے جو صباح الدین عبدالرحمٰن کا نام خطوط میں ظاہر ہوا ہے— اور تیسرا وہ مجموعی رخ ہے جو جناب ابرار حسن خان اور ڈاکٹر قیصر امام کے نام خطوط میں ظاہر ہوئے—

مولانا عبدالمالک آروی کے نام خطوط میں زیادہ تر عربی وفارسی دنیا زیر بحث آئی ہے۔ جس میں عرب ممالک بالخصوص بغداد کی تاریخی حیثیت ان کے صوفی شعرا کا تذکرہ ہے دوسری طرف ایران اور یہاں کے صوفیائے کرام کا ذکر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اختر امام کی تاریخ دانی اور ان دونوں مقامات کا تفصیلی علم اور خود ان کا اسلوب قلم کا جادو جگاتا ہے کہ قاری بار بار پڑھنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے نام خطوط چونکہ قیام یورپ کے دوران لکھے گئے ہیں لہٰذا ان کا محور یورپی تاریخ میں اہم مقامات اور مشاہیر علم وادب ہیں۔

ابرار حسن خان صاحب کے نام خطوط ذاتی نوعیت کے ہیں علی گڑھ کی علمی وادبی سرگرمیاں یاد آتی ہیں اور اس فرحت کے ساتھ کہ ایک لمحہ کے لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس ماحول میں پہنچ گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان خطوط میں سارا کرشمہ ڈاکٹر اختر امام کی سیاحت پسندی اور سفر دوستی کا ہے۔ جس نے ان کے خطوط کو چیزے دگر بنا دیا ہے۔ انھوں نے 13 اکتوبر 1968 کے خط میں اپنے برادر خورد ڈاکٹر قیصر امام کو لکھا ہے:

''میں چونکہ سفر کو وطن سمجھتا رہا اس لیے سیمابی طبیعت نے سفر پراکسایا.....''

اس کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر اختر امام کا مزاج جہانیاں جہاں گشت تھا تو ان کا مجموعہ جہاں نماں اور خطوط کے اجزائی مقام لاتعداد!

لیکن ان سیکڑوں خطوط کا کیا جو چھپنے سے رہ گئے ہیں اور مذکورہ مجموعہ خطوط شامل نہیں ہو پائے ہیں!

رئیس امروہوی نے جنگ اخبار کی اشاعت 5 جنوری 1979 اور 4 مئی 1979 میں ڈاکٹر اختر امام کے خطوط سے اقتباسات پاکستان 1937 اور 'مکتوب سری لنکا' کے عنوان سے شائع کیے ہیں۔ پہلے خط میں چودھری رحمت علی سے ملاقات کا ذکر ہے۔ جبکہ دوسرے خط میں بطوطہ کا جزائر مالدیپ، پہنچنا'' مالدیپ کے باشندوں کا شیخ ابو برکات کے ہاتھ مسلمان ہونا۔'' (ایضاص 4)

شعبہ عربی سری لنکا یونیورسٹی (کینڈی) سے ڈاکٹر اختر امام نے عموی صادق امام زیدی کے نام اپنے خط میں گیا اور پٹنہ میں اپنے قیام کے ابتدائی دنوں کو یاد کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''یقین مانیے بڑے دادا مرحوم (امداد امام اثر) کی یاد اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ دل و دماغ کو منور کرتی چلی گئی۔ آبگلہ (گیا) کی کوٹھی میں ان کی عالمانہ باتیں / ایام جہالت کی عربی شاعری پر تنقیدی نظر شیکسپیئر کے مکالموں پر ادبی تبصرے / عظیم آباد (پٹنہ) کی برہم شدہ مجلسوں کا ماتم / اور مورخ ابو الفدا کی حقیقت نگاری / یہی نہیں بلکہ ٹائیگر کی وحشیانہ خصوصیات / اور آموں میں فجری کا امتیاز...... ''مختصر یہ کہ فلکیات سے لے کر معدنیات تک ان کے زیر نگیں تھے۔''

(بحوالہ: مکتوبات ڈاکٹر اختر امام ص 41)

ڈاکٹر اختر امام کی طرف سے خطوط جس کسی کو بھی لکھے گئے ہیں ان میں خلوص بے تحاشہ ہے۔ دراصل ڈاکٹر اختر امام کی سرشت پیار سے گوندھی گئی ہے۔ جن پر ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' صادق آتا ہے۔ ڈاکٹر اختر امام کو اس قدر مطمئن اور رواں رکھنے میں ان کی کوئینز پارٹ یعنی سنھالی بیگم کا بھی اہم حصہ ہے۔ اگر کسی کے نصف بہتر اچھے سجاؤ کا نہ ہو تو دیگر نصف کے لے جینا محال ہو جاتا ہے۔ اس کی ترنگ بجھ جاتی ہے اور اس کی اڑان 'پر فینچ' ہو جاتی ہے۔ (مکتوبات ڈاکٹر اختر امام مرتبہ ڈاکٹر سید قیصر امام) بحوالہ ڈاکٹر اختر امام میری نظر میں صفحہ نمبر 42-41 ناشر ادب نما کراچی (پاکستان) 2001)

جناب سید قیصر امام رقم طراز ہیں کہ:

شمس العلماء سید وحید الدین آزاد خان بہادر وصدر اعلیٰ کا اپنے عہد کے اعتبار سے عالی شان گھر کرائے پر سرائے میں اب بھی موجود ہے ان کے صاحبزادگان میں شمس العلماء نواب امداد امام اثر اور نواب سید یوسف امام بھی یہاں رہتے تھے۔ آخر الذکر ہمارے دادا نے اپنی

> ''ڈاکٹر اختر امام کی طرف سے خطوط جس کسی کو بھی لکھے گئے ہیں ان میں خلوص بے تحاشہ ہے۔ دراصل ڈاکٹر اختر امام کی سرشت پیار سے گوندھی گئی ہے۔ جن پر ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' صادق آتا ہے۔ ڈاکٹر اختر امام کو اس قدر مطمئن اور رواں رکھنے میں ان کی کوئینز پارٹ یعنی سنھالی بیگم کا بھی اہم حصہ ہے۔ اگر کسی کے نصف بہتر اچھے سبھاؤ کا نہ ہو تو دیگر نصف کے لیے جینا محال ہو جاتا ہے۔''

پوری زندگی اسی موروثی گھر میں گزاری البتہ امام اثر کرائے پر سرائے کے علاوہ حسب ضرورت نقل مکانی کرتے ہوئے پٹنہ شہر اور دوسرے مقامات پر بھی رہے۔ لیکن آخری ایام میں گیا کے ایک مقام آبگلہ میں ایک جائداد خرید کر رہنے لگے تھے۔ کرائے پر سرائے میں ان کا آموں کا ایک وسیع باغ میں وہ آموں کی نسلوں پر تجربات کیا کرتے تھے اب بھی ان کی یادگار ہے اس خوبصورت باغ نے خاندانی سیرگاہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور جب تک ہم لوگ وہاں رہے اس کی حیثیت برقرار تھی۔ نواب امداد امام اثر کے صاحبزادگان کی اقامت گاہیں 'مریم منزل' اور رضوان پیلیس پٹنہ شہر میں واقع تھیں۔'' (بحوالہ: تعارف از سید قیصر امام ماخوذ از 'مکتوبات اختر امام')

افسوس اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے اور امام فیملی کے افراد منتشر ہو چکے ہیں۔ 'رضوان پیلیس' بھی فروخت ہو چکا ہے۔ سر علی امام امام کے صاحبزادے ٹوٹو امام کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور ان کی اولاد ہزاری باغ میں سکونت پذیر ہیں۔ 'نواب کوٹھی' آبگلہ (گیا) بھی نواب امداد امام اثر کی وفات کے بعد فروخت ہو چکی ہے۔

جناب سید عشرت امام نے لکھا ہے:

(1) ''والد صاحب (ڈاکٹر سید اختر امام) کا تعلق چونکہ گوتم بودھ کی سرزمین سے تھا۔ اس لیے وہ ان کی تعلیمات کا احترام کرتے تھے۔

(2) وہ مجھے بتاتے تھے کہ تم نے سنا ہے انسان اپنے عمل سے جانا جاتا ہے نہ کے ذات پات سے کہ وہ برہمن ہے یا کچھ اور یہی تعلیم ہمارے نبی کریمؐ نے دی ہے کہ نہ عرب وعجم پر فوقیت ہے کہ گورے کو کالے پر لیکن اگر فوقیت ہے تو تقویٰ اور عمل کی ہے۔''

(3) والد صاحب (ڈاکٹر سید اختر امام) نے اعلیٰ تعلیمی کمیشن کے رکن کی حیثیت میں کام کیا جس کے صدر پروفیسر J.E.Jaisuria تھے قانون واعلیٰ قانونی تعلیم پر اسلامی تعلیمات کی تیاری میں ان کا مشورہ ضرور حاصل کیا جاتا تھا۔

جسٹس سید عشرت امام جج ہائی کورٹ کولمبو (سری لنکا) نے اپنے ایک مضمون 'میرے والد مرحوم' میں لکھا ہے:

''سری لنکا کے سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر بدیع الدین محمود تھے جو میرے والد (ڈاکٹر سید اختر امام) کے علی گڑھ کے ساتھیوں میں تھے۔ ان کی دعوت پر سری لنکا آئے اور کولمبو میں واقع سیلون یونیورسٹی میں بحیثیت استاد عربی و فارسی تقرر ہوا۔

(4) 1947 میں میرے والد صاحب (ڈاکٹر سید اختر امام) کی دوسری شادی کینڈی کے مشہور قانون داں جناب ماریکا کی بڑی صاحبزادی منیرہ عالم سے ہوئی جن کے بطن سے میں (سید عشرت امام) پیدا ہوا۔''

(5) 1960 میں سری لنکا کی شہریت لے لی تھی اور کینڈی کے خوبصورت شہر میں آباد ہوئے۔ والد صاحب کو سری لنکا سے بہت پیار تھا اور اس کے جغرافیائی حسن کی یوں تعریف کرتے تھے کہ اگر جنت ہوتی تو یہیں ہوتی۔''

**حواشی:**


(1) بہار کی بہار مرتبہ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (مطبوعہ خدا بخش لائبریری پٹنہ 2010) صفحہ نمبر 16 تا 18

(2) رموز تحقیق (نیا ایڈیشن) ڈاکٹر سید شاہد اقبال (مطبوعہ روشناس پرنٹرس دہلی 6، 2017) صفحہ نمبر 146 تا 147

(3) سخنوران وطن مرتبہ ریاض گیاوی۔ (مطبوعہ تاج پریس باری روڈ گیا) 1985، صفحہ نمبر 48 تا 52

(4) شاخ بریدہ (جلد اول) مصنفہ سید شبر امام (مطبوعہ اے آر انٹر پرائزز دریا گنج نئی دہلی) 15-2014

(5) کاشف الحقائق / سید امداد امام اثر مقدمہ تلخیص۔ خالد حمید (مطبوعہ جے کے آفسٹ دہلی 2015) صفحہ نمبر 12 تا 13

(6) مکتوبات اختر امام مرتبہ ڈاکٹر سید قیصر امام۔ ناشر ادب نما کراچی (پاکستان) 2001

(7) نگار (ماہنامہ / کراچی) بابت اگست 1952 (ڈاکٹر سید اختر امام خطوط ڈاکٹر سید قیصر امام کے نام)

(8) وفیات ناموران پاکستان مرتبہ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ (ناشر اردو سائنس بورڈ لاہور 2006۔ صفحہ نمبر 408 / 829)


■


**Dr. S. Shahid Iqbal**
Astana-e-Haque, Road No.: 10
West Block, New Karimganj
Gaya - 823001 (Bihar)
Mob.: 09430092930, 9155308710
E-mail.: drsshahidiqbal@gmail.com

# کلامِ فراق پر فارسی کے لسانی اثرات

محمد زبیر

فراق کا شمار بیسویں صدی کے ان معدودے شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کو ایک نیا رخ دیا۔ ان کی ذہانت وفطانت اور نگاہِ نقد اعلا وارفع تھی۔ فراق کا یہ وصف خاص تھا کہ جب بھی مسائل علم وادب پر زبان کھولتے تو لفظ ومعنی کے ہزاروں موتی رول دیتے تھے۔

فراق سے قبل کئی شعرا نے فکر وخیال کی حیات بخش وسعت کو اپنی شاعری کا محور بنایا۔ فراق نے ان شعرا کی پیروی کرتے ہوئے اپنی شاعری کی شمع کو تیز کر کے نئے حالات وماحول کو نئے سیاسی وسماجی حالات کے پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ترقی پسندی، نئی حسیت اور روایتی کلاسکیت کے امتزاج سے اردو غزل کی روایات کو قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب رہے۔ انھوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی صالح اور مثبت قدروں کو اپناتے ہوئے اردو غزل کی روایت کے بطن سے ایک الگ اور منفرد راہ نکالی اور تادم مرگ اسی راہ پر گامزن رہے۔

فراق کی شاعری، ان کے افکار ونظریات، خیالات محسوسات اور بدلتے ہوئے زمانے کی کیفیات کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کا اسلوب اور طریقۂ اظہار جداگانہ ہے اور غزلیہ طرز اسلوب سے ذرا بھی ہٹتا نہیں ہے۔ ایجاز و اختصار ان کے کلام کی پہچان ہے۔ غزل کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے تصریح وتوضیح سے بھی کام لیا ہے۔

اردو شاعری میں جو لوچ اور لطافت اور جو رنگ وحسن ہے وہ سب فارسی کی دین ہے، اظہار جذبات کی صلاحیت، نزاکتِ خیال کے نمونے اور معنی آفرینی کی اچھی مثالیں اردو شاعری میں ملتی ہیں لیکن یہ سب وہی ہیں جن میں فارسی کا عنصر غالب ہے۔ اس بات سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ اردو زبان وادب کی ترقی کی راہ فارسی اور عربی زبان وادب سے استفادے پر ہی ہموار ہوئی ہے۔ فراق اپنی شاعری میں ہندوستانی عناصر اور تہذیب ضرور پیش کرتے ہیں لیکن فارسی الفاظ کا سہارا لیے بغیر آگے نہیں بڑھتے اور بعض مقامات پر فارسی وعربی تہذیب خود بخود در آتی ہے۔ اس سلسلے کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

وہ تبسم لب نازنیں، وہ بہار پیکرِ دل نشیں
وہی ادھ کھلی سی کلی کلی، وہی تازگی چمن چمن
شبنم کی دمک ہے کہ شب ماہ کی دیوی
موتی سر گلزار جہاں رول رہی ہے

ان مصرعوں میں ادھ کھلی، کلی کلی، دمک اور دیوی ذہن کو ہندوستانی عناصر کی طرف مبذول کراتے ہیں لیکن دیگر الفاظ تبسم، لب، نازنیں، بہار، پیکر، دل نشیں، شبنم، شب، ماہ، گلزار اور جہاں ذہن کو فارسی وعربی کی جانب موڑ دیتے ہیں۔ زبان سے ادا ہوتے ہی یہ الفاظ براہ راست ذہن و دماغ کو متاثر کرتے ہیں اور معنی ومفہوم کے لحاظ سے بھی کسی قسم کی کوئی الجھن پیدا نہیں ہونے دیتے۔

فراق نے انگریزی زبان وادب سے وابستگی کے سبب اس کی رومانی شاعری سے فیض اٹھایا ہے اور ساتھ ہی اردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری سے بھی استفادہ کیا ہے۔ فارسی شعرا کے خرمن سے خوشہ چینی کر کے فارسی الفاظ وتراکیب کے استعمال سے اپنی شاعری کو بہتر بنانے کی سعی کی ہے۔ ان کی غزلوں کے بعض اشعار پر کبھی بیدل، کبھی حافظ، کبھی عراقی ہمدانی اور کبھی رحیم خانخاناں کے فارسی اشعار کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر نریش چندر رقم طراز ہیں:

”فراق فارسی وعربی ادب وشاعری کی روایتوں میں پلے تھے۔ یہ روایتیں ان میں اس طرح سموگئی تھیں کہ انھیں فراق کے ذہن میں باطنی تحریک کا مرتبہ حاصل ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ تھا وہ محض خارجی، ایک ان کی طینت وسرشت کا جز بن چکی تھی، اور دوسری کو وہ اپنی کوششوں سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس بات کا نہایت قاطع ثبوت فراق کے حاشیوں سے ملتا ہے۔ اکثر حواشی میں فراق نے اپنے اشعار کی توضیح یا ان کے ماخذ کی طرف اشارہ کرنے کے لیے غالب کے، بیدل کے، رحیم خانخاناں کے فارسی اشعار نقل کیے ہیں...... میں نے ان میں کئی کئی بار ورق گردانی کی مگر کہیں بھی اس قسم کا حاشیہ نظر نہ آیا جس میں انھوں نے اپنے کسی شعر کا ماخذ کسی سنسکرت شاعر کے کلام میں بتایا ہو، میری فہم ناقص کے مطابق شاید ان کو ہندو کلچر اور خصوصاً سنسکرت شاعری پر اتنا عبور نہیں تھا جتنا فارسی شاعری پر۔“

(نیا دور فراق نمبر حصہ دوم، 1984، ص:37)

فراق نے نہ صرف فارسی شعرا کا مطالعہ کیا تھا بلکہ ان کے خیالات سے استفادہ بھی کیا تھا۔ جب ہم فراق کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ فراق نے اپنی شاعری میں فارسی شعرا کی پیروی کی ہے اور فارسی شاعری کے تمام لوازمات کے استعمال سے اپنی شاعری کے حسن کو دوبالا کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں کے متعدد اشعار میں فارسی شعرا کے تفکرات کا پرتو ملتا ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بیدل کا ایک فارسی شعر دیکھیں:

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمار ما
چہ قیامتے کہ نمی رسی زکنار ما بہ کنار ما

اس کی پیروی میں فراق کا یہ شعر دیکھیں:

ہم آہنگی بھی تیری دوریِ قربت نما نکلی
کہ تجھ سے مل کے بھی تجھ سے ملاقاتیں نہیں ہوتیں

عراقی ہمدانی کا ایک فارسی شعر:

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
زچشمِ مستِ ساقی وام کردند

اسی رنگ میں فراق کا یہ شعر:

نیرنگِ روزگار میں کیف دوام دیکھ
ساقی کی مست آنکھ سے گردش میں جام دیکھ

بیدل اور عراقی ہمدانی کے درج بالا اشعار کے مضامین کو فراق نے جس خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں کم نظر آتی ہے۔ فراق نے فارسی شعرا کی پیروی ضرور کی ہے لیکن ان کی تعبیر وتفسیر کو ہاتھ لگانے سے پرہیز کیا ہے۔ یہ پہلو فراق کو دوسرے شعرا سے ممتاز ونمایاں کرتا ہے۔

فراق نے اپنی شاعری میں جہاں ٹھیٹ ہندی الفاظ،

روزمرہ کے ٹکسالی بول اور محاوروں کا استعمال کیا ہے وہیں فارسی الفاظ وتراکیب کے خوب سے خوب تر کی جستجو کی ہے۔ فراق نے رامائن اور لوک گیتوں کے ساتھ فارسی زبان وادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یاں ہندی اور اردو کے ساتھ فارسی الفاظ وتراکیب کا اچھا امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندو دیومالائی عناصر کو خوب برتا ہے۔ فراق نے ہندو تہذیب اور فارسی وعربی روایت سے پیدا شدہ محاکات کو ذیل کے شعر میں دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے:

روپ کی جوت زیر پیراہن
گلستاں پر ردائے شبنم ہے

پہلے مصرع میں 'روپ کی جوت' اور دوسرے میں 'گلستاں' اور 'ردائے شبنم' مختلف تہذیبوں سے ماخوذ ہیں لیکن فراق نے ان ٹکڑوں کو ایک ہی شعر میں سمو کر دو مختلف تمدنوں کو نہ صرف یکجا کیا ہے بلکہ ان کے درمیان یکجہتی پیدا کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اس شعر میں روپ، سنسکرت اور جوت ہندی الفاظ ہیں جبکہ زیر، پیراہن، گلستاں اور شبنم فارسی الفاظ ہیں اور ردا عربی لفظ ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شعر میں ہندی اور سنسکرت کے صرف دو الفاظ آئے ہیں جبکہ عربی اور فارسی کے پانچ الفاظ اس خوبی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں کہ شعر میں حسن پیدا ہو گیا ہے۔

فراق نے اپنی شاعری میں اسالیب اور اظہار خیال کے بہت سے پیکروں کو فارسی سے مستعار لیا ہے۔ عربی الفاظ کے امتزاج اور ہندوی وفارسی الفاظ کی آمیزش سے نئی شعری تراکیب بھی وضع کیں جس سے اردو غزل کی لفظیات کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔ فراق نے اردو غزل میں اپنی ایک الگ راہ نکال کر احساس وادراک کے نئے پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ کلاسیکی دروبست نے ان کے اشعار کی چوٹ کو گہری اور دیرپا بنا دیا ہے۔ ان کی بعض غزلیں ایسی ہیں جس میں فارسی الفاظ وتراکیب کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار دیکھیں:

گجے باغ حسن عدن عدن گجے باغ حسن ختن ختن
تب وتاب روئے نمو نمو خم پیچ زلف سیاہ مو
بہ کمال جذب دل تپاں کبھی بدلے گردش آسماں
کوئی صبح روئے چمن چمن کوئی شام زلف شکن شکن
کوئی میری آنکھوں سے دیکھتا تری بزم ناز کی وسعتیں
وہ ہر ایک گوشہ مکاں مکاں وہ ہر ایک لمحہ زمن زمن
جسے ڈس لیا ہے زمانے نے کوئی زندگی ہے یہ زندگی
یہ سوادِ شام اجل نما یہ ضیا ، صبح کفن کفن
یہ اداس اداس یہ بجھی بجھی کوئی زندگی ہے فراق کی
مگر آج کشتِ سخنوری ہے اسی کے دم سے چمن چمن

ہر شاعر کا اپنا ایک اسلوب اور طرز ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے اس کا کلام، مختلف کیفیات اور رنگ وآہنگ میں ڈھلتا ہے۔ فراق کے کلام پر ہندوستان کے قدیم ترین ادب اور دیگر فنی کارناموں کے علاوہ عہد مغلیہ کی شاعری، ہندوستان کے سنگیت اور مزاج کے ساتھ بہترین فارسی، انگریزی کے نظم ونثر کا اور اشتراکیت کی فکریات قدیم وجدید کے مؤثرات اثر انداز ہوئے ہیں۔ انھیں شعرگوئی سے فطری مناسبت تھی اور ہندوستانی زبان کے ساتھ، فارسی زبان پر اچھی دسترس حاصل تھی۔ انھیں وجوہات سے ان کے یاں فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال کثرت سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس حوالے سے گوپی چند نارنگ رقم طراز ہیں:

''زبان کے بارے میں فراق کا ایک خاص نظریہ تھا۔ ان کی شاعری نے اپنا رس جس کھڑی بولی کے واسطے سے پراکرتوں کی صدیوں پرانی روایت سے لیا تھا، وہ فارسی جانتے تھے اور ان کے یہاں فارسی ترکیبوں کا خاصا استعمال ملتا ہے۔'' (ایوان اردو دہلی، مارچ 1997 ص:7)

اردو میں مختصر نگاری کے لیے ایک مجبوری یہ ہے کہ حروف صلہ اور روابط کی وجہ سے فارسی کی نسبت فکر و خیال کو اختصار کے ساتھ ادا کرنا مشکل ہے اس لیے کہ اردو کے حروف اضافت 'کا'، 'کی'، 'کے'، 'را'، 'ری'، 'رے' اور 'نا'، 'نی'، 'نے' بہت جگہ لیتے ہیں جبکہ فارسی میں صرف صوتی اضافت سے کام چل جاتا ہے جس کی وجہ سے اس میں جو خیال دو الفاظ میں ادا ہو جاتا ہے وہ اردو کے چار الفاظ میں بھی ادا نہیں ہو پاتا۔ اردو کے تقریباً تمام بڑے شعرا نے ان تراکیب کو اپنی شاعری میں برتا ہے جن میں غالب اور مومن کا نام سرفہرست ہے۔ فراق کے یاں بھی اس قسم کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دم بدم شبنم و شعلہ کی سی لوئیں
سر سے پا تک بدن گلستاں گلستاں
انگڑائیاں صبحوں کی سر عارض تاباں
وہ کروٹیں شاموں کی سر کاکل پیچاں

ان میں دم بدم، شبنم، سر، گلستاں، پا، تاباں (محبوب کے چہرے کی کیفیت اور رنگت) شام، کاکل، پیچاں (بل کھایا ہوا) فارسی الفاظ ہیں۔ فراق نے ان فارسی الفاظ کی مدد سے عشق، جمالیات اور عصری آگہی کے تصورات کو جس چابک دستی اور فنکاری سے پیش کیا ہے وہ فراق کی اپنی زندگی کے نشیب وفراز کا اشاریہ ہیں۔ یہاں فارسی الفاظ کے ساتھ فارسی تراکیب بھی استعمال کی گئی ہیں۔ دم بدم شبنم، بدن گلستاں گلستاں، سر عارض تاباں اور سر کاکل پیچاں وغیرہ فارسی تراکیب کے زیر اثر استعمال ہوئے ہیں۔ ان سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ فراق نے اپنی شاعری میں فارسی سے کافی حد تک استفادہ کیا ہے۔ ان الفاظ وتراکیب کو فراق نے اپنی شاعری میں اس خوبی سے برتا ہے کہ ان پر فارسی کا گمان نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اردو کی اپنی وضع کردہ تراکیب معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اردو کا اختصاص رہا ہے کہ اس نے دیگر زبانوں (خصوصاً عربی وفارسی) سے الفاظ وتراکیب اخذ کر کے اپنے حسن کو نکھارنے اور سنوارنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں جہاں کہیں فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال ہوا ہے، وہاں اس کی دل کشی اور شیرینی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

فراق کے یہاں اس انداز کے اشعار کثرت سے مل جاتے ہیں جو فکر اور جذبے کے امتزاج کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی عشقیہ شاعری میں بھی تفکرانہ خیال اور جذبے کی صداقت کی کارفرمائی پورے طور سے نمایاں ہوتی ہے۔ فراق اپنی شاعری میں رمز و ایما، عجمی اور ہندوستانی تہذیب کے واسطے سے داخل کرتے ہیں یہ ان کے فن کو ایک معیار عطا کرتے ہیں، جو دراصل ہند ایرانی جمالیات کا پرتو ہوتا ہے:

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو
کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا، کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

اسی طرح ان اشعار میں نکہت، زلف، پریشاں، داستان، شام، انداز، قفس، پرواز اور سا فارسی الفاظ ہیں۔ لفظ 'سا' نور کے ساتھ آ کر اس شعر کے مفہوم کو دو چند کر دیا ہے۔ فارسی میں لفظ 'سا' (مصدر سائیدن کا امر) حرف تشبیہ، مثل اور مانند کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نور، فضا اور حسرت یہ تینوں الفاظ عربی سے اردو میں در آئے ہیں۔ یہاں اصل کمال لفظ 'نور' کے ساتھ 'سا' کا ہے جو حرف تشبیہ بمعنی طرح یا جیسا کے لیے استعمال ہوا ہے۔

کلام فراق کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کا خاصا حصہ فارسی سے متاثر ہے۔ باوجود اس کے کلام فراق کو فارسی کا وجود ظلی نہیں کہا جاسکتا لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ انھوں نے فارسی کے معدن سے حسب ضرورت لعل وگہر حاصل کر کے اپنی شاعری کے چمن میں عمدہ گلکاریاں کی ہیں۔

■

**Dr. Mohammad Zubair**
Dept of Urdu, University of Mumbai
Kalina, Santacruz (E)
Mumbai - 400098 (MS)

ماجد قاضی

# ممبئی کی موجودہ ادبی صورتِ حال

**ہندوستان میں اردو کے بہت سے گھوارے اور مراکز ہیں جہاں سے اردو کے رسائل و اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اردو کے اسکول بھی ہیں اور ان علاقوں میں تخلیقی فنکار بھی متحرک و سرگرم ہیں۔ انجمنیں اور ادارے بھی ہیں جن سے لوگ واقف ہیں مگر بہت سے علاقے ایسے ہیں‌جہاں اردو کی انجمنیں، لائبریریاں ہیں اور بہت سے فنکار بھی ہیں جن سے اردو دنیا مکمل طور پر واقف نہیں ہے اور نہ ہی نئی نسل کو اس کے بارے میں کچھ پتہ ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ہندوستان کی تمام ریاستوں اور اضلاع میں اردو کی صورت حال کے حوالے سے ایک سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ مختلف علاقوں میں اردو زبان کا حال کیا ہے؟**

**قارئین اور قلم کاروں سے التماس ہے کہ وہ اپنے علاقے کی انجمنوں، اداروں ،لائبریریوں‌اور دیگر ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے اپنی تحریریں ماہنامہ ’اردو دنیا‘ کو ارسال کریں۔ یہ تخلیقات ترجیحی طو رپر رسالے میں شامل کی جائیں گی۔**

**(ادارہ)**

کسی علاقے کی ادبی صورتِ حال کا اندازہ لگانے کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر غور کیا جاسکتا ہے:

1. اس علاقے میں تخلیقِ ادب کا معیار و مقدار
2. وہاں سے شائع ہونے والے ادبی رسائل
3. اس علاقے کے اخبارات کے ادبی صفحات اور ان صفحات پر چھپنے والی نگارشات و روداد یں
4. وہاں کی درس گاہوں میں منعقد ہونے والی ادبی و لسانی سرگرمیاں، ادبی تقریبات، سمینار اور سمپوزیم وغیرہ
5. سرکاری و غیر سرکاری اداروں اور انجمنوں کی جانب سے عوامی سطح پر منعقد ہونے والے ادبی پروگرام اور جلسے جن میں کتابوں کی تقریبِ رونمائی، بیرونی ادیبوں اور شاعروں کے اعزاز میں کی جانے والی ادبی نشستیں، بزرگ شاعروں و ادیبوں کی خدمات کے اعتراف میں منعقد ہونے والے پروگرام اور یادگاری خطبے وغیرہ شامل ہیں
6. عوامی کتب خانوں کی تعداد، اُن میں ادبی کتب و رسائل کا ذخیرہ اور وہاں کے قارئین کی تعداد و ترجیحات، کتب خانوں میں کتابوں کی دیکھ ریکھ کے انتظامات وغیرہ
7. ادبی کتب و رسائل کی اشاعت اور فروخت اور اُن کے لیے درکار اشاعتی ادارے اور دکانوں کی تعداد
8. اعلیٰ تعلیم کی درس گاہوں یعنی کالج اور یونیورسٹی میں پڑھایا جانے والا نصاب، ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کے لیے لکھے جانے والے مقالے، ان کے موضوعات اور تحقیقی معیار
9. غیر سرکاری تحقیقی ادارے اور ادبی و لسانی تحقیقات کے لیے دیے جانے والے وظائف و دیگر سہولیات
10. نجی محفلوں اور چائے خانوں میں ہونے والے ادبی مذاکرے، مباحثے اور غیر رسمی گفتگو میں شعر و ادب کے چرچے

ممبئی کو ملک کی معاشی راج دھانی کہا جاتا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے اس کا شمار دنیا کے گنجان ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ ملک کی ہر ریاست کا فرد یہاں موجود ہے اور یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ملک کے ہر حصّے میں بولی جانے والی زبان کے الفاظ یہاں کان میں پڑتے ہیں۔ اردو زبان کی بنیادی تعلیم وتدریس کے انتظامات بھی یہاں ملک کے دوسرے علاقوں سے بہت بہتر ہیں۔ یہاں کے عوامی کتب خانوں کا جائزہ لینا بھی دل چسپی سے خالی نہیں۔ انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور کریمی لائبریری میں اردو کتابوں، مخطوطات اور اخبارات ورسائل کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ انجمنِ اسلام کے یہ دونوں ادارے اردو زبان و ادب کی خدمت میں لگے ہیں۔ اگر چہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خود اردو والے اُن سے اُس درجہ مستفید نہیں ہوتے، جتنا ہونا چاہیے۔ شمیم طارق کی تصنیف ’انجمن اسلام اور اس کی کریمی لائبریری‘ میں ان دونوں اِداروں سے متعلق تمام ضروری تفصیلات موجود ہیں۔ کریمی لائبریری کے تحت شمیم طارق ہر سال تین روزہ آل انڈیا مقابلۂ دینیات منعقد کرتے ہیں جس میں پرائمری اسکول سے لے کر گریجوشن کرنے والے طلبہ، بلکہ ان کے اساتذہ تک کے لیے تحریری و تقریری مقابلے ہوتے ہیں، ملک کی مختلف ریاستوں سے طلبہ و اساتذہ شرکت کرتے ہیں، شہر و اطراف سے ادب، تعلیم اور صحافت کے میدان سے تعلق رکھنے والی مقتدر شخصیات شریک ہوتی ہیں اور یہ سمجھیے کہ شہر میں تین روزہ علمی و ادبی میلہ لگا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کریمی لائبریری میں بہت ہی سنجیدہ اور منفرد عنوانات پر مذاکرے، نمائش اور سیمینار وغیرہ بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔

انجمنِ اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈاریکٹر ڈاکٹر عبدالستار دلوی ہیں جو اردو میں تحقیق کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ انسٹی ٹیوٹ ہر سال مصطفٰے فقیہ یادگاری لیکچر کا اہتمام کرتا ہے جس میں ملک کی کسی قد آور علمی شخصیت کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سال بھر میں دو تین پروگرام ایسے ضرور منعقد ہوتے ہیں جو علم و ادب اور تحقیق سے دل چسپی رکھنے والوں کو انجمن کے تاریخی ہال تک کھینچ لاتے ہیں۔ انجمن اسلام ریسرچ

انسٹی ٹیوٹ سے ایک سہ ماہی رسالہ 'نوائے ادب' ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اسے 1950 میں سید ظہیر الدین مدنی اور ڈاکٹر نجیب اشرف ندوی نے جاری کیا تھا۔ طویل عرصے تک نوائے ادب واقعتاً ایک باوقار علمی رسالہ تھا جس میں خالص علمی و تحقیقی مواد پر مشتمل مقالات شائع ہوتے تھے، وقفۂ اشاعت بھی ششماہی تھا۔ اب حالات کے تحت نوائے ادب کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔

ممبئی کا ایک بہت اہم کتب خانہ، شہر کی تاریخی جامع مسجد میں واقع ہے۔ اس کا نام کتب خانہ محمدیہ ہے اور اس میں اردو، فارسی اور عربی کتب اور مخطوطات کا نادر ذخیرہ اور قدیم اردو اخبارات و رسائل کی مجلد فائلیں موجود ہیں۔ ان کتابوں کے ڈیجیٹلائیزیشن کا کام بڑی حد تک مکمل ہو چکا ہے۔ کتب خانہ محمدیہ میں عام قارئین کے مطالعے کے لیے ایک وسیع ہال موجود ہے جہاں زیادہ تر قارئین اخبار بینی میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی اس کتب خانے میں بہتر سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ شہر میں نہایت خاموشی سے کام کرنے والا، ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا ایک مرکز، عوامی ادارہ لائبریری ہے۔ یہ کتب خانہ ترقی پسند تحریک کی باقیات الصالحات میں سے ہے۔ یہاں بھی عام قارئین کے لیے ایک وسیع ہال ہے اور کتابوں کی دیکھ ریکھ اور حفاظت کے انتظامات قابل ستائش ہیں۔ کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے اور ممبران کو برائے نام سالانہ فیس ادا کرنی ہوتی ہے۔ کتاب جاری کرنے پر معمولی یومیہ فیس چارج کی جاتی ہے۔ تعطیلات میں طلبہ کو مطالعے کی طرف راغب کرنے کے لیے مختلف تعلیمی مقابلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ شہر کے مغربی کنارے پر ساحل سمندر سے قریب ہندستانی پرچار سبھا کی عمارت ہے۔ گاندھی جی کے لسانی نظریات کو فروغ دینے والا یہ ادارہ اپنے آپ میں بہت فعال ہے۔ اس کے تحت 'ہندستانی' کے نام پر اردو اور ہندی کی کلاسیں چلائی جاتی ہیں۔ یہیں سے 'ہندستانی زبان' نامی سہ ماہی پرچہ اردو اور ہندی میں الگ الگ شائع ہوتا ہے۔ پہلے یہ پرچہ دونوں زبانوں میں ایک ساتھ چھپتا تھا۔ ہندستانی پرچار سبھا کی اپنی لائبریری ہے اور اس میں بلاشبہ زبان اردو کی اہم کتابیں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ہر سال اردو کتب کی خریداری کے لیے بجٹ طے ہوتا ہے۔ یہاں غیر اردو داں طبقے کے لیے بنیادی اردو سکھانے کا انتظام ہے اور اس سرٹیفکٹ کورس میں بڑی تعداد میں غیر مسلم نوجوان طلبہ داخلہ لیتے ہیں۔ بطور خاص وہ لڑکے لڑکیاں جنھیں تھیٹر اور فلم انڈسٹری میں اپنا مستقبل تلاش کرنا ہوتا ہے۔ ہندستانی پرچار سبھا کی لائبریری اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بڑی نعمت ہے۔

> ممبئی کا ایک بہت اہم کتب خانہ، شہر کی تاریخی جامع مسجد میں واقع ہے۔ اس کا نام کتب خانہ محمدیہ ہے اور اس میں اردو، فارسی اورعربی کتب اور مخطوطات کا نادر ذخیرہ اور قدیم اردو اخبارات و رسائل کی مجلد فائلیں موجود ہیں۔ ان کتابوں کے ڈیجیٹلانیزیشن کا کام بڑی حد تک مکمل ہوچکاہے۔ کتب خانہ محمدیہ میں عام قارئین کے مطالعے کے لیے ایک وسیع ہال موجود ہے جہاں زیادہ تر قارئین اخباربینی میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی اس کتب خانے میں بہتر سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ شہر میں نہایت خاموشی سے کام کرنے والا، ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کاایک مرکز، عوامی ادارہ لائبریری ہے۔

ترقی پسند تحریک کا تنظیمی زوال 1960 کے آس پاس شروع ہوا لیکن اس کی فکر زندہ تھی اور اس سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں نے سوویت یونین روس کے ٹوٹنے بکھرنے تک اشتراکیت سے عہد و پیمان باندھے رکھے۔ ممبئی میں ان کی محفلوں سے تربیت یافتہ نوجوانوں نے جب قلم اُٹھایا تو افسانے سے کہانی غائب ہو رہی تھی اور علامت نگاری، ابہام اور سرّیت کو فن کی معراج سمجھا جا رہا تھا۔ سریندر پرکاش، سلام بن رزّاق، انور خان، انور قمر اور سیّد محمد اشرف وغیرہ 1970 کے بعد ممبئی میں افسانہ نگاری کی پہچان بن کر ابھر رہے تھے۔ ابھی ان افسانہ نگاروں کا تخلیقی سفر جاری تھا کہ پھر غلغلہ اُٹھا کہ کہانی واپس آ رہی ہے، افسانے میں بیانیہ مضبوط ہو رہا ہے اور ترسیل فکر اور اظہار ذات کے لیے قاری اساس ادب کی تخلیق ناگزیر ہے۔ سریندر پرکاش اور انور خان، افسانوی ادب میں اپنا یوگ دان دے کر دنیا سے چلے گئے، سیّد محمد اشرف کا تبادلہ ممبئی سے اتر پردیش کے کسی شہر میں ہوا۔ علی امام نقوی اور ساجد رشید بھی اس بزم کو سونی کر گئے۔ فی زمانہ سلام بن رزاق اور انور قمر، ممبئی میں افسانہ نگاروں کے روایتی بزرگ کا مرتبہ پا کر ادبی نشستوں کی صدارت کر رہے ہیں۔ ان کے بعد کی نسل کے افسانہ نگاروں میں مقدر حمید، م۔ ناگ اور مشتاق مومن، مظہر سلیم، مقصود اظہر، اشتیاق سعید وغیرہ کے نام لیے جائیں گے جنھوں نے ممبئی میں افسانہ نگاری کی روایت کو نہ صرف توانائی بخشی بلکہ نئے موضوعات اور نئی تکنیک برتی اور افسانے پر جمود طاری ہونے نہیں دیا۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنی محفلوں میں اگلی نسل کی تربیت کا فریضہ بھی ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس کی عمدہ مثال مظہر سلیم تھے، جن کے پاس کہانی تھی لیکن میڈیم کمزور تھا، مسلسل مشق اور حوصلہ افزائی نے مظہر سلیم کو آگے بڑھایا اور ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'اپنے حصّے کی دھوپ' کے مقابلے میں آخری مجموعے 'مٹھیاں' کے افسانے زبان و بیان اور ٹریٹمنٹ، ہر اعتبار سے انھیں 21ویں صدی کے پہلے پندرہ برسوں میں ممبئی کا نمائندہ افسانہ نگار تسلیم کرواتے ہیں۔ مقصود اظہر کا پہلا افسانوی مجموعہ 'کشتی' 1997 میں شائع ہوا تھا۔ 2014 میں ان کا دوسرا مجموعہ 'صدیوں پر محیط لمحہ' چھپا۔ ان کی کہانیاں شہر کی بھاگتی دوڑتی زندگی اور ملازمت پیشہ افراد کے دفتری و خانگی مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ مختصر افسانہ نویسی اور افسانچہ نویسی میں عبدالعزیز خان اپنی شناخت بنانے میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر سلیم خان نے علم کیمیا میں کسی موضوع پر تحقیق کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے لیکن اردو زبان و ادب اور صحافت اُن کی شناخت بنتی جا رہی ہے۔ اُن کا شمار بہترین سیاسی مبصرین میں ہوتا ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'حصار' اور 'محمود و ایاز' شائع ہوئے ہیں۔ ممبئی کے ادبی حلقوں میں ڈاکٹر سلیم خان کے موضوعات اور اسلوب پر گفتگو ہو رہی ہے۔ صادقہ نواب سحر اگرچہ کھوپولی میں رہتی ہیں لیکن ممبئی کی ادبی دنیا کا ایک معروف نام بنتی جا رہی ہیں۔ اُن کے افسانوی مجموعے 'خلش بے نام سی' کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اشتیاق سعید کا افسانوی مجموعہ 'بل جوتا' شائع ہوا ہے۔

ممبئی کا المیہ رہا کہ اس شہر ہزار چہرہ کے پس منظر میں اب تک کوئی بڑا ناول اردو میں نہیں لکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ قوموں کا تخیّل ان کی شاعری میں اور تہذیب ان کے ناولوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ کرشن چندر کے ناول ممبئی کی یک رخی تصویر پیش کرتے ہیں جن میں حقیقت سے زیادہ مصنف کی فنتاسی کام کرتی ہے۔ افسانوں میں زندگی کے حقیقی رنگ تو دکھائے جا سکتے ہیں لیکن جس سطح پر

ناول میں تہذیب وتمدن اور فلسفۂ زندگی پیش کیا جاتا ہے، اس کو افسانوی کینوس پورا نہیں کر سکتا۔ یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ممبئی میں بیٹھ کر بڑے ادیبوں نے کچھ اچھے ناول ضرور لکھے ہیں مگر ممبئی کی ادبی فضا کسی بڑے ناول کے لیے سازگار نہ ہو سکی۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی، عادل رشید اور خواجہ احمد عباس وغیرہ نے بھی اس میدان میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ مختصر ناولوں میں بیدی کا ایک چادر میلی سی اور سید محمد اشرف کا ناول نمبر دار کا نیلا قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن دونوں ناولوں میں ممبئی موجود نہیں ہے۔ نئی نسل کے ادیبوں میں ناول نگار کے طور پر رحمان عباس کا نام تیزی سے اُبھر رہا ہے۔ 2004 سے اب تک اُن کے چار ناول شائع ہوئے ہیں اور ہر ناول تنازعہ کا شکار ہوا ہے۔ 'نخلستان کی تلاش'، 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'، 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' اور 'روحزن'۔ ناول کے میدان میں ڈاکٹر سلیم خان کی زود نویسی عروج پر ہے۔ اب تک ان کے بارہ ناول پچھلے چند برسوں میں شائع ہوئے ہیں۔ زر پرست سر پرست، سکندر کا مقدر، تابوت، رشتے ناطے، آتش صلیب، وہم زاد جیتو جلاد، بھیڑیا بھیڑیا، راج دھانی ایکسپریس، بیم ورجا، فقرو غنا، مہر و وفا، اور قلندر نما بندر (طنزومزاح)۔ ان ناولوں کی ادبی حلقوں میں زیادہ پذیرائی نہیں ہوئی، لیکن انھیں یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ صادقہ نواب سحر کا پہلا ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' 2008 میں شائع ہوا تھا۔ 2016 میں ان کا دوسرا ناول 'جس دن سے' منظرِ عام پر آیا ہے۔

اس ناول کا آغاز ممبئی شہر سے ہوتا ہے لیکن کہانی مہاراشٹر کے دوسرے شہروں کا سفر کرتی ہے۔

سوانح اور خاکہ نگاری میں سرزمینِ ممبئی کچھ زیادہ زرخیز ثابت نہیں ہوئی ہے۔ یوسف ناظم اور انور ظہیر خان (مت سہل ہمیں جانو) کے بعد یہ میدان تقریباً خالی پڑا تھا۔ البتہ حالیہ چند برسوں میں شائع ہونے والی چار کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ شخصی مضامین پر مشتمل سلام بن رزاق کی کتاب 'تذکرے'، موضوعات سے ان کی ملاقاتوں اور مراسم کا ذکرِ خیر ہے۔ ندیم صدیقی اس میدان میں کارنامہ انجام دے گئے ہیں۔ ان کی کتاب 'پُرسہ' اپنے دل کش اسلوب اور دھلی دھلائی شگفتہ نثر کے لیے برسوں یاد رکھی جائے گی۔ تیسری اہم کتاب جاوید صدیقی کے خاکوں کا مجموعہ 'روشن دان' ہے۔ روشن دان کے مضامین خاکے کم، افسانے زیادہ معلوم ہوتے ہیں لیکن زبان وبیان کا حسن، اپنے لٹے ہوئے تہذیبی سرمائے کا ماتم اور کھوئے ہوؤں کی جستجو نے جاوید صدیقی کے بیانیہ کو جادو اثر بنا دیا ہے۔ عالم ندوی کے خاکے ابھی کتابی شکل میں نہیں آئے۔ انھوں نے ممبئی کے مشاہیرِ ادب کو موضوع بنایا ہے۔ علی سردار جعفری، ظ۔ انصاری، یوسف ناظم، ساجد رشید، الیاس شوقی پر اُن کے خاکے ادبی رسالوں میں چھپے ہیں اور انھیں پڑھ کر بلا تامل عالم ندوی کی شگفتہ تحریر اور حسنِ بیان کی داد دی جا سکتی ہے۔ انھیں واقعہ نگاری پر بھی دست رس حاصل ہے۔

ممبئی میں اردو تھیٹر اور اسٹیج ڈراما سے بطور اداکار وابستہ ہونے والوں میں غیر مسلم نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ دراصل وہ اس راستے ٹی۔ وی سیریلز اور فلم انڈسٹری تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ نادرہ ظہیر ببر (ایکجوٹ تھیٹر گروپ)، اقبال نیازی (کردار آرٹ اکیڈمی) اور مجیب خان (آئیڈیل آئیڈیل ڈراما اینڈ انٹرٹینمنٹ اکیڈمی) اپنے اپنے کمرشیل ڈراما گروپ کے ساتھ خاصے مصروف ہیں اور ممبئی کے علاوہ دیگر شہروں میں بھی ان کے شو منعقد ہوتے ہیں۔

نہرو سینٹر نے اپنے ڈراما فیسٹیول کو زندہ رکھا ہے اور سال میں ایک مرتبہ یہاں ہفتے بھر کا میلہ لگتا ہے جس میں ملک کے طول وعرض سے مختلف زبانوں کے ڈراما گروپ شامل ہوتے ہیں۔ جہاں تک ادبی ڈراموں کی تحریر کا سوال ہے، ممبئی کے کم ادیبوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ساجد رشید اور سلام بن رزاق کے علاوہ، جنھوں نے وقتاً فوقتاً کچھ ڈرامے تحریر کیے ہیں، ماضی قریب کی ایک مثال نور العین علی کی ہے جن کے ڈراموں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ 'بہو کی تلاش'، 'وہ بولتے نہیں' اور 'کینسر' وغیرہ کے ڈراموں میں مسلم گھرانوں کے معاشی وتہذیبی مسائل، تصورات وتوہمات اور رسم ورواج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ معروف فلم اسکرپٹ رائٹر جاوید صدیقی، اپٹا کے پُرانے رکن ہیں اور انھوں نے واقعی سنجیدگی سے ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ تمھاری امرتا، سال گرہ، بیگم جان، آپ کی سونیا، کچے لمحے، دھواں پت جھڑ سے ذرا پہلے، مائی کے کھارے، پیلے پتوں کا بن، موگرا، وہ لڑکی، اور اگلے سال، شیام رنگ اور کاٹے ہوئے راستے وغیرہ میں سماجی مسائل کو سلیقے سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم نام اسلم پرویز کا ہے، جنھوں نے بچوں کے لیے ایک فل لینتھ ڈرامہ 'پکنک' سے ابتدا کی تھی اُس کے بعد ان کے طبع زاد ڈراموں کا مجموعہ 'پنکھ ہوتے تو...' منظرِ عام پر آیا۔ سات ون ایکٹ پلے پر مشتمل اُن کے ڈراموں کا تیسرا مجموعہ 'ملتے ہیں بریک کے بعد' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اسلم پرویز نے منٹو کے افسانوں کو بھی ڈراموں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ منٹو پر اُن کی دو کتابیں 'آپ کا منٹو' (منٹو کے خطوط) اور 'منٹو اور چچا سام' بھی شائع ہو چکی ہیں۔ صادقہ نواب سحر کے ڈراموں

"ممبئی میں اردو تھیٹر اور اسٹیج ڈراما سے بطور اداکار وابستہ ہونے والوں میں غیر مسلم نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ دراصل وہ اس راستے ٹی۔وی سیریلز اور فلم انڈسٹری تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ نادرہ ظہیر ببر (ایکجوٹ تھیٹر گروپ)، اقبال نیازی (کردار آرٹ اکیڈمی) اور مجیب خان (آئیڈیا آئیڈیل ڈراما اینڈ انٹرٹینمنٹ اکیڈمی) اپنے اپنے کمرشیل ڈراما گروپ کے ساتھ خاصے مصروف ہیں اور ممبئی کے علاوہ دیگر شہروں میں بھی ان کے شو منعقد ہوتے ہیں۔"

کا مجموعہ 'لمحوں کے درمیان' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

تحقیق و تنقید کے باب میں ممبئی کا پایہ بہت بلند نہیں، لیکن صورت حال مایوس کن بھی نہیں ہے۔ اس شہر میں ظ۔ انصاری، علی سردار جعفری، اور باقر مہدی جیسے سکہ بند نقادوں نے شعروادب کی تفہیم کی ہے اور ادبی محاکمے کیے ہیں۔ فی زمانہ یہاں تنقیدی میدان میں اپنی مستقل شناخت بنانے یا کم از کم اپنی موجودگی درج کرانے میں کام یاب ناقدین کی تعداد بہت زیادہ نہیں، پھر بھی کسی ایک شہر میں فضیل جعفری، شمیم طارق، پروفیسر یونس اگاسکر، پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، الیاس شوقی اور اسلم پرویز کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ الیاس شوقی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'ادب فہمی' اسی سال شائع ہوا ہے۔ پروفیسر یونس اگاسکر نے مرزا غالب کے اشعار پر غور وفکر کرنے کا کام شروع کیا ہے اور مختلف شارحین غالب، بطور خاص نظم طباطبائی سے اُن کے اختلافات لائق مطالعہ ہیں۔ ممبئی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے تحت، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے ضمن میں ہونے والے تحقیقی کاموں سے متعلق کچھ کہنا ممکن نہیں کہ سب کچھ پردۂ خفا میں ہے۔ ان میں سے چار پانچ مقالے اتفاقاً راقم کی نظر سے گزرے ہیں جنھیں دیکھ کر موضوع ومعیار سے متعلق اچھی رائے قائم نہیں ہوسکی۔

ڈاکٹر مزمل سرکھوت کا ایم فل کا مقالہ 'آغا حشر کاشمیری اور ممبئی کا پارسی اردو تھیٹر' شائع ہوا ہے، کہنا چاہیے کہ ایم فل کی سطح پر کم ہی مقالے اتنی محنت سے تیار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مزمل نے شہر ممبئی کی ادبی تاریخ کے اہم باب کو محفوظ کیا ہے۔

تحقیق و تنقید کے باب میں ممبئی کا پایہ بہت بلند نہیں، لیکن صورت حال مایوس کن بھی نہیں ہے۔ اس شہر میں ظ۔انصاری، علی سردار جعفری، اور باقر مہدی جیسے سکہ بند نقادوں نے شعروادب کی تفہیم کی ہے اور ادبی محاکمے کیے ہیں۔ فی زمانہ یہاں تنقیدی میدان میں اپنی مستقل شناخت بنانے یا کم از کم اپنی موجودگی درج کرانے میں کام یاب ناقدین کی تعداد بہت زیادہ نہیں، پھر بھی کسی ایک شہر میں فضیل جعفری، شمیم طارق، پروفیسر یونس اگاسکر، پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، الیاس شوقی اور اسلم پرویز کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ممبئی میں مراٹھی سے اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت خاصی مضبوط ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر یونس اگاسکر، پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، خالد اگاسکر، سلام بن رزاق، رام پنڈت، محمد حسین پرکار، وقار قادری کے بعد اس افق پر قاسم ندیم کا نام اُبھرتا ہے جو اب تک مراٹھی ادب سے بہت پیارا انتخاب اردو میں منتقل کر چکے ہیں۔ قاسم ندیم کی تین کتابیں 'اذان' (مراٹھی افسانوں کا انتخاب)، 'مجھے گھر چاہیے، گھر' (عصری مراٹھی خواتین کے افسانے) اور 'وینا پانی مہاتق کے پندرہ افسانے' شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی سے بھی کہانیاں اردو میں منتقل کی ہیں۔ اُن کی کتابیں 'دوسری زندگی' (نوبل انعام یافتہ فکشن نگاروں کے افسانے) اور 'حروف اور بدن' (بین الاقوامی افسانہ نگاروں کے افسانے) انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ قاسم ندیم، عصری مراٹھی شاعری کو اردو میں منتقل کرنے کا کام بھی کر رہے ہیں۔ ان کے ان لائق ستائش کاموں پر انھیں مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی سے ایوارڈ بھی ملا ہے۔ ڈاکٹر غلام نبی مومن نے خواتین ہندی افسانہ نگاروں کی منتخب کہانیوں کو اردو قالب میں پیش کیا ہے۔ ان کی تین کتابیں شائع ہوئی ہیں: دھنک، گہری جڑیں اور چل خسرو گھر آپنے۔ اپنی تیسری کتاب میں انھوں نے کہانی کاروں کا تعارف پیش کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔

ممبئی میں شعروادب کی محفلیں خوب جمتی ہیں اور مقامی، صوبائی، آل انڈیا اور عالمی مشاعرے برپا کرنے میں سیاسی پارٹیاں اور سرکاری و نیم سرکاری انجمنیں اور ادارے ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ ان مشاعروں کے معیار اور کردار پر سوال بھی اٹھتے رہتے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں سے ایک معیاری مشاعرہ نہرو سینٹر پر باقاعدگی سے منعقد ہوتا ہے جس میں ہند و پاک کے معروف شعرا بلائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ممبئی یونیورسٹی اور مہاراشٹر کالج میں بھی صاف ستھری شعری نشستیں منعقد ہوتی ہیں۔ ممبئی میں فضیل جعفری، رفیعہ شبنم عابدی، افتخار امام صدیقی، حسن کمال، شمیم طارق، شمیم عباس، احمد وصی، یعقوب راہی، ندیم صدیقی، عبدالاحد ساز، ارتضی نشاط، اعجاز ہندی، ابراہیم اشک اور شعور اعظمی جیسے کہنہ مشق شعرا موجود ہیں۔ لیکن اب ان میں سے زیادہ تر نے نام ونمود اور شہرت سے بے نیازی اختیار کر لی ہے، انھیں اپنے نئے شعری مجموعے چھاپنے چھپوانے میں کوئی دل چسپی نہیں۔ ممبئی کی شعری فضا میں فی الحال شاہد لطیف، ڈاکٹر قاسم امام، عالم ندوی، عرفان جعفری، عبید اعظم اعظمی، قمر صدیقی، حامد اقبال صدیقی وغیرہ سے کچھ رونق قائم ہے۔

ممبئی میں شعر و ادب کی محفلیں خوب جمتی ہیں اور مقامی، صوبائی، آل انڈیا اور عالمی مشاعرے برپا کرنے میں سیاسی پارٹیاں اور سرکاری و نیم سرکاری انجمنیں اور ادارے ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ ان مشاعروں کے معیار اور کردار پر سوال بھی اٹھتے رہتے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں سے ایک معیاری مشاعرہ نہرو سینٹر پر باقاعدگی سے منعقد ہوتا ہے جس میں ہند و پاک کے معروف شعرا بلائے جاتے ہیں۔

اردو کے عام قارئین اخبارات و رسائل سے ہی اپنے ذوق مطالعہ کی تسکین کرتے ہیں۔ ممبئی اس معاملے میں بھی صوبۂ مہاراشٹر کے دوسرے شہروں سے آگے ہے۔ یہاں سے چھ روزانہ اخبارات شائع ہوتے ہیں: انقلاب، ہندستان، اردو ٹائمز، صحافت، راشٹریہ سہارا اور ممبئی اردو نیوز۔ لیکن یہاں کی صحافتی دنیا کا یہ بہت تاریک پہلو ہے کہ اس شہر سے کوئی قابل ذکر ہفت روزہ اخبار نہیں نکلتا۔ یہاں سے شائع ہونے والے ادبی رسالوں کی فہرست درج ذیل ہے:

ماہنامہ شاعر (اجرا 1930 آگرہ) مدیر: افتخار امام صدیقی،

نوائے ادب (اجرا 1950) مدیر: عبدالستار دلوی

سہ ماہی ہندستانی زبان (اجرا 1969) مدیر: سیّد علی عباس، سہ ماہی ترسیل (اجرا 1993) مدیر: ڈاکٹر یونس اگاسکر،

سہ ماہی اردو چینل (اجرا 1997) مدیر: قمر صدیقی،

سہ ماہی نیا ورق (اجرا 1999) مدیر: شاداب رشید،

سہ ماہی اثبات (اجرا 2006) مدیر: اشعر نجمی (فی الحال اثبات کی اشاعت موقوف ہے۔)

ماہنامہ تحریر نو (اجرا 2007) مدیر: ڈاکٹر ظہیر انصاری،

ماہ نامہ تریاق (اجرا 2011) مدیر: ضمیر کاظمی

ششماہی اردو نامہ۔ شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کا اکیڈمک ریسرچ اینڈ ریفریڈ جرنل۔ (اجرا اپریل 2013) مدیر: پروفیسر صاحب علی

گل بوٹے (بچّوں کا رسالہ، اجرا 1995) مدیر: فاروق سیّد

■

**Dr. Majid Kazi**
301, Arfat Building, 6/61 Bunder Road
Kalyan, Distt. Thane (MS)

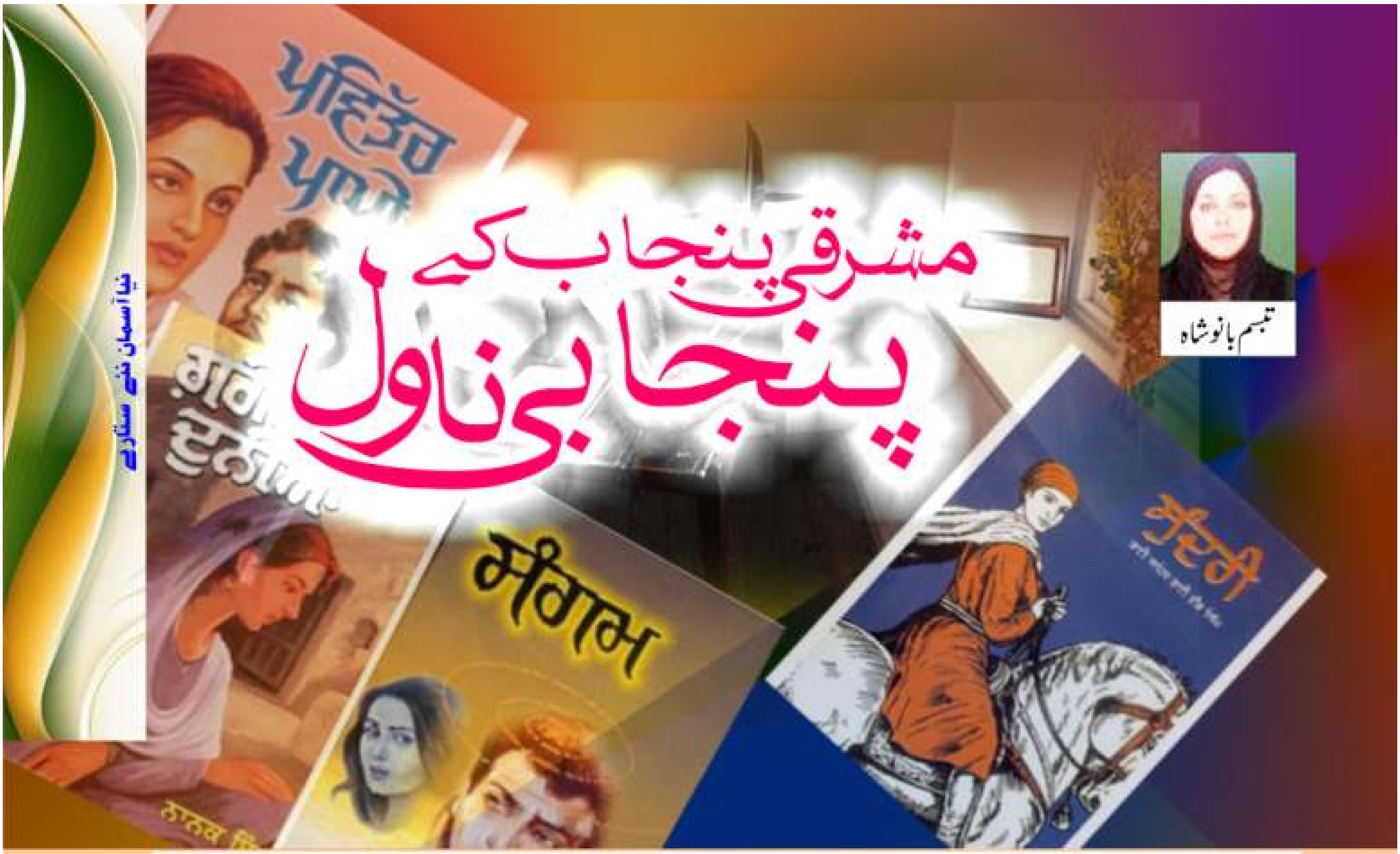

# مشرقی پنجاب کے پنجابی ناول

تبسم بانو شاہ

ناول اطالوی زبان کا لفظ 'ناویلا' سے نکلا ہے جس کے معنی نیا کے ہیں۔ یہ ایک ایسا نثری قصہ ہے جس میں حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسانی اُمنگیں اور آرزوئیں جھلکتی ہیں۔ گویا ناول نگاری زندگی کی تصویر کشی کا فن ہے۔ ڈاکٹر اسلم آزاد ناول کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''داستان 'افسانے اور ڈرامے کی طرح اس صنف کے مزاج کی تکمیل قصہ پن یا افسانویت سے ہوتی ہے۔ اس میں انسان کی معاشرتی زندگی کی تصویر کشی کی جاتی ہے......یعنی ناول نگار کے ذہن میں جو تصویر ہوتی ہے وہ ہو بہو لفظوں میں اُتر جاتی ہے''

(اردو ناول آزادی کے بعد: ڈاکٹر اسلم آزاد، ص 9)

جہاں تک پنجابی ناول کے آغاز و ارتقا کا تعلق ہے اس میں دو نظریے سامنے آتے ہیں۔ پہلے نظریے کے مطابق پنجابی ناول بھی دوسری اصناف کی طرح یورپ کی دین ہے۔ دوسرے نظریے کے مطابق پنجابی ناول پنجابی ادب میں صدیوں سے رائج قصہ 'جنگ نامہ اور ساکھیوں کا ترقی یافتہ روپ ہے۔ ان دونوں نظریات کو لے کر پنجابی محققین کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہر حال پنجابی ناول کسی نہ کسی روپ میں یورپ کے ادب سے متاثر ہو کر ہی وجود میں آیا۔ گورپال سنگھ سندھو اپنی کتاب 'پنجابی ناول کا اتہاس' میں اس نظریے کے متعلق لکھتے ہیں:

''پنجابی ناول کے جنم کے بارے میں یہ بات مانی جاتی ہے کہ اس کا آغاز انگریزوں کے پنجاب پر قبضہ کرنے اور یہاں اپنا نظام قائم کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اس لیے پنجابی ناول کے آغاز کے بارے میں یہ بات ثابت ہے کہ اس کا یورپ میں جنم لینے والے ناول کے روپ اور شکل کے ساتھ رشتہ قائم ہوتا ہے۔''

(پنجابی ناول کا اتہاس: گوردیال سنگھ سندھو، ص 12)

پنجابی کا پہلا ناول عیسائی مشنریوں کی جانب سے شائع کیا گیا، جس کا نام 'جیوتر دیو' ہے۔ یہ ناول 1982 میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے 1859 میں ایک ناول نما ترجمہ کردہ تخلیق 'مسیحی مسافر دی یاترا' شائع ہو چکا تھا۔

پنجابی ناول کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جس وقت پنجابی ناول نے آنکھ کھولی اس زمانے میں والٹر سکاٹ کے تاریخی ناول، دیونندن کھتری کی رومانس کتھا' چندر کانتا' رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر کے ناول پڑھے جاتے تھے۔

ناول کے ابتدائی دور میں ڈاکٹر چرن سنگھ کا نام قابل ذکر ہے۔ انھوں نے ''شراب کور'' اور ''منڈولی'' ناول لکھے۔ بھائی موہن سنگھ نے اپنے ناولوں میں سکھ کرداروں کو پیش کیا۔ اس کے علاوہ بھائی موہن سنگھ وید نے سماجی ناول تحریر کیے اور نانک سنگھ کا نام بھی ابتدائی ناول نگاروں میں اہمیت کا حامل ہے انھوں نے پنجابی ناول کو کامیابی کی بلندیوں پر لا کھڑا کیا۔ پنجابی ناول کو عام طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پنجابی ناول کا باقاعدہ آغاز بھائی ویر سنگھ کے ناولوں سے ہوتا ہے۔ ان کے ناولوں کا مقصد مغربی تہذیب وثقافت کے مقابلے میں پنجابی تہذیب و کلچر اور سکھ دھرم کو پیش کرنا تھا۔ بھائی ویر سنگھ نے 17 ویں اور 18 ویں صدی کے سکھوں کی تاریخ کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ بھائی ویر سنگھ کا پہلا ناول 'سندری' ہے اس ناول میں ایک عورت کی کہانی کو بیان کیا ہے گیا جو ہندو دھرم کو چھوڑ کر سکھ دھرم کو اپناتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ناول 'ستونت کور'، 'بجے سنگھ' مشہور ناول ہیں۔ بھائی موہن سنگھ وید پنجابی ناول کے ابتدائی دور کا دوسرا اہم ناول نگار ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں پنجاب کے زمینی حقائق اور قدروں کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ ڈاکٹر مان سنگھ اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

''وید کے ہاتھوں میں پنجابی ناول دھرم میدان سے سکھ سماج کے ذریعے سماجی مسائل میں داخل ہوتا ہے۔ کرداروں کے روپ میں بھی تبدیلی نمودار ہوتی ہے کیونکہ وید کے کردار عام سکھ اور سماجک کمزوریوں والے کردار ہیں۔ یہ ناول کہانی کی جانب سے رومانس کتھا والے اور پیغام دینے والے ہیں''

(جیت سنگھ سیتل: آدھونک پنجابی ساہت دا آلوچناتمک اتہاس، ص 278)

اس کے علاوہ ہرچرن سنگھ شہید کا پنجابی ناول نگاری

کی دنیا میں اہم نام ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ کس طرح انگریز ہندوستان پر قبضہ جماتے ہیں اس کے علاوہ بہت سے ایسے ناول نگار ہیں جنھوں نے پنجابی ناول نگاری میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔

پنجابی ناول کے دوسرے دور کو اس کا سنہری دور کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس دور میں پنجابی ناول حقیقت نگاری کی طرف راغب ہوا۔ اس دور کے ناول نگاروں نے روایتی موضوعات کو چھوڑ کر دنیائے ادب کے ساتھ چلنا شروع کیا۔ دنیا بھر میں تبدیلیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ پوری دنیا میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان خلیج بڑھ گئی تھی۔ اس دور کے پنجابی ناول نگاروں نے اردو کے ناول نگار پریم چند کی طرح دیہاتیوں اور کمزور و مظلوم کسانوں اور مزدوروں کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ اس دور کے ناول نگاروں میں سب سے اہم نام نانک سنگھ کا ہے۔ نانک سنگھ پنجابی کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں میں حقیقت نگاری کو اپنایا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں عصری مسائل مثلاً بے روزگاری، بیوہ کی شادی، چھوت چھات، کم عمر میں شادی وغیرہ کے مسائل کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ اس کے علاوہ نانک سنگھ نے پنجاب کی تقسیم پر بھی کئی ناول تحریر کیے جن میں 'آگ کی کھیڈ'، 'منجدھار' اور 'آدم خور' وغیرہ ناول لکھے۔ اس کے علاوہ ان کے ناولوں میں 'کٹی ہوئی پتنگ'، 'ناسور'، 'چٹا لہو'، 'پویتر پاپی'، 'سنگم'، 'خون دے شولے'، 'جیون سنگرام'، 'غریب دی دُنیا'، وغیرہ اہم ناول ہیں۔ 'چٹا لہو' (1932) نانک سنگھ کا مشہور ناول ہے۔ پرنسپل سنت سنگھ سیکھوں (1908-1997) پنجابی کا دوسرا ناول ہے جس نے کسانوں کے مسائل کے لیے آواز بلند کی۔ اس موضوع پر ان کے دو ناول 'لہو مٹی' اور 'بابا آسمان' جیسے ناول منظر عام پر آئے۔ سریندر سنگھ نرولہ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں مذہبی اور سماجی مسائل کو پیش کیا ہے۔ جن میں 'رنگ محل'، 'دین تے دنیا'، 'جگ راتا'، 'اپنے پرائے'، 'نیلی وار'، 'دل دریا'، 'اپنے پرائے' وغیرہ ناول ہیں۔ اس کے علاوہ جسونت سنگھ کے نام کو دوسرے ناول نگاروں میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں پنجابی کلچر اور دیہاتیوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ اسی طرح کرنل نریندر پال نے بھی اپنے ناولوں میں زندگی کے تمام مسائل کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں تاریخی، سماجی اور جنسیات جیسے موضوعات کو قلمبند کیا۔

> **پنجابی ناول کے دوسرے دور کے ناول نگاروں میں جنھوں نے پنجابی ناول کو بلندیوں تک پہنچایا ان میں گورچرن سنگھ، گور بخش سنگھ، ایشور چندر نندہ، سنت ایندر سنگھ چکرورتی وغیرہ ہیں۔ گورچرن سنگھ کا اہم ناول 'وگدی سی راوی' اور گور بخش سنگھ کے دو ناول 'ان بیاہی'، 'رُخاں دی جی راند' عصری مسائل کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے دور کے پنجابی ناول نگاروں میں موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ اور تاریخی ومذہبی موضوعات کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کو اپنے ناولوں میں جگہ دی اور پنجابی ناول نے ترقی کی راہ پر چند قدم آگے بڑھائے ہیں۔**

کرنل نریندر پال سنگھ کا نام بھی اس دور کے اہم ناول نگاروں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے تحریر کردہ تاریخی ناولوں کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے ناول 'ملاح'، 'سیناپتی' اور انتالی اہم ناول ہیں۔

پنجابی ناول کے دوسرے دور کے ناول نگاروں میں جنھوں نے پنجابی ناول کو بلندیوں تک پہنچایا ان میں گورچرن سنگھ، گور بخش سنگھ، ایشور چندر نندہ، سنت ایندر سنگھ چکرورتی وغیرہ ہیں۔ گورچرن سنگھ کا اہم ناول 'وگدی سی راوی' اور گور بخش سنگھ کے دو ناول 'ان بیاہی'، 'رُخاں دی جی راند' عصری مسائل کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے دور کے پنجابی ناول نگاروں میں موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ اور تاریخی ومذہبی موضوعات کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کو اپنے ناولوں میں جگہ دی اور پنجابی ناول نے ترقی کی راہ پر چند قدم آگے بڑھائے ہیں۔

پنجابی ناول کے تیسرے دور کو ترقی یافتہ دور بھی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں پنجابی ناول نے حقیقی دُنیا میں سانس لینی شروع کی۔ اس دور کے ناول نگاروں میں سوہن سنگھ سیتل کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں ماجھے کے دیہاتیوں سے جُڑے مسائل کو اپنے ناول کا موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں ان کے ناول 'دیوے دی لو'، 'پت بنتے قاتل'، 'جگ بدل گیا' وغیرہ اہم ناول ہیں۔ جگ بدل گیا پر سوہن سنگھ سیتل کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ناول حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ کرتار سنگھ دوگل کا نام ترقی پسند ناول نگاروں میں سرفہرست ہے۔ کرتار سنگھ کو پنجابی ناول کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے پہلی بار پنجابی ناول میں فرائڈ کے نظریات کو پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں کا بنیادی موضوع انسانی زندگی کے مسائل ہیں۔ ان کے ناولوں میں 'اُس دیاں چوڑیاں'، 'ایک دل بکاؤ ہے'، 'دل دریا'، 'پھولاں دا ساتھ' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح گردیال سنگھ کے چند مشہور ناولوں میں 'مڑہی دا دیوا'، 'ان ہوئی'، 'ریتے دی اک مٹھی' اور 'پرسا' وغیرہ پنجابی ناول کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ سرجیت سنگھ سیٹھی بنیادی طور پر ڈرامہ نگار ہیں لیکن ناول نگاری میں بھی ان کو کمال حاصل ہے۔ ان کے ناولوں میں 'ریت دا پہاڑ'، 'اک شہر دی گل'، 'ایک خالی پیالہ' وغیرہ قابل ذکر ناول ہیں۔ سیٹھی کا ناول 'کل سورج چڑھے گا' پنجابی کا شاہکار ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول میں جلیانوالہ باغ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ موہن کا ہلے پنجابی ناول کے منفرد ناول نگار ہیں۔ ان کے موضوعات میں تازگی ہے۔ ان کے ناولوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے پہلی بار راوی دریا کے کنارے مشرقی پنجاب کے ضلع گرداسپور کے ملاحوں، گوجروں اور دوسری جاتیوں کے واقعات وحادثات کو پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں 'مچھلی ایک دریا دی'، 'پردیسی رُکھ'، 'گوری ندی دا گیت' جیسے ناول نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ سکھ ویر بھی پنجابی ناول نگاری میں ایک اہم نام ہے۔ ان کے قابل ذکر ناولوں میں 'پانی کا پل'، 'رات دا چہرہ'، 'سڑک تے کمرے'، 'گردش' وغیرہ مشہور ناول ہیں۔

امرتا پریتم کا نام پنجابی ناول میں ہی نہیں بلکہ پورے پنجابی ادب میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ موصوفہ نے ناولوں کے علاوہ کہانیاں، شاعری، مضمون نگاری وغیرہ میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ امرتا نے اپنے ابتدائی ناول 'پنجر' میں 1947 کی تقسیم کے دُکھ کو بیان کیا ہے اور بعد میں انھوں نے اپنے ناولوں میں عورت کے مسائل کو موضوع بنایا۔ ان کے مشہور ناولوں میں 'بے شری'، 'پنجر'، 'آنسو'، 'دلی دیاں گلیاں'، 'جیب کترے'، 'کچی حویلی'، 'اک سوال'، 'بند دروزہ'، 'جلاوطن'، 'آنھا'، 'کورے کاغذ' وغیرہ شمار کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں عورتوں

کے جذبات کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔امرتا پریتم کا مشہور ناول 'پنجر' ہے۔ تقسیم کے موضوع پر لکھا گیا یہ ناول اپنی مثال آپ ہے۔ جو تقسیم وطن کے سانحہ کی المناک کہانی بیان کرتا ہے۔اس ناول میں امرتا پریتم نے ایک اغوا کی گئی عورت حمیدہ کی داستان کو بیان کیا ہے جس کو اس کے والدین قبول نہیں کرتے ہیں۔اس ناول میں پشت در پشت ہو رہے عورت پر مظالم کو اجاگر کیا ہے۔اور بدلے کی آگ میں پارو ہمیشہ پنجر بن کر رہ جاتی ہے۔'امرتا پریتم کا ناول 'پنجر' کے بارے میں خورشید احمد لکھتے ہیں:

''میں نے تقسیم کے حوالے سے بہت سے رائٹر کی تحریریں (زیادہ تر جذباتی) پڑھ رکھی ہیں لیکن جو مزا اس ناول نے دیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔قدرت اللہ شہاب کا 'یا خدا' پڑھنے پر کرشن چندر کا 'ان داتا' ثابت ہوا۔ جبکہ امرتا پریتم کا ناول 'پنجر' سو فیصد اوریجنل اور غیر جذباتی تحریر ہے۔ یہی کسی بڑے شاہکار یا عالمی ادب کا حصہ بننے والی تخلیق کی سب سے بڑی نشانی ہوا کرتی ہے۔'' (امرتا پریتم نمبر، افضل راز، ص 251)

خواتین ناول نگاروں کے حوالے سے اجیت کور کا نام پنجابی ناول نگاری میں بہت اہم مانا جاتا ہے۔ انھوں نے بھی دوسری خواتین پنجابی ناول نگاروں کی طرح اپنے ناولوں میں عورتوں کے مسائل کو پیش کیا۔ لیکن ان کا انداز دوسری خواتین قلم کاروں سے جدا ہے۔

اجیت کور نہایت بے باک ناول نگار واقع ہوئی ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں مرد سماج پر بھرپور چوٹ کی ہے۔ ان کے مشہور ناولوں میں 'پوسٹ مارٹم'، 'کنیاں لکیراں'، 'دھوپ والا شہر'، 'گوری'، 'اپنے اپنے جنگل' اہم ناول ہیں۔ 'گوری' اجیت کور کا مشہور ناول ہے اس ناول میں انھوں نے ایک بے بس ولاچار عورت کی کہانی کو قلمبند کیا ہے جو ایک بے زبان جانور کی طرح سماجی ظلم کو برداشت کرتی ہے۔اس کے علاوہ پنجابی ناول نگاری کی دُنیا میں دلیپ کور ٹیوانا کا نام بھی کافی مقبول ہے۔انھوں نے بھی امرتا پریتم اور اجیت کور کی طرح اپنے ناولوں میں عورت کے جذبات، دُکھ درد کو پیش کیا ہے۔انھوں نے عورت کے دو روپ پیش کیے ہیں۔ پہلے

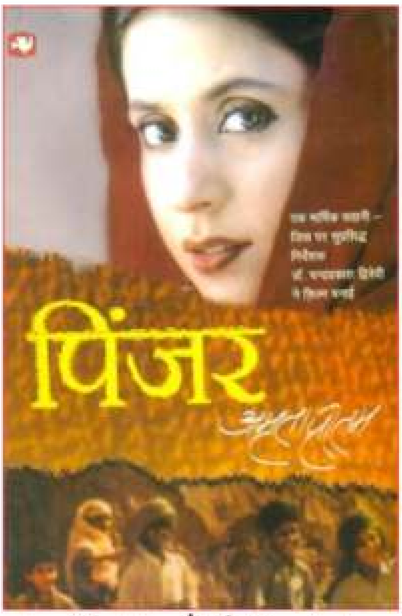


روپ میں عورت غلامی کی زنجیروں میں بندھی ہے اور دوسرے روپ میں عورت پڑھی لکھی ہے، جو سماج کی بندشوں سے آزادی حاصل کرنے لگی ہے۔ ان کے ناولوں میں 'ایہو ہمارا جیونا'، 'دوسری گیتا'، 'ہستا خر'، 'لنگ گئے دریا' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بلجیت کور بلی کا شمار بھی پنجابی کے ترقی یافتہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں پنجابی کسانوں کی آپسی دشمن کو دکھایا ہے۔ان کا ناول 'ٹھری رات' بہت مقبول ناول ہے۔اس کے علاوہ دوسرے ناولوں میں 'اپنے چھاویں'، ''دھوپ کی بات'، 'گوآچے سورج' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ہرنام داس سہرائی کا نام پنجابی ناول نگاری میں اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے زیادہ تر تاریخی ناول لکھے۔ان کے ناولوں میں 'سفید پوش'، 'انوپ کور'، 'ڈاچی'، 'شہادت'، 'بیگم حضور'، 'بابا صاحب سنگھ بیدی'، 'ستلج' وغیرہ قابل ذکر ناول ہیں۔

ہری دلبر نے اپنے ناولوں میں دیہاتی زندگی کے ساتھ ساتھ تاریخی موضوعات کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ان کے ناولوں میں 'سانوں بھل نہ جانا'، 'باری آپو اپنی'، 'حلوارا' وغیرہ قابل ذکر ناول ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سے پنجابی ناول نگار ہیں جنھوں نے پنجابی ناول نگاری میں اہم رول ادا کیا،ان میں کرم جیت، ایل گرگ، سریندر سنگھ جوہر، گرکھ سنگھ جیت، بوٹا سنگھ، اوم پرکاش شرما، ایس ساقی، سریندر سنگھ جوہر، گرکھ سنگھ، پریتم سیٹی، امر سنگھ سیتل وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں بہت سے پنجابی لوگ بہتر روزگار کی جستجو میں اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ممالک میں آباد ہوگئے اور آج پوری دنیا میں خاص کر انگلینڈ، کینیڈا اور امریکہ میں پنجابی لوگ آباد ہیں لیکن انھوں نے اپنی مادری پنجابی زبان کو فراموش نہیں کیا۔ ان دیشوں میں آباد یہ پنجابی لوگ صرف پنجابی بولتے ہی نہیں بلکہ پنجابی لکھتے بھی ہیں۔ ان پرواسی قلم کاروں میں کیلاش پوری کا نام سرفہرست ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں انگلینڈ کے مرد اور عورت کے رشتوں کو پیش کیا ہے۔'میں ایک عورت ہوں'، 'سوچی روتی رہی' وغیرہ پرواسی زندگی کی بہترین مثال ہیں۔ درشن سنگھ دھیر پرواسی ناول کا ایک اہم نام ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں مغربی اور مشرقی تہذیب کا موازنہ کیا۔ان کے ناول 'گھرتے کمرے' اور 'پیڑاں دے آر پار'، 'اجنبی چہرے'، 'رن بھومی' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ پرواسی ناول نگاروں میں سوشیل کور، ندیم پرمار، سورن چندر، سردار نقش دیپ پنج کوہاں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں پرواسی پنجابی ناول نگاری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ نئے نئے موضوعات کو پنجابی ناولوں میں جگہ دی گئی ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں ہندوستانی پنجاب کے پنجابی ناول کا سرسری طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پنجابی ناول مختلف ادوار سے ہوتا، ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آج اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ پنجابی ناولوں کو دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے مدمقابل رکھا جاسکتا ہے۔ پنجابی ناول اپنے اندر پنجاب کی تہذیب وثقافت، یہاں کی زندہ دلی، پنجابیوں کی جوان مردی اور یہاں کے میٹھے پانی کے دریاؤں کی مٹھاس کو اپنے اندر سمائے ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

■

**Tabassum Bano Shah**
Research Scholar, Dept of Persian, Urdu & Arabi
Punjabi University
NH 64, Urban Estate Phase II, Patiala District
Patiala - 147002 (Punjab)

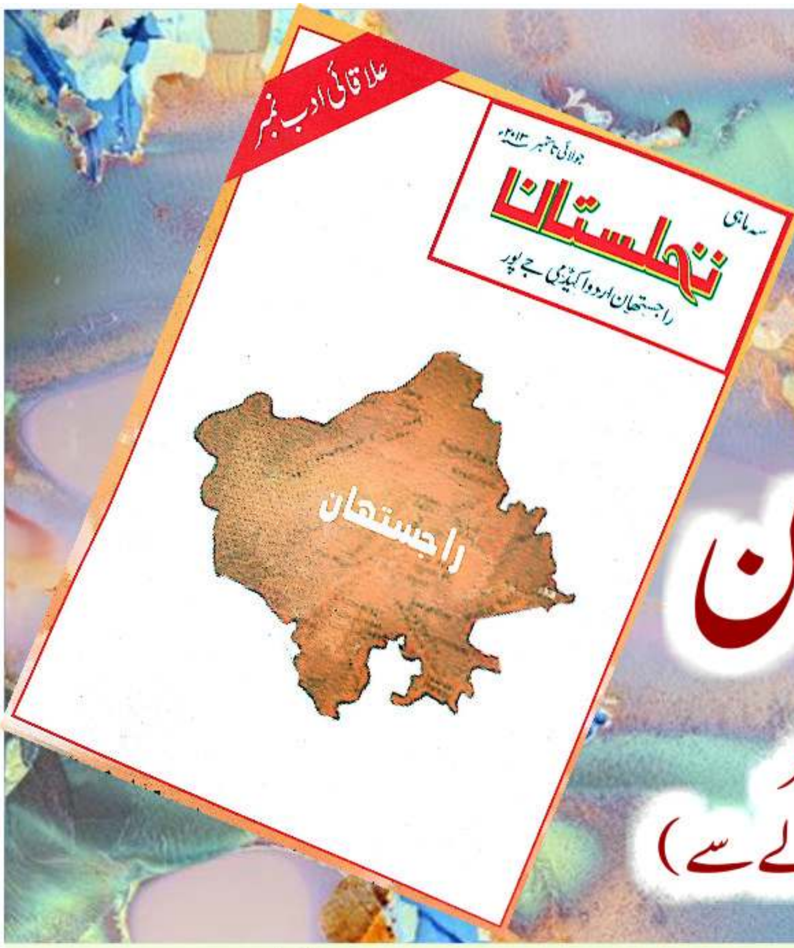


عمران عاکف خان

# سہ ماہی نخلستان کا علاقائی ادب نمبر
## (راجستھان میں اردو کے حوالے سے)

راجستھان اردو اکادمی، جے پور کا سہ ماہی 'نخلستان' واقعی اسم بامسمّٰی ہے۔ سہ ماہی 'نخلستان' کا سفر گزشتہ تریسٹھ برسوں سے جاری ہے۔ ریاست راجستھان میں جہاں بقائے اردو کے دیگر اور اہم ادارے ہیں ان ہی میں سہ ماہی 'نخلستان' بھی ایک اونچے اور خاص مقام پر فائز ہے۔ ملک بھر میں اس کے باوقار قارئین اور مداحوں کا حلقہ موجود ہے اور اس کے مشمولات کی فہرست میں راجستھان سمیت ملک بھر کی مایہ ناز ہستیوں کے مضامین/مقالات اور آراو نظریات جگہ پاتے رہے ہیں جنھیں نخلستان نے بہت اہتمام اور تزک سے شائع کیا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو خصوصی نمبر اور دستاویز کی صورت میں انھیں دوام بخشا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں زیر مطالعہ 'علاقائی ادب' نمبر پر بات کروں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادبی اصطلاح 'نخلستان' اور اس کی لفظی و معنوی صورت اور ترکیبی حالت پر کچھ کہوں: 'نخلستان' عربی اور فارسی کے دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ 'نخل' عربی کا لفظ ہے جس کے معنیٰ 'کھجور کا درخت' کے آتے ہیں اور 'استان' کا مطلب صوبہ، علاقہ، قطعہ اور ریجن وغیرہ۔ عموماً جب اس کو کسی ماقبل لفظ کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں تو اس کا 'الف' گر جاتا ہے۔ جیسے گلستان، چمنستان، کوہستان، ریگستان، ہندوستان، پاکستان وغیرہ۔ نخل اور استان یعنی 'نخلستان' کے لغوی معنیٰ فیروز اللغات میں 'کھجوروں کا جھنڈ، ریگستان میں سرسبزو شاداب قطعہ' مذکور ہے۔

راجستھان کے ریگ زاروں میں 'سہ ماہی نخلستان' کا وجود بھی کسی ریگستان میں سرسبزو شاداب قطعے یا کھجور کے جھنڈوں کی مانند ہے۔ اکادمی میں موجود تاریخی دستاویزوں کے مطابق اس رسالے کا آغاز 1964 میں راجستھان ساہتیہ اکادمی، ادے پور نے کیا تھا اور اس کا پہلا شمارہ بابت اپریل تا جون 1964 آنجہانی پروفیسر پریم شنکر سریواستو کی ادارت میں اودے پور سے شائع ہوا۔ اس کے بعد 77-1976 تک یہ رسالہ ساہتیہ اکادمی کی ہی جانب سے نکلتا رہا۔ بعدازاں جب 1979 میں راجستھان اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا تو سہ ماہی 'نخلستان' کی اشاعت و ادارت اکادمی کے ذمے سپرد ہوئیں۔ چنانچہ جے پور سے اس کا پہلا شمارہ بابت اپریل تا دسمبر 1980 شائع ہوا۔ اس شمارے کی خاص بات یہ تھی کہ نو ماہ کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اس کی ادارت کے عہدے پر خدادادخاں مونس کو فائز کیا گیا۔ خدادادخاں مونس کے عہد سے ہی 'نخلستان' کے خصوصی شماروں، گوشوں کا سلسلہ شروع ہوا چنانچہ ان کی ادارت میں سب سے پہلا اور خاص نمبر 'قابل اجمیری نمبر' بابت اکتوبر تا مارچ 87-1986 شائع ہوا جسے عبدالمتین اجمیری نے مرتب کیا۔ اس خاص شمارے کی دنیا بھر میں امید سے کہیں زیادہ پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد سے ہی اردو دنیا راجستھان کے اس جوہر قابل، عبدالرحیم قابل اجمیری کے فکروفن اور شعری وجدان و رجحان سے واقف ہوئی۔ اس کے بعد سہ ماہی 'نخلستان' کے دیگر اہم شمارے بھی سامنے آتے رہے جن میں ملک و بیرون ملک، علاقائی و ماورائے علاقہ سے متعلق متعدد دستاویزات بھی سامنے آئیں۔ جن میں جلد: 32، شمارہ:3 کا 'حضرت امیر خسرو نمبر'۔ جلد: 33، شمارہ:4 کا 'اردو صحافت نمبر' اسی طرح طویل طویل مضامین جن میں خدادادخاں مونس کا مقالہ: 'اجمیر میں اردو ادب کی تحقیق' اسی طرح ثروت النساء خان کا مقالہ: 'راجستھان کا اردو افسانہ، فکروفن کے چیلنجز' اور مختار ٹونکی کا مقالہ: 'ٹونک کا پہلا صاحب دیوان شاعر..... رونق' ایسے مقالات ہیں جو اپنے عنوان اور نفس مضمون کے لحاظ سے وقیع اور اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مطالعے سے جہاں راجستھان/راجپوتانہ میں اردو ادب کی خدمت اور صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سرزمین راجستھان اردو کے لیے زرخیز رہی ہے۔

درمیان میں اکادمی اور 'نخلستان' پر ایک براوقت بھی آیا جب پندرہ برس تک اکادمی کی سرگرمیاں ختم رہیں مگر محبان اردو اور مشاہیر راجستھان کی کوششوں اور طویل جدوجہد کے بعد 2011 ایسا برس آیا جب راجستھان کے صاحب تصنیف ادیب و ماہر تعلیم سابق جوائنٹ ڈائریکٹر کالج ایجوکیشن آف راجستھان، ڈاکٹر حبیب الرحمان

نیازی نے اس کی کمان سنبھالی۔ حالاں کہ وہ نامساعد حالات تھے مگر جناب نیازی نے اپنی محنت، لگن، جدوجہد سے اکادمی کی بوسیدہ دیواروں کو ایستادہ کیا۔ وہ بیک وقت صدر اکادمی بھی تھے اور سکریٹری بھی، رکن بھی تھے اور کلرک بھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ 'نخلستان' کو بھی انھوں نے پانی دیا اور اس کے خشک و مردہ پڑے صفحات کو سرسبزی وشادابی عطا کی۔ پھر اس کے بعد حالات درست ہوئے اور اکادمی کی پوری ٹیم تیار ہوئی جس میں صدر، سکریٹری اور ارکان و دفتری امور انجام دینے والا عملہ شامل ہے۔ حالیہ دنوں میں 'نخلستان' نے اپنی دیرینہ روایات کے مطابق عصمت چغتائی کے یوم پیدائش کی مناسبت سے ایک باوقار گوشہ بھی شائع کیا ہے جو ان مضامین کے انتخاب پر مشتمل ہے جو راجستھان اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ 'عصمت چغتائی' سمینار میں پیش کیے گئے تھے۔

میری میز پر موجود 'علاقائی ادب' نمبر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے نخلستان نے اپنے جولائی تا دسمبر 2013 کے اہم شمارے کے ذریعے پیش کیا ہے۔ دراصل یہ نمبر اس دوروزہ سمینار میں پیش کیے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جو انجمن ترقی اردو (ہند) ضلع ٹونک کے زیر اہتمام 24۔25 مارچ 2012 کو بعنوان 'راجستھان میں علاقائی اردو ادب کی تحقیق اور تعلیم کی صورت حال (مطبوعات کے خصوصی حوالے کے ساتھ)' منعقد ہوا تھا، جس میں ریاست بھر اور پڑوسی ریاست ہریانہ کے مندوبین سمیت 22 مقالہ نگاروں نے وقیع اور افادی مقالے پیش کیے اور راجستھان کے طول وعرض میں پھیلی اردو کی سرگرمیوں کا مبسوط ومحققانہ جائزہ پیش کیا۔

اس کے مشمولات پر نظر ڈالنے اور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نمبر راجستھان میں اردو زبان وادب کی موجودہ صورت حال کے علاوہ علاقائی زبانوں اور کارناموں، ترجموں، خطوط، شاہی فرامین اور مشاہیر و ادبائے راجستھان کی علمی وادبی کاوشوں کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ اس کے مشمولات میں 'راجستھان میں اردو کی اعلی تعلیم کی صورت حال۔ آزادی کے بعد (معروف ناقد و محقق ڈاکٹر ابوالفیض عثانی)' 'اے پی آر آئی ٹونک میں اردو تحقیق: مطبوعات کے حوالے سے' (صاحبزادہ عبدالمعید خاں) 'ٹونک میں سندی تحقیق اور راجستھان کی ادبی تاریخ' (ڈاکٹر شگفتہ نسرین) 'ضلع ٹونک کے ایک غیرمسلم ادیب اور اس کی تخلیقات' (ڈاکٹر محمد ریاض الدین خاں) 'سرزمین ہاڑوتی پر اردو زبان و ادب کے فروغ میں خواتین کا کردار' (ڈاکٹر قمر جہاں بیگم) 'راجپوتانہ کی اردو میں چھپی ہوئی تواریخ کی ادبی اہمیت' (ڈاکٹر عمر جہاں) 'ٹونک ضلع میں اردو کی اعلی تعلیم نسواں' (مسز سنیتا چاولہ) 'ٹونک ضلع میں اردو زبان وادب کا ماضی وحال' (ڈاکٹر سید مقبول احمد ندیم) 'آزادی کے بعد جے پور میں تحقیق کی صورت حال' (ساجد خان) وغیرہ نیز ان کے علاوہ دیگر قابل ذکر و مطالعہ مضامین بھی شامل ہیں جو خطۂ راجستھان میں اردو کی موجودہ صورت حال، خطے میں اردو کے لیے کی جانے والی جدوجہد، کتب و رسائل کی اشاعت، اسکول، کالجز اور یونیورسٹیوں میں اردو کی تدریس وتعلیم، عوام الناس تک اردو زبان وادب کی رسائی کے لیے چلائی جانے والی اسکیموں اور تحقیق و تدوین جیسے کارناموں پر مشتمل ہیں۔

مذکورہ بالا چند مضامین کے اجمال کی تفصیل بالترتیب اس طرح ہے:

(1) راجستھان میں اردو کی اعلی تعلیم کی صورت حال، آزادی کے بعد (معروف ناقد ومحقق ڈاکٹر ابوالفیض عثانی) اس مضمون میں ڈاکٹر ابوالفیض عثانی نے راجستھان میں اردو کی اعلا تعلیم کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے راجستھان بھر میں موجود ضلع وائز گورنمنٹ کالجز اور یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو اور ان میں دی جانے والی اردو تعلیم (مثلاً بی اے، ایم اے، پی ایچ ڈی وغیرہ) کی تفصیل اور موجودہ صورت حال کی تفصیل پیش کی ہے۔ جس سے راجستھان کے کالجوں اور جامعات میں اردو زبان وادب کی موجودگی اور فروغ کا ایک مجموعی خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

(2) 'اے پی آر آئی ٹونک میں اردو تحقیق: مطبوعات کے حوالے سے' (صاحبزادہ عبدالمعید خاں) اس مضمون کے ذریعے راجستھان کے ٹونک میں موجود راجستھان کے سب سے قدیم اور فعال اردو تحقیق و تدوین اور مخطوطات کے واحد ادارے عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (اے پی آر آئی) ٹونک کی علمی ادبی، تحقیقی، تدوینی، ترجمہ و مخطوطات کی دریافت و اشاعت کے متعلق معلومات اور حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ یہ ادارہ ریاست کے سابق نواب محمد علی خاں بہادر کے عہد (37-1834) میں قائم ہوا۔ اس کے بعد جب نواب صاحب کو انگریزی سامراج کے ذریعے معزول کر کے بنارس بھیج دیا گیا تو ان کے ساتھ یہ ادارہ بھی وہیں منتقل ہوگیا۔ وہاں نواب صاحب کی زیر سرپرستی تقریباً 28 سال علم و ادب کی خدمت ہوتی رہی اور دیکھتے دیکھتے ہی ایک بڑا کتب خانہ تیار ہوگیا۔ پھر ایک طویل مدت کے بعد یہ مخطوطات راجستھان اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (آر او آر آئی) جودھپور منتقل کر دیے گئے۔ یہ اورینٹل کی ہی ضلعی شاخ تھی جو بعد میں 'اے پی آر آئی کے نام سے باقاعدہ سرکاری ڈائریکٹریٹ کے طور پر عمل میں آئی۔ 1980 سے ادارے کے ماتحت سالانہ مجلّہ بھی شائع کیا جاتا ہے جس کی اب تک 16 ضخیم جلدیں اور متعدد وقیع علمی وادبی سوغات شائع ہوئی ہیں۔ اس مضمون میں اے پی آر آئی کی تمام خدمات اور حصولیابیوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

(3) 'ٹونک میں سندی تحقیق اور راجستھان کی ادبی تاریخ' (ڈاکٹر شگفتہ نسرین) اس مضمون میں ڈاکٹر شگفتہ نسرین نے راجستھان کی جامعات میں کی جانے والی سندی تحقیق کا، ماضی، حال، مستقبل تینوں ازمنہ کے حوالے سے جائزہ لیا ہے۔ راجستھان میں سندی تحقیق کی صورت حال کیا ہے اور ریاست بھر میں کہاں کہاں تحقیقی سلسلے جاری ہیں نیز ان کے عناوین، افادیت اور صورت حال کیا ہے۔ ان تمام سوالوں کا جواب اس مضمون میں ملے گا۔ اس کے لیے انھوں نے اے پی آر آئی کا ذکر خصوصی طور پر کیا ہے نیز چند تحقیقی مقالات کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے جن میں راجستھان کے اولین تحقیقی مقالہ 'راجستھان میں اردو زبان و ادب کے لیے غیر مسلم حضرات کی خدمات' (ڈاکٹر ابوالفیض عثانی) مولوی سلیم الدین تسلیم جے پوری: حیات و کارنامے (ڈاکٹر حسن آرا) راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی: 1857 سے 1957 تک (ڈاکٹر قمر جہاں بیگم) راجستھان میں شعری گلدستوں کی روایت اور اہمیت (ڈاکٹر نادر خاتون) راجستھان

**نخلستان کے مدیران:**

1۔ آنجہانی پروفیسر پریم شنکر سریواستو۔ 1964 تا 78-1977

2۔ خداداد خاں مونس۔ 1979 تا طویل مدت (جس میں اکادمی اور نخلستان کا طویل مدتی تعطل بھی شامل ہے)

3۔ ڈاکٹر حبیب الرحمان نیازی۔ 2009 تا 2012

4۔ ڈاکٹر ابوالفیض عثانی۔ 2013 تا 2014

5۔ ڈاکٹر معظم علی خاں۔ 2015 تا حال

درمیان میں مختصر عرصے کے لیے کچھ اہل علم کو بھی بطور مہمان ادارتی ذمے داریاں سونپی گئیں۔ جن میں عبد المتین اجمیری، مخمور سعیدی، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، پروفیسر فیروز احمد، عادل رضا منصوری، ڈاکٹر شاہد پٹھان جے پوری وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

میں مختلف زبانوں کی تصانیف کے اردو تراجم (ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی) شامل ہیں۔ ان کے نیچے صاحب مضمون نے تعارفی فٹ نوٹ بھی لکھا ہے جس سے مقالہ نگار اور مقالہ گائڈ کے ساتھ مقالہ گاہ (یونیورسٹی/انسٹی ٹیوٹ) کی تفصیل بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

(4) 'ٹونک ضلع میں اردو کی اعلیٰ تعلیم نسواں' (مسز سنیتا چاؤلہ) یہ مضمون مسز سنیتا چاؤلہ کی پیش کش ہے جس میں انھوں نے ضلع ٹونک کو محور بنا کر ضلع کے اسکول، کالجز اور یونیورسٹیوں میں خواتین کے لیے اعلا تعلیم کے مواقع اور محاصل کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اپنی موضوعی گفتگو کا آغاز وہ اس طرح کرتی ہیں:

''راجستھان میں ٹونک ضلع اردو کی اعلیٰ تعلیم نسواں کا ایک بڑا مرکز ہے جہاں نہ صرف مسلمان لڑکیوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا رجحان نظر آتا ہے بلکہ دوسرے سماج کی لڑکیاں بھی اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگی ہیں۔ مثال کے طور پر سنتوش مینا جو اسی ضلع کی تحصیل نوائی کی رہنے والی ہے اور اردو میں ایم اے اور ایم فل کرنے کے بعد دہلی میں اردو ٹیچر ہے۔ اس سلسلے میں اپنا تعارف بھی کرانا چاہوں گی۔ میرا نام سنیتا چاؤلہ ہے۔ ٹونک میرا وطن ہے۔ میں نے گورنمنٹ پی جی کالج سے اردو میں ایم اے کا امتحان پاس کیا ہے اور اردو مضمون کے ساتھ بی ایڈ کرنے کے بعد اجمیر ضلع میں اردو کی ٹیچر ہوں اور اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ جناب ڈاکٹر سید صادق علی صاحب کی نگرانی میں مرتب کر رہی ہوں۔ میری تحقیق کا موضوع 'اجمیر میں اردو غزل کے رجحانات' ہے۔'' (سہ ماہی نخلستان، علاقائی ادب نمبر، ص: 79)

اس کے بعد فاضل مصنفہ نے دوسری باتوں کے ضمن میں ٹونک سمیت راجستھان کے بڑے شہروں میں اعلیٰ اردو تعلیم کا سراغ بھی لگایا ہے اور اس راہ میں لڑکیوں اور خواتین کو درپیش مسائل کا بھی ضمناً ذکر کیا ہے۔

(5) 'آزادی کے بعد جے پور میں تحقیق کی صورت حال' (ساجد خان) اس مضمون میں فاضل مصنف ساجد خان نے راجستھان یونیورسٹی، جے پور کے شعبہ اردو فارسی میں 1970 سے اب تک ہونے والے تحقیقی کاموں اور موضوعات کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجستھان یونیورسٹی، جے پور کا شعبۂ اردو فارسی ملک کی دیگر یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو سے کسی طور پیچھے/کم نہیں ہے۔ بلکہ اس شعبے نے نہایت مختصر سے عرصے میں بیش قیمت موضوعات پر ریسرچ و تحقیق کرا کے اردو ادبیات کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس مضمون میں 21 اہم ترین مقالات و کتب کا تذکرہ کیا ہے جن کے مطالعے سے راجستھان میں اردو کی صورت حال کی سچی اور حقیقی تصویر سامنے آتی ہے اور اردو دنیا کو ایک خوشگوار پیغام جاتا ہے۔

ان مضامین و مقالات میں نام بہ نام نامی و گمنام اردو کے خادموں، اردو زبان کی بقا کی کوشش و آبیاری کرنے والوں کے حالات اور ان کی کاوشوں کا قصہ بالتفصیل درج کیا گیا ہے۔ اس خاص نمبر میں مذکورہ و مشمولہ تمام مضامین/مقالات اساتذۂ اردو اور مصنّفین کے ذریعے لکھے گئے ہیں جس سے ان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ یعنی یہ حضرات بذات خود تدریس اردو اور اس کے مسائل سے وابستہ ہیں اس لیے تمام صورت حال کو وہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں لہٰذا بہتر طریقے سے ان کا تجزیہ بھی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح وقت کے اہم تقاضوں کے مطابق حالات کو سمجھتے ہیں۔ کہنے کو تو یہ خصوصی شمارہ محض 17-16 مضامین اور 90 صفحات پر مشتمل ہے لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو اس سے کہیں زیادہ یہ ایک مستقل تاریخ اور راجستھان میں اردو زبان و ادب کے روشن باب کا بیان بھی ہے۔

اس خصوصی شمارے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجستھان جیسے سنگلاخ اور ریت و پتھروں کے دیس میں اردو کی بستیاں اور شہر بھی آباد ہیں اور اردو وہاں اپنی تمام خوبیوں، علمی و ادبی تخلیقات اور جملہ کمالات کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں بھی آئے دن ادبی اور تحقیقی امور انجام پاتے ہیں اور یونیورسٹیوں و کالجوں میں تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں اور ان پر ایم۔فل۔ پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی جاتی ہیں۔ یہاں بھی دیگر اردو شہروں کے طرز پر باوقار اور قابل ذکر سیمینار، سمپوزیم، ورکشاپ، مشاعرے اور نصابی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ یہاں کے پرائمری، ہائی اور سینئر سکنڈری اسکولوں کے لیے نصاب تیار کرنے کے لیے راجستھان کے محکمۂ تعلیم کا اپنا خاص بورڈ متعین و موجود ہے جسے عرف عام میں RBSE کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ راجستھان اسٹیٹ ٹیکسٹ بک بورڈ جسے عرف عام میں RSTB کہا جاتا ہے۔ ان دونوں بورڈوں کے تحت جہاں دیگر علاقائی زبانوں میں نصاب تیار ہوتا ہے وہیں اردو میں بھی نہایت اہتمام و انصرام اور ذمے داری سے نصاب تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو اساتذہ، اردو اداروں، اخبارات و رسائل اور کتاب کو یہاں کے سکریٹ سے گرانٹ اور اسکالر شپ ملتی ہے۔ اس کے علاوہ راجستھان بھر میں بالخصوص جودھپور، ٹونک، ادے پور، بیکانیر، جے پور اور اجمیر میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی متعدد شاخیں قائم اور فعال ہیں۔ اسی طرح یہاں پر اردو ٹیچنگ ٹریننگ کالجز، اکادمیاں اور انسٹی ٹیوٹس بھی قائم ہیں جو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن سے اسپانسرڈ یا یو جی سی کے زیر اہتمام جزوقتی و کل وقتی فروغ استعداد اساتذہ کی ذمے داری نبھا رہی ہے۔ ان مذکورہ اداروں میں اساتذہ و طلبا جوق در جوق اور شوق سے شرکت کرتے ہیں۔ زیر نظر نمبر کے مطالعے سے راجستھان میں موجود گورنمنٹ کالجز اور ریاستی و ضلعی دفاتر اسی طرح تھانوں و تحصیلوں اور عدالتوں اور بار میں اردو مقبولیت کا بھی پتا چلتا ہے جس سے راجستھان میں اردو کے لیے ایک محفوظ سائبان اور محل و گھرانے کا احساس ہوتا ہے جسے نہ کوئی خطرہ لاحق ہے اور نہ کسی قسم کا اندیشہ۔

**راجستھان کے صحرا میں اردو کا لہلہاتا ہوا چمن موجود ہے جس کی رعنائی و زیبائی اور سبزہ زاری روز افزوں ہے نیز اس کے تسلسل کا سہرا راجستھان اردو اکادمی و 'نخلستان' جیسے اداروں کے سر ہے جو اپنی ذمے داری اور بالغ احساس کے ذریعے اس کی آن بان شان باقی رکھے ہوئے ہیں۔**

زیر نظر نمبر سیمینار کی روداد و مقالات پر مشتمل ہے نیز ایک وقیع دستاویز بھی ہے، جس کے بعد ایسا نہیں ہے کہ راجستھان میں اردو کا دائرہ بس اتنا ہی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے علاوہ بھی راجستھان میں اردو کی ترویج و اشاعت کی مہمات چل رہی ہیں جو خوش آئند بھی ہیں اور حوصلہ افزا بھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں کے طلبا و طالبات اردو کے تئیں سنجیدہ بھی ہیں اور حصول کے لیے کوشاں بھی۔ وہ یہاں منعقد ہونے والے اردو پروگراموں میں اپنی موجودگی بھی درج کراتے ہیں۔

خلاصۂ گفتگو یہ کہ راجستھان کے صحرا میں اردو کا لہلہاتا ہوا چمن موجود ہے جس کی رعنائی و زیبائی اور سبزہ زاری روز افزوں ہے نیز اس کے تسلسل کا سہرا راجستھان اردو اکادمی و 'نخلستان' جیسے اداروں کے سر ہے جو اپنی ذمے داری اور بالغ احساس کے ذریعے اس کی آن بان شان باقی رکھے ہوئے ہیں۔

■

**Imran Akif Khan**
85, Deg Gate, Gulpara
Bharatpur - 321024 (Rajasthan)

# ادبی افق پہ درخشاں چاند کلّوی

ابوارشد اعظمی

چاند کلوی اپنے دور کے منفرد شاعر قابل قدر صحافی اور اعلیٰ پائے کے نثر نگار تھے۔ نثر میں 'کلوت دیش کی کہانی' کے نام سے معلومات سے بھر پور ضخیم اور تحقیقی کتاب تصنیف کی جو قریباً 1977 کے آس پاس شائع ہوئی۔ یہ ہماچل پردیش کے بہت سے حصے کی جامع تاریخ ہے۔ ان کا شعری مجموعہ 'وجود عدم' 1987 میں ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ انھوں نے ہماچل کے فنون لطیفہ کی ترقی اور نشو ونما کے لیے ہماچل کلا سنسکرتی و بھاشا اکادمی کی بنیاد ڈالی۔ اردو، ہندی اور سنسکرت تینوں زبانوں کی ترقی اور سرپرستی کے لیے محنت اور خلوص سے کام کیا، ساتھ ہی ہماچل کے اولین بھاشا منتری کی حیثیت سے انھوں نے پہاڑی بھاشا کو نہ صرف اپنے پاؤں پر کھڑا کیا بلکہ اس کے فروغ میں خاص دلچسپی لی۔ ان زبانوں کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبان پر بھی انھیں عبور حاصل تھا۔ ان کی شاعری کے مداح نہ صرف ہماچل میں بلکہ پورے ہندستان میں موجود ہیں۔ ان کا کلام ہندستان کے بلند پایہ اور ممتاز ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ان کے متعلق ہماچل کلا سنسکرت و بھاشا اکادمی کے صدر ویر بھدر سنگھ نے لکھا ہے کہ

''چاند کلوی ہماچل کے آسمان سیاست اور ادبی افق کے درخشاں چاند تھے...

...وہ اعلا پایہ کے شاعر، نثار اور صحافی تھے''

(وجود عدم: لال چند پرارتھی چاند کلوی، ص 9)

ڈاکٹر جگدیش مہتہ درد نے ان کی شاعری اور شخصیت کے متعلق کچھ اس طرح لکھا ہے:

''آپ سحر بیان مقرر اور علم ادویات کے بھی ماہر ہیں۔ سیاست اور نظام حکومت میں اپنا جواب آپ ہیں... شعر کم کہتے ہیں مگر جب بھی کہتے ہیں اس میں فکر و کاوش ہوتی ہے۔''

(اردو کے نان مسلم شعرا و ادیب: ڈاکٹر جگدیش مہتہ درد، ص 127)

چاند کلوی زندگی بھر شعر و ادب کی آبیاری کرتے رہے اس کے باوجود انھیں دنیائے شعر و ادب میں وہ مقام و مرتبہ حاصل نہ ہو پایا جس کے وہ حق دار تھے۔ یہاں تک کی ان کا مجموعہ کلام بھی ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا اس کی کئی وجوہات رہیں، صحت کا اچھا نہ رہنا سیاست میں مصروفیت کے سبب فرصت کا فقدان لیکن سب سے اہم بات ان کی قلندرانہ بے نیازی جس کا انھیں شدت سے احساس رہا جس کا اظہار انھوں نے خود اپنے کلام میں کیا ہے:

یہ بے نیازیِ فطرت کا تھا کمال کہ ہم
چراغِ زیست لیے سامنے ہوا کے چلے

چاند کلوی کا خاندانی نام لال چند پرارتھی ہے وہ 3 اپریل 1916 کو کلو (ہماچل پردیش) میں پیدا ہوئے وہ در حقیقت ایک درویش صفت انسان خادمِ قوم، فلسفی شاعر اور مدبر سیاست داں تھے۔ ان کی شاعری میں کسی قسم کا تصنع نہیں ہے، بلکہ ان کی شاعری سیدھی سادی شاعری ہے جس میں شاعر کے جذبات امنڈ آئے ہیں:

''ان کی مترنم شاعری روح کے ابدی محسوسات، انسانیت کے ادھورے پن اور عرفانیت کی تثلیث کے عناصر لیے ہوئے ہے''

(وجود عدم: لال چند پرارتھی چاند کلوی، حرف آغاز، ص 19)

شباب للت چاند کلوی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کے دلکش اور پختہ کلام میں حسنِ فطرت کے آئینے میں حسنِ ابدی و ازلی نظارہ جوئی، انسانی چہروں، سیرت اور کردار میں خالق کے نورانی جلووں کی لذت کوشی، جوانی کے پُر نشاط لمحوں کی روح پرور یادوں اور عالمگیر جذبۂ عشق کی پرستش کے ساتھ ساتھ، رموز حیات و کائنات، جسم و روح کے عارضی تعلق کی حقیقت و وقعت، بندے اور خالق کے ازلی و ابدی رشتے کی توضیح اور حیات و موت کے سانحات کی فلسفیانہ تاویلیں یکجا ہیں، جو قاری کے ذہن کو براہ راست مسحور و متاثر کرتی ہیں اور ایسا لگتا

ہے کہ اپنی غزل کے ہر شعر میں انھوں نے آپ بیتی ہی نہیں جگ بیتی بھی کہی ہے... چاندکلوی کی اکثر غزلوں کا لہجہ جدید ہے۔ اردو غزل کے روایتی لوازمات کا احترام رکھتے ہوئے انھوں نے متوازن لیکن جدید لب ولہجہ اپنایا ہے جو فکر و خیال کی ندرت اور تازگی سے مالا مال ہے انھوں نے جدید علائم اور استعاروں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ موجودہ دور کی ناآسودگی اور عدم تحفظ کا احساس، اخلاقی قدروں کے زوال کا ماتم، بھائی چارے مروّت، یگانگت اور دوستی کے رشتوں کی زخم خوردگی انسانی خون میں شرپسندی، فتنہ پردازی اور افسانہ انگیزی کے ابال پر تاسف، سماجی نابرابری، کمزور عوام کے استحصال اور جنگ پردازوں کے ہاتھوں انسانی تہذیب کو بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کرنے کی سازش کی پردہ دری، کیا نہیں ہے ان غزلوں میں... ان کی تجربہ کار نگاہوں نے دنیا کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ دورِ حاضر کے انسانی مسائل اور جذباتی تجربوں کو انھوں نے نرم ونازک لہجے، اور جدید اسلوب میں اپنے اشعار میں ڈھالا ہے لیکن ان کے لہجے پر غم وغصہ کی بجائے ان کی زندہ دلی، ان کی باغ و بہار طبیعت، شوخی اور بذلہ سنجی کا ذائقہ نمایاں ہے۔"

(وجود عدم: لال چند پرارتھی چاندکلوی، صفحہ فلیپ کور)

چاندکلوی کے متعلق شباب للت نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تصدیق ذیل کے اشعار سے ہوتی ہے:

مشکل تو کچھ نہیں تھا مجھے ڈھونڈنا مگر
گل ہو چکے چراغ اندھیرے نگر میں ہوں
حق بات سے گریز حقائق میں ہیر پھیر
فرعونیت، فریب و ریا، رہبری نہیں
چشمِ ساقی سے مے برستی ہے
روح پھر کس لیے ترستی ہے
ازل سے ہیں غمِ دوراں کے ہم رکاب اے چاند
جہاں رکا غمِ دوراں وہیں پہ ہم ٹھہرے
سنتے ہیں گلستاں میں کہیں آگ لگی ہے
دیکھا ہے کہیں برق نے رحمت کی نظر سے
اور اونچی اڑان بھرنے کو
کب کہاں آسماں نہیں ہوتے
عرش تا فرش میرا پرتو ہے
کون کہتا ہے رات کچھ بھی نہیں

چاندکلوی نے غزل کو روایت کے ساتھ ساتھ عصری میلانات اور نئی حسیات سے روشناس کرایا۔ ان کی غزلوں میں تجربوں کی وسعت اور لہجے کا دھیما پن ملتا ہے، وہ کبھی کسی ازم سے نہیں جڑے اور نہ ہی خود کو کسی تنظیم اور دھڑ کا پابند اور مقلد ٹھہرایا۔ وہ جدید شاعری کے ساتھ ساتھ روایتی شاعری کا بھی بغور مطالعہ کرتے رہے۔

چاندکلوی کی شاعری روح کو تازگی عطا کرتی ہے۔ ان کے کلام میں حسن وعشق کے نت نئے مضامین انتہائی متاثر کن ہیں۔ وہ شاعری کے ذخیرۂ الفاظ سے استعمال شدہ علامات ولفظیات کو بھی اپنے کلام کا حصہ بناتے ہیں لیکن اس کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ ان کی توجیہ فرسودہ انداز سے نہیں کی جاسکتی۔ وہ اپنے جذبات واحساسات کی عکاسی کے لیے ایسے الفاظ کا سہارا لیتے ہیں جو ان کے اندر چھپے ہوئے درد وغم کا ادراک فن کارانہ طور سے کرسکیں۔ ساتھ ہی دوسروں کے رنج والم کو بھی اپنے اندر سمو سکیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عشق کی منزلِ مقصود ہے آنکھوں سے نہاں
شدتِ شوق کہیں حرفِ تماشا تو نہیں
راہِ فرار ڈھونڈلی تیرے خیال نے
صدہا تجلیوں کو اندھیرا نگل گیا
کیوں تیرگی کے ڈر سے ستارے ہیں ماند ماند
نکلے گا چاند ہوگی شبِ کامراں کی بات
خدا کے بعد تمھارے ہی نام کی رٹ ہے
ذرا قریب تو آؤ ذرا قریب آؤ
مرے نصیب کے معنی بدلنے والوں میں
لکھا ہے نام تمھارا خدا کے نام کے بعد

ان کی غزلوں میں کہیں کہیں تصوف کا رنگ بھی نظر آتا ہے:

مل گئے سنگم پہ آکر اور سمندر ہوگئے
ایک دریا روح کا تھا ایک دریا جسم کا
ورنہ اس اندھی گپھا میں کیا خیالِ ہست وبود
اک ترے ہونے سے ہوتا ہے تماشا جسم کا

چاندکلوی کے یہاں چھوٹی بحروں میں بالکل وہی انداز نمایاں ہے جو مومن کی غزلوں کی شناخت سمجھا جاتا ہے:

بات کرتے ہیں ہر گھڑی ہم سے
اور خود درمیاں نہیں ہوتے
یہ انتہائے شوق کا انجام ہی تو ہے
قطرہ فنا ہوا تو سمندر دکھائی دے
عرش تا فرش میرا پرتو ہے
کون کہتا ہے رات کچھ بھی نہیں

چاندکلوی اپنے آپ میں ایک انجمن تھے۔ ان کے اندر کسی قسم کا تکبر نہیں، نہایت منکسر المزاج اور نیک دل انسان تھے۔ اپنے سے کم رتبے والے اشخاص پر بھی اپنا کرم اور شفقت فرماتے۔ ساگر پالم پوری ان کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

"وہ ایک مردِ درویش، فرشتوں کی طرح معصوم اور انتہائی بے لوث انسان تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک نیک دل انسان ایک بلند فکر شاعر اور ایک با اصول اور سلجھے ہوئے سیاست داں کی خصوصیات شامل تھی، ان کی مترنم شاعری روح کے ابدی محسوسات، انسانیت کے ادھورے پن اور عرفانیت کے تثلیث کے عناصر لیے ہوئے ہے۔" (وجود عدم: لال چند پرارتھی چاندکلوی، ص 18)

**چاندکلوی کی شاعری ان کے ادبی کردار کی عظمت، ایثارو قربانی، ہمدردی، جذبۂ ترحم اور انفرادیت کا نمایاں ثبوت ہے۔ ان کی شاعری رفعت خیال، طرب انگیزی، نغمگی، عشقیہ جذبات اور فلسفیانہ فکر سے بھر پور ہے۔ ان کے ایک ایک شعر میں فلسفہ حیات کے کئی رنگ نظر آتے ہیں۔**

چاندکلوی کی شاعری ان کے ادبی کردار کی عظمت، ایثارو قربانی، ہمدردی، جذبۂ ترحم اور انفرادیت کا نمایاں ثبوت ہے۔ ان کی شاعری رفعتِ خیال، طرب انگیزی، نغمگی، عشقیہ جذبات اور فلسفیانہ فکر سے بھرپور ہے۔ ان کے ایک ایک شعر میں فلسفۂ حیات کے کئی رنگ نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام کے چند نمونے ملاحظہ ہوں، جن میں ان کی فنکاری اور کرداری انفرادیت کی عکاسی کی گئی ہے:

دلوں کے فاصلے کچھ کم کرو خدا والو
نمازِ زندگی کردار کے سوا کیا ہے
نہ جانے کب سے لہو فن کو دے رہا ہوں میں
رگوں میں گرمیٔ اشعار کے سوا کیا ہے۔
ہوتا ہے میرا ذکر تو کرتے ہیں لوگ یاد
بہتر ہے مجھ سے بھی میرے نام ونشاں کی بات
تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں جو سو جائے
اس کو پھر خواہشِ آرام کہاں ہوتی ہے
بات کرتے ہیں ہر گھڑی ہم سے
اور خود درمیاں نہیں ہوتے

چاندکلوی کے کلام کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ان کے ادبی اور شعری مزاج کی بنیادی قدروں کی عکاسی کرتا ہے۔ قدیم رنگِ سخن کے ساتھ ساتھ جدید رنگ کی جھلکیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر انجم اہلو والیہ ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"چاند کلوی کے کلام میں روایتی شاعری کی چھاپ ہر طرف موجود ہے لیکن وقت کے بدلنے کا احساس اور نئے رجحانات کی نشاندہی بھی ان کے اشعار سے ہوتی ہے۔" (ہماچل میں اردو: ڈاکٹر اشم اہلووالیہ، ص 18)

چاند کلوی کی غزلوں میں جہاں ایک طرف وسعت، ہمہ گیری، تسلسل، ندرت، خیالات کی پاکیزگی، بیان کی شگفتگی، سلاست اور روانی ہے وہاں دوسری طرف تصوف، فلسفہ، عشق، انقلاب اور حب الوطنی کے جذبات بھی موجود ہیں۔ ان کی شاعری میں جن لفظیات کا استعمال ہوا ہے ان میں۔ موت، زیست، زلف، نظر، تقدیر روشنی، دھوپ، شب، چاند، ستارے، الفت، محبت، اشک، رنج و غم، عکس، آئینہ، نگاہ، چہرہ، بلندی، پستی، شعلہ، شبنم، ہجر، وصال، سمندر، عرش، فرش، دشت، وحشت، جنوں، چراغ، رات، خواب، حقیقت، داستان، قیامت، گلستاں، خوشبو، رقیب حبیب، برسات، سمندر وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ان لفظیات کے شعری استعمال سے ان کی غزلوں میں ایک مخصوص فضا پیدا ہوگئی ہے جس میں وسعت بھی ہے اور گہرائی وگیرائی بھی اور ساتھ ہی ساتھ معنی و مفاہیم کی دنیا بھی۔ چند اشعار بطور مثال دیے جا رہے ہیں:

رنج و غم قہر و قیامت، شور و شیر
ساتھ ہوتے ہیں جہاں جاتا ہوں میں
قرارِ زیست تیری یاد نے مٹا ڈالا
چراغ ایک بجھا دوسرا جلا ڈالا
دل رُبا چہروں کی اس بھیڑ میں اے چاند کہیں
اس کا چہرہ بھی ابھر آئے تو کچھ بات بنے
یہ کس خیال کی خامی نے آپ میں مجھ میں
مزاج شعلہ و شبنم کا فاصلا ڈالا
پھرے ہے چاند زمیں پر خوشی سے اتراتا
جو دیکھیے تو وہ فنکار کے سوا کیا ہے۔
دشت و صحرا میں بھٹکتا ہوں مگر دل میرا
کوئی پھولوں سے لدی راہ گزر مانگے ہے
صبح ہوتی ہے کہاں شام کہاں ہوتی ہے
ہے سفر زندگی، آرام کہاں ہوتی ہے
زیست ایک ایسا سفر ہے جو کبھی ختم نہ ہو
موت آغاز کا انجام کہاں ہوتی ہے

ان کی شاعری کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات اور داخلی حسیت سے جو کلام وجود میں آتا ہے وہ بظاہر آسان سہی مگر اس کے بغور مطالعے سے

**چاند کلوی نے غزل کے علاوہ قطعات میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ قطعات میں بھی ان کے رنگا رنگ خیالات اور جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس میں اپنی زندگی کے تجربات بیان کیے ہیں ان تجربات میں فکرانگیزی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی۔ اس کے علاوہ ان قطعات میں مناظر فطرت کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور انسانی زندگی کے درد و کرب کا اظہار بھی ملتا ہے۔**

پتہ چلتا ہے کہ اس کے اندر بڑی معنوی گہرائی و گیرائی ہے۔ کہیں کہیں تلمیحات اور استعارات کا سہارا لے کر معنوی جہات کو روشن کرنے کی کامیاب کوشش بھی نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار میں احساسات کی گہرائی فکر کی وسعت معلومات کی پختگی بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس لیے ان کے اکثر اشعار میں ان کے تجربات و مشاہدات بول پڑتے ہیں:

نہ رہا شوق تماشا، نہ رہا ذوق نظر
ابنِ آدم کا یہ انجام سفر دیکھ لیا
ہے خاص ربط جسے مریم و مسیحا سے
وہ خوئے لذتِ آزار کے سوا کیا ہے
چارسو چرچے ہیں میری طاقتِ پرواز کے
ہے ستاروں کو بھرم دم توڑ کر بیٹھا ہوں میں
حشر میں اعمال نامے جب پڑھے جانے لگے
کچھ فرشتوں کی سفارش پر پلٹ آیا ہوں میں

چاند کلوی نے غزل کے علاوہ قطعات میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ قطعات میں بھی ان کے رنگا رنگ خیالات اور جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس میں اپنی زندگی کے تجربات بیان کیے ہیں ان تجربات میں فکرانگیزی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی۔ اس کے علاوہ ان قطعات میں مناظرِ فطرت کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور انسانی زندگی کے درد و کرب کا اظہار بھی ملتا ہے۔ الجھنوں سے بھرے اس پُرآشوب عہد میں اللہ سے دعا کرتے ہیں:

انسانیت کے فرض کو وقفِ انا نہ کر
یہ دور الجھنوں کا ہے الجھن سوا نہ کر
منزل دھواں دھواں ہے سفر خارزار ہے
میرے خدا بچا ابھی محشر بپا نہ کر
خشک دھرتی کی دراڑوں نے کیا یاد اگر
ان کی آشاؤں کا بادل ہوں برس جاؤں گا
کون سمجھے گا کہ پھر شور میں تنہائی کے
اپنی آواز بھی سننے کو ترس جاؤں گا

چاند کلوی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں قطعات تو انھوں نے بس یوں ہی زبان کا مزہ بدلنے کے لیے ہی لکھا ہے۔ پھر بھی یہ قطعات شاعری کی گوناگوں خصوصیات اور گہرے ادراک کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان کی صحت بہت اچھی نہیں رہی وہ اکثر بیمار رہتے تھے کئی بار موت سے لڑکر واپس آگئے اس کیفیت کا اظہار اپنی شاعری میں اس طرح کیا ہے:

فنا کی وادیوں سے بھی میں اکثر لوٹ آیا ہوں
مرے کچھ دوستوں کی اس پر حیرانی نہیں جاتی
نظر کا فرق ہے یا صورتیں یکساں سی لگتی ہیں
فرشتوں کی بھی اب تو شکل پہچانی نہیں جاتی

چاند کلوی کی یہ خواہش تھی کہ اپنے شعری مجموعے کو اپنی زندگی ہی میں طبع کرواکے قارئینِ اردو ادب کے سامنے پیش کردیں لیکن ان کی یہ خواہش ان کے جیتے جی پوری نہ ہوسکی جس کی خلش تاعمر ان کے دل میں قائم رہی۔ وہ جانتے تھے کہ وہی لوگ صنم ٹھہرائے جائیں گے جن کا کلام شائع ہوکر اہل ذوق تک پہنچے گا۔ درج ذیل شعر سے ان کے اس جذبات کی ادائیگی ہوتی ہے:

ہزار سنگ گراں مایہ تھے تراشیدہ
جو بت کدے میں سجائے گئے صنم ٹھہرے

بہرحال ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہماچل کلا سنسکرتی و بھاشا اکادمی نے موصوف کا کلام شائع کرکے شائقین اردو سے روشناس کروایا۔ ان کی شاعری میں اسلوب بیان کی لذت، زبان و بیان کی فصاحت، خیالات کی نزاکت سوچ و فکر کی لطافت، جذبات کی تمازت، لفظیات کی حسیت کی تمام خوبیاں موجود ہیں چاند کلوی نے اپنے شعروں کی چمن بندی میں جس ہنر مندی کا استعمال کیا ہے اس سے ان کی شاعری کا لفظ لفظ سماج کا آئینہ نظر آتا ہے۔

چاند کلوی کی شاعری کے مطالعے کے بعد یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کی شاعری اپنے عہد کی پہچان ہے وہ اپنے فکر و فن کی خصوصیات کی وجہ سے اپنے معاصرین میں نہ صرف بلند اور نمایاں ہیں بلکہ اپنے دور کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔

■

**Dr. Abu Arshad Azmi**
UTRC, Solan - 173211 (HP)
Email.: abu_arshad2007@rediffmail.com

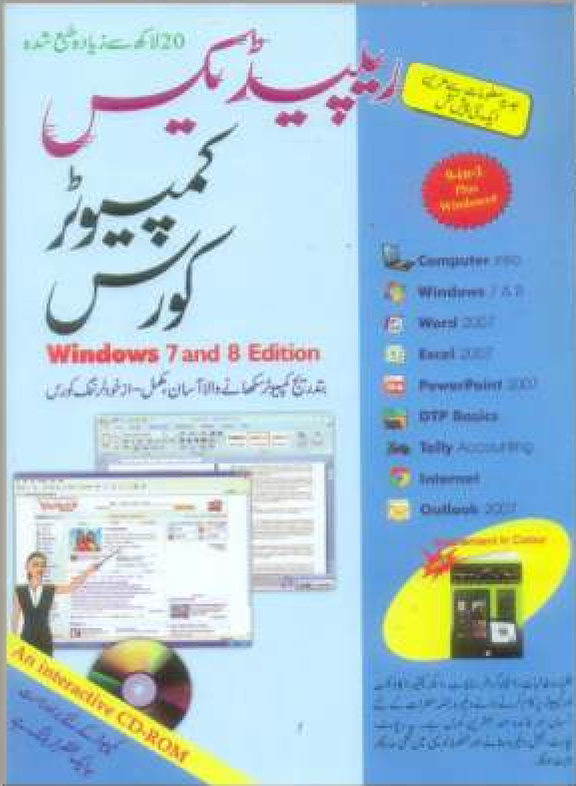

# پی سی کی تنصیب
# (Installation of PC)

پرسنل کمپیوٹر (Personal Computer) یا پی سی (PC) بھی دوسرے کمپیوٹروں کی طرح ایک کمپیوٹر ہے۔ اس لیے کسی کمپیوٹر میں کیا جاسکنے والا کوئی بھی کام پی سی پر بھی اتنی ہی اچھی طرح سے کیا جاسکتا ہے، چاہے وہ کچھ زیادہ وقت لے لے۔ آج کل بہت سے چھوٹے کاروباری، وکیل، ڈاکٹر، انجینئر، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اور دکاندار تک پی سی کا استعمال کررہے ہیں۔

اختصار میں، پی سی ہمارے لیے درج ذیل معاملوں میں کارآمد ہوسکتا ہے۔

1. ہمارے کاروبار کے ڈاٹا میں سے کام کی معلومات نکالنا۔
2. مختلف طریقوں سے جانچ کرکے سب سے اچھے طریقے کا انتخاب کرنا۔
3. بار بار کیے جانے والے کاموں کو کم وقت میں خود کار طریقے سے کرنا۔
4. ہمارے روزانہ کے کاموں کا حساب رکھ کر ہمیں منصوبے بنانے کا وقت دینا۔
5. ہر طرح کے لین دین کا صحیح حساب رکھنا اور طرح طرح کے بہی کھاتے بنانا۔
6. خوشخط میں لیٹر تیار کرکے اور ایک ہی لیٹر کئی لوگوں یا کمپنیوں کے لیے کم وقت میں تیار کرکے خط و کتابت (Correspondence) میں ہماری مدد کرنا۔
7. بچوں کی لکھائی پڑھائی میں مدد کرنا اور خالی وقت میں ویڈیو گیم کھلا کر ان کا دل بہلانا۔
8. ہمارے کاروبار سے متعلق کاموں کا کمپیوٹرائزیشن کرکے اس کا فائدہ اٹھانا۔

اصل میں پی سی ایسے ہر آدمی کے لیے کارآمد ہوسکتا ہے، جو پی سی کے لیے پروگرام لکھنا یا اسے صحیح ہدایت دینا جانتا ہو۔ حالانکہ آج کل ایسے کئی ریڈی میڈ پیکیج (Readymade Packages) ملتے ہیں، جن کی مدد سے ہم پروگرام لکھنا جانے بغیر اپنے زیادہ تر کام پی سی سے کراسکتے ہیں۔ ایسے پیکیج مینو پرمبنی (Menu-based) ہوتے ہیں۔

اس کتاب میں ہم ایسے ہی پیکیج ایم ایس۔ آفس کے بارے میں آپ کو تفصیلی اور عملی جانکاری دیں گے، جس کے مختلف پروگراموں، جیسے ایم ایس۔ ورڈ، ایکسل اور پاور پوائنٹ کی مدد سے آپ اپنے سبھی کام اچھی طرح کراسکیں گے۔

## پی سی کی خرید (Purchase of PC)

پی سی کی طاقت وصلاحیت کو جان لینے کے بعد آپ میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہوگی کہ آپ کو بھی ایک پی سی لے لینا چاہیے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کے پاس پہلے سے ہی ایک پی سی ہو اور آپ اسے بدلنے یا اس کی طاقت وصلاحیت میں اضافہ (Enhancement) کرنے کی سوچ رہے ہوں۔ جو بھی بات ہو، اگر آپ کو ایسا لگتا ہے کہ آپ کو پی سی خریدنے سے فائدہ ہوگا اور وہ فائدہ پی سی کی قیمت سے کہیں زیادہ ہوگا، تو آپ کو پی سی ضرور خرید لینا چاہیے، لیکن کمپیوٹر خریدنے سے پہلے کچھ اہم باتوں پر غور کرنا ضروری ہے، جو بنیادی طور سے درج ذیل ہیں:

### (الف) پی سی پر کیے جانے والے کام (What you will do on PC)

سب سے پہلے یہ طے کرلیں کہ آپ کو اپنے کن کن کاموں کا کمپیوٹرائزیشن کرنا ہے۔ اگر آپ کاروباری ہیں یا کسی چھوٹی موٹی کمپنی کے مالک ہیں، تو بنیادی طور سے تنخواہ کا حساب کتاب (Book Keeping)، اسٹاک انوینٹری (Stock Inventory)، فروخت کا حساب (Sales Accounting) خط و کتابت وغیرہ کا کمپیوٹرائزیشن تو کریں گے ہی، ان کے علاوہ اپنی ضرورت کے مطابق پڑھائی لکھائی، گرافکس، پروڈکشن

پلاننگ اور کنٹرول، ڈاٹا بیس مینجمنٹ وغیرہ بھی کمپیوٹر کے ذریعے کیے جاسکتے ہیں۔

جو بھی ہو، کمپیوٹر خریدنے سے پہلے آپ کو یہ طے کرلینا چاہیے کہ ابھی اور بعد میں آپ اپنے کس کس کام کا کمپیوٹرائزیشن کریں گے، ڈاٹا کا ذخیرہ کتنا ہوگا، کتنی رپورٹیں نکالیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اسی کے مطابق ہارڈ ویئر اور سوفٹ ویئر خریدنے کا فیصلہ لینا چاہیے۔ عام طور پر موڈرن سیریز اور زیادہ رفتار کا پرسنل کمپیوٹر (یعنی پینٹیم) ہی خریدنا چاہیے۔ پرانے پی سی کو خریدنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ وہ جلد خراب ہوجاتے ہیں اور ان پر سبھی قسم کے پروگرام بھی نہیں چلائے جاسکتے۔

**(ب) سسٹم کانفگریشن**

(System Configuration)

اپنی ضرورتوں کے حساب سے آپ یہ طے کرسکتے ہیں کہ آپ کے پی سی میں کیا کیا پرزے (Device) یا آلات ہوں گے اور وہ کس طرح کے ہوں گے۔ آپ کو یہ طے کرنا ہوگا کہ پی سی میں سی ڈی-روم ڈرائیو ہوگی یا سی ڈی- رائٹر ہوگا، ہارڈ ڈسک ڈرائیو کی صلاحیت کیا ہوگی، میموری کا سائز کیا ہوگا، لیزر پرنٹر چاہیے یا انک جیٹ پرنٹر کی ضرورت ہے، وی ڈی یو ایک رنگ والا یا کئی رنگوں والا چاہیے، آپریٹنگ سسٹم سوفٹ ویئر کون سا چاہیے اور کون کون سے دیگر سوفٹ ویئر پیکجوں کی ضرورت ہوگی وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی غور کرلینا چاہیے کہ آگے اس پی سی کی طاقت وصلاحیت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

**(ج) یو پی ایس** (UPS)

یو پی ایس (UPS: Uninterrupted Power Supply) ایک ایسا آلہ ہوتا ہے، جس سے بجلی کی لگاتار سپلائی کی جاتی ہے۔ اس میں ایک بیٹری بھی ہوتی ہے، جو بجلی چلے جانے پر کچھ وقت تک کمپیوٹر کو بجلی دیتی رہتی ہے، تاکہ اتنے وقت میں آپ کمپیوٹر پر چل رہے پروگراموں کو ختم کرسکیں اور کمپیوٹر کو صحیح طریقے سے بند کرسکیں۔ اچانک بجلی چلے جانے پر اگر کمپیوٹر اچانک بند ہوجاتا ہے، تو اس میں رکھے ہوئے ڈاٹا اور پروگراموں کے خراب ہونے کا امکان رہتا ہے۔ اس لیے آج کل عموماً ہر ایک کمپیوٹر کے ساتھ یو پی ایس ضرور لگایا جاتا ہے۔ آپ کو بھی اچھی طرح کام کرنے والا یو پی ایس ضرور لگالینا چاہیے۔

یو پی ایس کو بجلی کی مین لائن کے ساتھ اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ کمپیوٹر کو بجلی کی سپلائی یو پی ایس کے ذریعے ہی ہو۔ ایسی حالت میں اس کے ساتھ لگی ہوئی بیٹری اپنے آپ چارج ہوتی رہتی ہے۔ جیسے ہی بجلی چلی جاتی ہے، تو یو پی ایس فوراً ہی اپنی بیٹری سے بجلی لینا شروع کردیتا ہے اور کمپیوٹر لگاتار چلتا رہتا ہے۔ جب یو پی ایس کی بیٹری میں بجلی کی مقدار کم رہ جاتی ہے، تو یو پی ایس مناسب اشارہ یا آواز کرکے صارف کو اس کی اطلاع دے دیتا ہے، تاکہ وہ کمپیوٹر فوراً بند کرسکے۔

**(د) تخمینہ** (Cost Evaluation)

سسٹم کانفگریشن طے کرلینے کے بعد آپ اس کے مطابق الگ الگ کمپنیوں کے پی سی کی قیمت کا موازنہ کریں گے۔ قیمت کے ساتھ درج ذیل باتوں پر بھی دھیان دینا چاہیے:

1. سبھی پرزوں سمیت پی سی کی قیمت
2. کرایہ، بیمہ، پیکنگ خرچ اور سیلس ٹیکس وغیرہ۔
3. سائٹ کی تیاری، جیسے یو پی ایس کے لیے بجلی کے کیبل کی فٹنگ، ضروری فرنیچر وغیرہ۔
4. وارنٹی کی مدت، مرمت کی مقامی سہولت
5. دیکھ بھال کا سالانہ خرچ

6. سوفٹ ویئر کی قیمت، لائسنس (اگر ضروری ہو) وغیرہ۔
7. سسٹم کے مینوئل ملیں گے یا نہیں۔

سبھی کمپنیوں کی مشینوں کی ان باتوں اور قیمت کی بنیاد پر موازنہ کرنے کے بعد ہی اپنے بجٹ اور سہولت کے مطابق پی سی خریدنا مناسب رہے گا۔ اگر صارف کو تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے ان باتوں پر غور کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے، تو اچھا یہی ہوگا کہ خریدنے سے پہلے کچھ کمپیوٹر صارفین سے مل کر غور کریں یا کسی ماہر کی رائے لے لیں۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ پی سی کسی بڑی کمپنی کا ہی ہو۔ کئی لوگ اسمبل کیے ہوئے کمپیوٹر کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ تھوڑے سستے ہوتے ہیں لیکن کسی تجربہ گاہ اور اچھے جانکار آدمی سے ہی ایسا کمپیوٹر بنوانا چاہیے اور اس کے سبھی حصے رجسٹرڈ دکانداروں سے ہی خریدنے چاہئیں، جن کے ساتھ ضروری وارنٹی بھی ہو۔

**(ہ) تنصیب** (Installation)

پی سی کی تنصیب کے لیے منتخبہ جگہ پر غبار اور زیادہ درجہ حرارت وغیرہ سے بچانے کا ضروری انتظام ہونا چاہیے۔ انسٹالیشن کے وقت بنیادی طور سے درج ذیل باتوں کو دھیان میں رکھنا چاہیے:

1. سبھی مشینیں ٹھیک حالت میں ملی ہیں یا نہیں۔ اگر کسی بھی چیز میں تھوڑی بھی ٹوٹ پھوٹ ہو، تو اسے فوراً بدلنے کی مانگ کرنی چاہیے۔
2. سبھی مشینوں کے ساتھ ان کو سسٹم یونٹ سے جوڑنے والے کیبل آئے ہیں یا نہیں اور سسٹم یونٹ کو مین پاور سے جوڑنے والا کیبل آیا ہے یا نہیں۔
3. خریدے گئے سبھی پرزے اور ان کے مینوئل آگئے ہیں یا نہیں۔
4. خریدے گئے سسٹم سوفٹ ویئر اور سوفٹ ویئر پیکیج کی سی ڈی (CD) ملی ہے کہ نہیں اور اس کے ساتھ سبھی ضروری مینوئل ہیں کہ نہیں۔
5. انسٹالیشن مینوئل (Installation Manual) ضرور لے لینا چاہیے۔
6. پیکنگ میٹریل، ڈبوں وغیرہ کو آگے کے استعمال کے لیے محفوظ رکھنا چاہیے۔ کمپیوٹر کی تنصیب کرنے میں یہ بہت معاون ہوتے ہیں۔

اگر آپ ان سب باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے پی سی خریدیں گے اور لگائیں گے، تو اس پر کام کرنا آپ کے لیے اطمینان بخش اور خوشی کا باعث ہوگا۔ ■

**بہ شکریہ**: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2

# ادبی کوئز

زیب النساء سعید

(1) مولوی محمد یحییٰ تنہا کی تصنیف 'سیر المصنفین' کی پہلی جلد کب شائع ہوئی تھی؟

(الف) 1914 (ب) 1920

(ج) 1921 (د) 1924

(2) مولانا احسن مارہروی کی کتاب کا نام کیا ہے؟

(الف) اردوئے قدیم (ب) نمونہ منثورات

(ج) تاریخ ادب اردو (د) تذکرہ نثر اردو

(3) مولوی سید ایم اے حیدر آبادی نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں کے حالات اور نمونے کس نام سے لکھے؟

(الف) منثورات بنگالہ (ب) بنگال کا نثری ادب

(ج) نمونہ منثورات (د) ارباب نثر اردو

(4) خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ اخلاق و تصوف کس سنہ کی تصنیف ہے؟

(الف) 1307 (ب) 1308

(ج) 1309 (د) 1310

(5) شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیف کا کیا نام ہے؟

(الف) تصوف اسلام (ب) روح القران

(ج) الشہاب الثاقب (د) زادالمتقین

(6) ان میں سے کون شاعر بادشاہ شاہجہاں کے زمانے کا ہے؟

(الف) میر تقی میر (ب) قائم چاندپوری

(ج) ناصر افضلی الہ آباد (د) مرزا عبدالقادر بیدل

(7) مولوی عبدالحق کی کتاب کا نام کیا ہے؟

(الف) اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام

(ب) اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ

(ج) اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کردار

(د) اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کی محنت

(ہ) اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کارنامہ

(8) 'طبقات شعرائے اردو' کس کی کتاب ہے؟

(الف) گارساں دتاسی (ب) منشی کریم الدین

(ج) مولوی عبدالحق (د) محی الدین قادری

(9) گارساں دتاسی کی تصنیف 'تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستان' پہلی بار کب شائع ہوئی تھی؟

(الف) 1839 (ب) 1845

(ج) 1846 (د) 1847

(10) ممتاز ناقد و محقق ابواللیث صدیقی کا انتقال کب ہوا؟

(الف) 1997 (ب) 1993

(ج) 1994 (د) 1995

(11) یہ شعر کس کا ہے؟

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خوں فشاں کے لیے

(الف) فراق گورکھپوری (ب) ظفر گورکھپوری

(ج) حامی گورکھپوری (د) مجنوں گورکھپوری

(12) مصحفی نے دہلی کا پہلا سفر کب کیا تھا؟

(الف) 1771 (ب) 1772

(ج) 1773 (د) 1774

(13) شاہ عالم ثانی نے اپنی تصنیف کردہ داستان 'عجائب القصص' کی زبان کا کیا نام لکھا ہے؟

(الف) ہندی (ب) ہندوی

(ج) ہندوستانی (د) دہلوی

(14) 'نوادرالالفاظ' کس کی تصنیف ہے؟

(الف) امیر خسرو (ب) خان آرزو

(ج) عبدالواسع ہانسوی (د) جان گلکرسٹ

(15) میر امن نے 'باغ و بہار' کی کہانی کی زبان کا کیا نام دیا تھا؟

(الف) ہندی (ب) کھڑی بولی

(ج) زبان اردوئے معلی (د) ہندوی

(16) تذکرہ نما کتاب 'دستور الفصاحت' کس کی لکھی ہوئی ہے۔

(الف) حسرت موہانی (ب) مصحفی

(ج) محمد حسین آزاد (د) احمد علی خان یکتا

(17) مولوی سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ کا انتقال کب ہوا تھا؟

(الف) 10 اپریل 1916 (ب) 10 جون 1917

(ج) 10 مئی 1918 (د) 10 مئی 1919

(18) 'لسان العصر' کا خطاب کس کو دیا گیا تھا؟

(الف) اکبر الہ آبادی (ب) جوش ملیح آبادی

(ج) فراق گورکھپوری (د) علامہ اقبال

(19) ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی کا وطن کہاں تھا؟

(الف) فیض آباد (ب) رامپور

(ج) لکھنؤ (د) گورکھپور

(20) ہندوی کے پہلے شاعر مسعود سعد سلمان کہاں کے رہنے والے تھے؟

(الف) مدراس (ب) آگرہ

(ج) لاہور (د) دہلی

(21) امیر خسرو کی مثنوی 'تغلق نامہ' کس زبان میں ہے؟

(الف) ہندی (ب) عربی

(ج) فارسی (د) اردو

(22) عبدالرحمٰن جامی نے 'سعدی ہندوستان' کس کو کہا تھا؟

(الف) برہان الدین غریب (ب) امیر حسن، حسن دہلوی

(ج) امیر خسرو (د) ابو علی محمد قطرب

(23) وہ کون تھے جو برج بھاشا کے شاعر اور الکھ داس تخلص کرتے تھے؟

(الف) شیخ عبدالقدوس گنگوہی

(ب) شیخ احمد عبدالحق ردولوی

(ج) ابوالفضل علامی (د) شیخ شرف الدین بوعلی قلندر

(24) بھگتی تحریک کا سب سے بڑا شاعر کسے مانا جاتا ہے؟

(الف) روی داس (ب) کبیر

(ج) تلسی داس (د) نام دیو

(25) ان میں سے کون سی کتاب شاہد احمد دہلوی کی نہیں ہے؟

(الف) گنجینۂ گوہر (ب) بزم خوش نفساں

(ج) طاق نسیاں (د) رونق بزم جہاں

(26) عبدالرحمٰن بجنوری کا انتقال کہاں ہوا تھا؟
(الف) بھوپال (ب) دہلی
(ج) لکھنؤ (د) آگرہ

(27) اردو فارسی کے وہ کون قدیم خدمت گزار تھے جنھوں نے خاقانی، عرفی اور غالب کے دیوانوں کی عجیب و غریب شرحیں لکھی ہیں؟
(الف) مولانا رشید احمد (ب) مولانا شوکت میرٹھی
(ج) مولانا حکیم سید عبدالحیٔ (د) مولانا شاہ بدرالدین

(28) نواب عماد الملک مولانا سید حسین بلگرامی کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟
(الف) بلگرام (ب) کلکتہ
(ج) گیا (د) لکھنؤ

(29) عبدالحلیم شرر کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ 'دلگداز' کا آخری شمارہ کب نکلا تھا؟
(الف) جنوری 1924 (ب) دسمبر 1924
(ج) جنوری 1925 (د) دسمبر 1926

(30) آثار قدیمہ عجائب خانہ کلکتہ میں بطور محقق کام کیا اور ہندوستان کے قلمی کتب خانوں اور نادر علمی جواہر کے گوشے گوشے سے ان کو واقفیت تھی۔ وہ شخصیت کون تھی؟
(الف) شمس العلماء حافظ نذیر احمد
(ب) مولوی نورالہدیٰ ندوی
(ج) مولانا محمد یونس فرنگی محلی
(د) مولانا شاہ بدرالدین

(31) ڈپٹی نذیر احمد کے صاحبزادے کا کیا نام تھا؟
(الف) شاہد احمد (ب) نصیرالدین احمد
(ج) بشیرالدین احمد (د) معین الدین احمد

(32) ان میں سے کون سی کتاب مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی کی ہے؟
(الف) ادبیات اردو (ب) الاسلام
(ج) تاریخ اسلام (د) وضع اصطلاحات علمیہ

(33) اردو صحافت میں ایک کہنہ مشق اخبار نویس کی حیثیت سے مقبول تھے؟
(الف) سید جالب دہلوی (ب) قاضی سلیمان
(ج) مولانا حمیدالدین (د) حامد نعمانی

(34) مولانا محمد علی جوہر کا انتقال کہاں ہوا تھا؟
(الف) لکھنؤ (ب) لندن
(ج) پیرس (د) دہلی

(35) حیدر علی نظم طباطبائی کا وطن کہاں تھا؟
(الف) پٹنہ (ب) لکھنؤ
(ج) دہلی (د) حیدرآباد

(36) تہذیب نسواں کس کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا؟
(الف) راشد الخیری (ب) سید ممتاز علی
(ج) امتیاز علی (د) شائستہ اکرام اللہ

(37) گودڑ کا لال کس کی تصنیف ہے؟
(الف) اکبری بیگم (ب) محمدی بیگم
(ج) عباسی بیگم (د) قمر النساء بیگم

(38) رشیدۃ النساء بیگم کا ناول 'اصلاح النساء' کب شائع ہوا تھا؟
(الف) 1890 (ب) 1891
(ج) 1892 (د) 1894

(39) زنانہ رسالہ 'جوہر نسواں' کون نکالتے تھے؟
(الف) صادق الخیری (ب) راشد الخیری
(ج) رازق الخیری (د) صغرا ہمایوں مرزا

(40) نوراللغات کے مؤلف نورالحسن نیر کے والد محترم کا کیا نام تھا؟
(الف) نورالدین نیر (ب) نیر حسن
(ج) احمد حسین نیر (د) محسن کاکوروی

(41) خواجہ عبدالرؤف عشرت نے ساری زندگی کہاں گزاری؟
(الف) فیض آباد (ب) لکھنؤ
(ج) بہرائچ (د) الٰہ آباد

(42) فضل حق آزاد عظیم آبادی کا تعلق کس صوبے سے تھا؟
(الف) اترپردیش (ب) بہار
(ج) بنگال (د) اڑیسہ

(43) مکتوبات شاد عظیم آبادی کس کی مرتب کردہ کتاب ہے؟
(الف) وقار خلیل (ب) اکبرالدین صدیقی
(ج) نصیرالدین ہاشمی (د) سید محی الدین قادری

(44) محمد افضل، افضل پانی پتی کی تصنیف بکٹ کہانی میں کل کتنے اشعار ہیں؟
(الف) 310 (ب) 320
(ج) 325 (د) 330

(45) ان میں سے کونسی کتاب میر عبدالواسع ہانسوی کی نہیں ہے؟
(الف) غرائب اللغات (ب) شرح بوستاں
(ج) شرح زلیخا (د) فقہ ہندی

(46) شیخ بہاؤالدین باجن نے کتنی عمر پائی تھی؟
(الف) ایک سو بیس سال (ب) ایک سو بائیس سال
(ج) ایک سو پچیس سال (د) ایک سو بیس سال

(47) شیخ خوب محمد چشتی کی کتاب 'خوب ترنگ' کا سال تصنیف کیا ہے؟
(الف) 1578 (ب) 1579
(ج) 1580 (د) 1581

(48) کتاب 'نورس' جس میں مختلف راگ راگنیوں کے مطابق اشعار ترتیب دیے گئے ہیں، کس کی تصنیف ہے؟
(الف) ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو
(ب) برہان الدین جانم
(ج) سید شاہ اشرف بیابانی (د) ملا وجہی

(49) برہان الدین جانم کس کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے؟
(الف) اسمٰعیل عادل شاہ (ب) فخرالدین نظامی
(ج) میراں جی شمس العشاق (د) خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

(50) سجاد حیدر یلدرم کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟
(الف) علی گڑھ (ب) ضلع بجنور
(د) ہاتھرس (د) کالپی

## صحیح جوابات

| | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| .1 | الف | .2 | ب | .3 | د | .4 | ب | .5 | د |
| .6 | ج | .7 | الف | .8 | ب | .9 | الف | .10 | ج |
| .11 | د | .12 | ج | .13 | الف | .14 | ب | .15 | ج |
| .16 | د | .17 | ج | .18 | الف | .19 | د | .20 | ج |
| 21 | ج | 22 | ب | 23 | الف | 24 | ب | 25 | د |
| 26 | الف | 27 | ب | 28 | ج | 29 | د | 30 | الف |
| 31 | ج | 32 | د | 33 | الف | 34 | ب | 35 | ب |
| 36 | ب | 37 | الف | 38 | د | 39 | الف | 40 | د |
| 41 | ب | 42 | ب | 43 | د | 44 | ج | 45 | د |
| 46 | ب | 47 | الف | 48 | الف | 49 | ج | 50 | ب |

■

**Dr. Zaibun Nisa Saeed**
Associate Professor, Head, Dept of Urdu
C.M.p.Degree College (Allahabad University)
Allahabad - 211002 (UP)
E-mail: drz.nisa1959@gmail.com

سائنس

# امریکہ کی سرزمین پر دن میں رات

انیس الحسن صدیقی

یہ عنوان پڑھ کر آپ ضرور سوچیں گے کہ لو! ایک اور افواہ میں اضافہ ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ 21 اگست 2017 کو امریکہ کے علاقے کی ایک پوری ترچھی پٹی پر لوگوں نے 2 منٹ 40 سیکنڈ تک ایک ساتھ دن کے مختلف اوقات میں مکمل رات کے منظر کا بہترین لطف اٹھایا اور آسمان میں کئی عجیب وغریب چیزیں دیکھنے میں آئیں۔ اُس وقت دن میں اتنی گرمی تھی کہ جسم پسینہ سے تربتر ہورہا تھا اور اس منظر کو دیکھنے والے لوگ ہیٹ پہنے چھتری لگائے اور ہاتھوں میں پانی اور الیکٹرولائٹ جیسے مشروبات کا دن کی گرمی کو زائل کرنے کے لیے سہارا لیے ہوئے تھے وہاں اچانک درجہ حرارت 10 درجہ سینٹی گریڈ کم ہوگیا تھا۔ پرندے اور کیڑے مکوڑے اپنے اپنے گھونسلوں اور بلوں میں واپس چلے گئے تھے، جھینگروں نے اپنا راگ الاپا تھا اور آسمان میں سورج غائب ہوگیا تھا اور 2 منٹ 40 سیکنڈ تک اُس کی جگہ ایک کال کوٹھری (Black Hole) نما دکھائی دی تھی۔ اُس سے پہلے کچھ سیکنڈ تک ایک ڈائمنڈ رنگ نما دکھائی دی تھی اور کچھ سیکنڈ تک موتیوں کا ہار نما بھی دکھائی دیا تھا جو بیلے بیڈس (Baily Beads) نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ عجیب وغریب و حیرتناک قدرتی منظر دیکھ کر تمام تماشائی لوگوں کی ایک ساتھ حیرت سے چیخیں نکل گئی تھیں۔

اُس وقت بالکل شام جیسا اندھیرا ہوگیا تھا اور تھوڑی چاندنی جیسی سفیدی دکھائی دی تھی۔ آسمان میں سیارہ زہرہ (Planet Venus)، سیارہ مریخ (Planet Mars) اور سیارہ مشتری (Planet Jupiter) چمک رہے تھے جن کو عام لوگ ستارے سمجھے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس منظر سے پہلے اور بعد میں تقریباً تین گھنٹوں تک سورج کو چاند کے ادوار کی طرح بھی دیکھا گیا تھا۔ ان تمام تماشائی لوگوں میں مرد، عورت، بچے، بزرگ، سیاح اور سائنسداں سب شامل تھے اور بہت دُور دُور سے دسیوں، سیکڑوں اور ہزاروں میلوں کی مسافت طے کرکے اُس پٹی تک پہنچے تھے۔ اُس میں راقم الحروف بھی بذریعہ کار 12 گھنٹوں کا سفر طے کرکے نیو جرسی سے جارج ٹاؤن (جنوبی کیرولینا) پہنچا تھا۔ پتہ چلا کہ وہاں بادلوں کے ذریعے مطلع صاف نہیں رہے گا لہٰذا تین گھنٹوں کا مزید سفر طے کرکے کولمبیا کے سیارگاہ و میوزیم پہنچا ہوا تھا جہاں یہ عجیب وغریب منظر دیکھنے کو ملا۔ یہاں پہلے سے ہی اہلِ ذوق ہیئت داں (Astronomers) اور ماہر طبعیات، سائنسداں، صحافی اور طلبا اپنی اپنی دُوربین، کیمرے و آلات فلٹروں کے ساتھ اور فلٹر والے چشموں کے ساتھ سورج کی طرف کیے ہوئے اس منظر کا بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ اب خود ہی سوچیے کہ یہ قدرتی نظارہ دیکھ کر پھر 15 گھنٹوں کا سفر بذریعہ کار واپس نیو جرسی پہنچنے پر کتنی تھکان ہوئی ہوگی لیکن یہ منظر دیکھ کر ساری تھکان کا پتہ بھی نہیں چلا۔ اس قدرتی نایاب منظر کی یاد داشت تا عمر زندہ رہے گی۔ آپ بھی اس کی چند تصویروں سے لطف اُٹھائیں۔

## سورج گرہن کیا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ یہ قدرتی منظر کیا ہے؟ دراصل اس قدرتی منظر کو سائنسدانوں نے مکمل سورج گرہن کا نام دیا ہے جو سات یا آٹھ سالوں بعد دیکھنے کو ملتا ہے وہ بھی اگر موسم کے حالات صحیح ہوں تب۔ یہ تب سے ہی ہوتا چلا آرہا ہے جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے۔ سورج گرہن کو سمجھنے کے لیے پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک نادر کائناتی اتفاق ہے۔ آسمان میں سورج بھی ظاہری طور پر چاند کے برابر دکھائی دیتا ہے جب کہ سورج حقیقت میں چاند سے تقریباً 400 گنا بڑا ہے اور ساتھ ہی ساتھ چاند بھی سورج سے تقریباً 400 گنا کی دُوری پر ہے۔ اس لیے آسمان میں سورج اور چاند ایک ہی سائز کے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ اکیلی حقیقت کہ مکمل سورج گرہن کیوں واقع ہوتا ہے؟ یہ اس لیے ہے، کیونکہ چاند کا ظاہری سائز سورج کو مکمل طور پر ڈھک دیتا ہے لیکن چاند اتنا بڑا نہیں ہے کہ وہ سورج کے ہالہ (Corona) جو اس کا حلقہ شعاعیہ کہلاتا ہے اُس کو ڈھک سکے۔ اس لیے، کُرۂ ارض پر ہم کو اچھے سماوی مقام مکمل سورج گرہن (Total Solar Eclupse)

اور جزوی سورج گرہن ( Partial Solar Eclipse) کے مقام پہ قدرتی سماوی نظارے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

اگر دوسرے شمسی نظاموں میں بھی ذہین مخلوق ( Intelligent Alien) ہوں اور اُن کے ساتھ بھی یہی حالات ہوں جیسا کہ ہمارے کرۂ ارض پر ہیں تو وہ بھی ایسے ہی قدرتی گرہن کے نظاروں سے مستفید ہوں گے۔ جب تک ہم کو دوسرے شمسی نظاموں میں ذہین مخلوق کا پتہ نہیں لگتا ہے تب تک ہم اس کرۂ ارض کے انسان ہی ایسے عجیب و غریب قدرتی نایاب اتفاقی نظاروں سے لطف اُٹھانے والے ہیں۔

ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ 400 کروڑ سال پہلے جب چاند بنا تھا، اُس وقت کرۂ ارض کے بہت ہی نزدیک تھا اور آسمان میں زیادہ بڑا دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے کرۂ ارض کے شروعاتی دور میں سورج گرہنوں کے وقت آسمان میں ظاہری بڑے چاند نے سورج کے ساتھ ساتھ سورج کے ہالہ کو بھی زیادہ تر ڈھکا تھا۔ کئی جگوں کے بعد جوار بھاٹوں کی رگڑ کے ذریعے چاند کا فاصلہ کرۂ ارض سے ایک انچ فی سال بڑھ جاتا ہے جو کہ آج تک بڑھ رہا ہے یعنی چاند ہماری زمین سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے کافی صدیوں کے بعد چاند کی قرص ہم کو آسمان میں چھوٹی دکھائی دے گی تو اُس وقت مکمل سورج گرہن نہیں ہوں گے۔

مکمل سایہ (Umbra) اور جزوی سایہ (Penumbra) کیا ہیں؟

جب آپ گرہنوں کے بارے میں پڑھتے ہیں تو مکمل سایہ اور جزوی سایہ جیسی اصطلاحات زیادہ تر بیان کی جاتی ہیں۔ یہ دو قسم کے سائے ہیں جو چاند کے ذریعے ہوتے ہیں۔ مکمل سایہ اندرونی سایہ ہے یعنی اگر آپ مکمل سایہ میں کھڑے ہوں تو اُس وقت چاند کے ذریعے سورج مکمل طور پر ڈھک جاتا ہے یعنی سورج کے مکمل گرہن ( Total Solar Eclipse) کے وقت۔ جزوی سایہ باہری سایہ ہے۔ اگر آپ مکمل سایہ کی حد کے باہر کھڑے ہوں تو آپ جزوی سورج گرہن (Partial Solar Eclipse ) دیکھیں گے۔

بیسویں صدی میں امریکہ میں مکمل سورج گرہن مندرجہ ذیل تاریخوں میں واقعہ ہوئے تھے:

1۔ 30 جون، 1954۔
2۔ 20 جولائی، 1963۔
3۔ 7 مارچ 1970۔
4۔ 26 فروری، 1979۔
5۔ 11 جولائی، 1991۔

اکیسویں صدی میں 21 اگست 2017 کا یہ پہلا مکمل سورج گرہن تھا اور اگلا مکمل سورج گرہن 8 اپریل 2024 کو واقع ہونے کی پیش گوئی کی گئی ہے۔

مکمل سورج گرہن کے علاوہ اور گرہن کتنے قسموں کے ہوتے ہیں؟

جب آسمان میں چاند اور سورج ظاہری طور پر تقریباً ایک ہی سائز کے دکھائی دیتے ہیں تو اُن کے ظاہری سائز دو عناصر کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں:

(i) کرۂ ارض کے گرد چاند تھوڑا بیضوی محور میں گردش کرتا ہے اور کرۂ ارض بھی سورج کے گرد بیضوی محور میں گردش کرتی ہے۔ اس انحراف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی گرہن کے وقت چاند کی قُرص سورج کی قُرص کو مکمل طور پر نہیں ڈھکتی ہے۔ ایسے گرہن انگوٹھی نما (Annular) ہوتے ہیں۔ اس قسم کا گرہن امریکہ میں 20 مئی 2012 کو ہوا تھا۔ آئندہ انگوٹھی نما سورج گرہن امریکہ میں 14 اکتوبر 2023 کو واقعہ ہوگا۔ انگوٹھی نما سورج گرہن بھی نادرو نایاب نظارہ ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ مکمل سورج گرہن ( Total Solar Eclipse) کا عجیب و غریب حیرانگی والا نادر نظارہ ہے۔ انگوٹھی نما سورج گرہن میں دن کا وقت زیادہ مدھم ہوجاتا ہے لیکن شام کا جھٹ پٹا (Twilight) نہیں ہوتا ہے کیونکہ سورج کی قرص کا کچھ حصہ دکھائی دیتا ہے۔ سورج کا ہالہ دکھائی دینے کے لیے یہ بہت ہی زیادہ چمکدار ہوجاتا ہے۔ انگوٹھی نما سورج گرہن کو کھلی آنکھ سے زیادہ سے زیادہ اُس کے دور کو بھی سیدھا دیکھنا محفوظ نہیں ہے۔

(ii) اگر چاند کا سایہ کرۂ ارض پر مرکوز نہ ہو تب دوسرے اور تمام قسم کے سورج گرہن واقعہ ہوتے ہیں یعنی جزوی سورج گرہن ( Partial Solar Eclipse)۔ جزوی سورج گرہن کے وقت سایہ کرۂ ارض کو کھوتا ہے اور ہر جگہ سے جزوی سورج گرہن دکھائی دیتا ہے۔ اُس وقت آپ کو سورج کا کچھ حصہ ہی کٹا ہوا دکھائی دے گا۔ جزوی سورج گرہن کے واقعہ ہونے کے وقت بھی سورج کو بغیر فلٹر چشموں کے ذریعے یا پن والے سورج کے عکس سے دیکھنا مناسب نہیں ہے۔

ہر ماہ سورج گرہن کیوں نہیں ہوتا ہے؟

اگر چاند کا محور کرۂ ارض کی اُسی سطح کے بالکل اس کے اندر سورج کے گرد ہو تب مکمل یا انگوٹھی نما سورج گرہن ہر ماہ واقعہ ہوگا جب کہ حقیقت میں چاند کا محور کرۂ ارض کے محور سورج کے گرد 5 درجہ ٹیڑھا ہے۔ اس لیے سورج گرہن ہر ماہ نہیں ہوتے ہیں۔

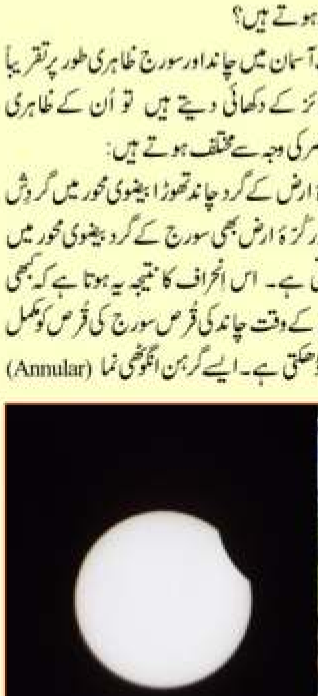

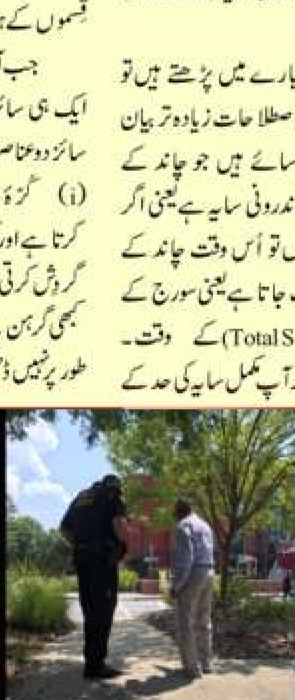

■

**A.H. Siddiqui**
39, Burniston Court, Hillsborrough
New Jersey- 08844

# تبصرہ وتعارف

## اصول افسانہ نگاری

مصنف: اویس احمد ادیب

صفحات: 86، قیمت: 65 روپے، طباعت اول: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8 شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

آرٹ، ادب یا کسی بھی میدان میں تفوق اور امتیاز کے لیے اس کے اصولوں اور فنی لوازمات سے آگہی ضروری ہوتی ہے۔ افسانہ نگاری بھی ایک ایسا آرٹ ہے کہ جس کے فنی اصولوں سے اگر واقفیت نہ ہو تو پھر اس میدان میں اپنا تشخص قائم کرنا مشکل ہے۔ ہر فن کے کچھ اصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔ ان کا خیال رکھا جائے تو بہتر ہے۔ افسانہ نگاری کے بھی کچھ اصول ہیں۔ اس کے کچھ ترکیبی اور تشکیلی اجزا ہیں۔ اس کے بغیر افسانے کو افسانہ نہیں کہا جاسکتا۔ آج بہت سے افسانہ نگار ہیں مگر وہ ان اصولوں کا التزام نہیں کرتے جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں فنی پختگی نہیں پیدا ہو پاتی۔

اویس احمد ادیب کی کتاب 'اصول افسانہ نگاری' انھیں فنی اصولوں سے واقف کرانے کی ایک کوشش ہے۔ انھوں نے احوال واقعی کے تحت لکھا ہے کہ ''اردو داں طبقے کا ہر تیسرا فرد افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یہ حشرات الارض (اس پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ ح الف) اپنے افسانوں کے مجموعے شائع کرکے شہرت عام اور بقائے دوام کے طالب ہوتے ہیں۔ ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ ان کے افسانے کس حد تک اصول افسانہ نگاری کے تحت لکھے گئے ہیں اور انھوں نے کس حد تک افسانے کے عناصر اور منازل کو پیش نظر رکھا ہے۔''

اس کتاب میں اویس احمد ادیب نے افسانے کے انھی عناصر اور منازل پر گفتگو کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ان اصولوں سے آگہی کے بغیر افسانے تو لکھے جاسکتے ہیں مگر ان میں فنی پختگی نہیں آسکتی۔

اویس احمد ادیب کی یہ کتاب 10 ابواب پر محیط ہے۔ پہلے باب میں انھوں نے مختصر افسانہ، ناولٹ یا مختصر ناول اسکیچ یا خاکے پر گفتگو کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ افسانے یا ناول میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ افسانہ بذات خود ایک علاحدہ اور مکمل اور جامع فن ہے۔ انھوں نے جے اے ہیملٹن کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''افسانہ تین سو الفاظ سے لے کر دس یا پندرہ ہزار الفاظ کا مجموعہ ہوسکتا ہے۔'' اسی طرح انھوں نے ناولٹ اور مختصر افسانے کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ افسانے کے لیے کردار ارتقا، پلاٹ، واقعات، اور انتخاب کے ساتھ ساتھ اتحاد زماں، اتحاد مکاں اور اتحاد عمل کے علاوہ افسانے کی فنی حقیقت، مکالمہ، ماحول اور اسلوب پیشکش بھی انتہائی ضروری ہے۔

دوسرے باب میں انھوں نے 'افسانے کی سرخی، ابتدا اور تحریک، منتہا، انکشاف اور خاتمہ' کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے مطابق افسانے کی سرخی کا معیاری ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ سرخی ہی افسانے کی روح ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ''وہی سرخی عمدہ ہے جو تصور زا ہو۔ اس کے پڑھتے ہی قاری اس امر کا اندازہ لگالے کہ افسانہ رومانی ہے یا تمثیلی، تاریخی ہے یا سماجی، فوق العادت ہے یا مافوق العادت۔'' انھوں نے افسانے کی تمہید پر بھی خاص توجہ دی ہے اور یہ لکھا ہے کہ افسانے کا پہلا جملہ ہی جادو اثر ہونا چاہیے۔ طویل تمہید کو وہ افسانوں کے فنا کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں افسانے کا خاتمہ بیانیہ نہ ہو اور یکبارگی اس کا خاتمہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ انھوں نے حزنیہ اور طربیہ دونوں اختتام پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ ''آج کے دور میں حزنیہ افسانے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔'' ان کے مطابق ہر افسانہ نگار کے پیش نظر درج ذیل خاکہ ہونا چاہیے: تمہید، تحریک، واقعات تحریک، منتہا و خاتمہ۔

تیسرے باب میں انھوں نے موضوع کو اپنا محور بنایا ہے کہ افسانے کے موضوعات کیسے ہونے چاہئیں؟ انھوں نے اس ضمن میں اے جی ویلز کا نظریہ پیش کیا ہے کہ کامیاب افسانہ نگار وہی ہے جو ایسے موضوع کا انتخاب کرکے افسانہ لکھے جس پر افسانہ لکھنا کسی طرح ممکن نظر نہ آتا ہو۔ کیونکہ موضوع ہی کسی بھی افسانے کو حیات ابدی عطا کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں موضوع کا انتخاب ہر افسانہ نگار کو خود ہی کرنا چاہیے اور اس کے لیے وہ مطالعہ اور مشاہدہ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اپنے معاصرین کے افسانوں کا مطالعہ، غیر زبانوں کے افسانوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ افسانہ نگاروں کے لیے وہ غور وفکر کو لازمی قرار دیتے ہیں کہ اسی کے ذریعے اس کے موضوع میں وسعت آسکتی ہے۔ پلاٹ کے تعلق سے ان کی رائے یہ ہے کہ چونکہ آسمان کے نیچے کوئی چیز نئی نہیں ہے اس وجہ سے افسانوں کے نئے پلاٹ بھی مفقود ہیں۔ انھوں نے سر آرتھر کوئی لرکاوچ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''شیکسپیئر اور چارلس ڈکنس کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی

کہ شیکسپیئر کے پاس صرف تین پلاٹ تھے اور چارلس ڈکنس کے پاس صرف ایک۔'' پلاٹ فن کار کو اس ماحول سے ملتا ہے جس میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہی پلاٹ ہے جس کے ذریعے حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ انسانی فطرت کے گہرے مطالعے سے بھی اچھے پلاٹ حاصل ہوسکتے ہیں۔ ای۔ ایم۔ جل کا خیال ہے کہ ہر عورت کی زندگی میں ایک نہ ایک واقعہ ایسا ضرور گزرتا ہے جو افسانے کا بہترین پلاٹ بن سکتا ہے۔ یہی حال ہر مرد کا بھی ہے۔ پلاٹ منظّم اور غیر منظّم دونوں ہوتے ہیں۔ مربوط اور غیر مربوط بھی ہوتے ہیں مگر اس کے لیے جدت، سادگی، ترتیب اور تسلسل کا ہونا لازمی ہے۔

افسانے کے لیے کردار نگاری بھی بہت ضروری ہے۔ کردار کے تعلق سے چوتھے باب میں اویس احمد ادیب نے لکھا ہے کہ ''کردار کی زندگی ہی میں فن کار کی ادبی بقا پوشیدہ ہے۔'' کردار پر خاص توجہ دینی چاہیے کیونکہ کردار ہی کے ذریعے کہانی قاری کے ذہن میں اپنا تاثر قائم کرتی ہے۔ ان کے مطابق ''افسانے کی زندگی کردار کی زندگی سے مطابقت رکھتی ہے۔ اگر افسانہ نگار نے زندہ جاوید کردار پیش کیے ہیں تو یقین جانیے کہ افسانہ بھی ہمیشہ زندہ جاوید رہے گا۔''

پانچویں باب میں انھوں نے مکالمے کے حوالے سے اپنے خیالات پیش کیے ہیں کہ مکالمہ افسانے کا ایک اہم ترین جز ہے۔ یہ بھی افسانے کی روح ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مکالمے کی زبان غیر فطری نہیں ہونی چاہیے۔

چھٹے باب میں انھوں نے مقامی رنگ کو افسانے کی کامیابی کا ضامن قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق جن افسانوں کے کردار میں مقامی رنگ نہیں ہوتا وہ بہروپیے معلوم ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار کے لیے ماحول اور تخیل بھی ضروری ہے کیونکہ ان دونوں کا اثر افسانے پر پڑتا ہے۔ تخیل سے ہی افسانے میں تازگی اور قوت پیدا ہوتی ہے۔ جن افسانوں میں تخیل کی پستی ہوتی ہے وہ افسانے کمزور ہوتے ہیں۔

ساتویں باب میں انھوں نے اختصار اور طول پر گفتگو کرتے ہوئے اختصار کو افسانے کا حسن قرار دیا ہے اور ربط و تسلسل کو ایک ضروری جز۔ افسانے کے لیے اتحاد زمان و مکاں بھی لازمی ہے۔

آٹھویں باب میں انھوں نے فنی تکمیل اور طرزِ تحریر دونوں کو لازمی قرار دیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ افسانے کے لیے ہلکے پھلکے الفاظ استعمال کرنا اور موزوں الفاظ کو جگہ دینا زیادہ ضروری ہے۔ غیر ضروری عبارت آرائی سے افسانوی فضا پیدا نہیں ہوسکتی۔ افسانے میں اسلوب بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اسی سے افسانہ نگار کو انفرادیت نصیب ہوتی ہے۔

نویں باب میں انھوں نے فرسودہ مواقع، غیر متوقع صورتیں اور افسانوں کے مقاصد پر بحث کی ہے۔ ان کے مطابق فرسودہ موضوعات میں اپنی طباعی اور ذہانت کا ثبوت دینا ضروری ہے۔ اگر اس میں افسانہ نگار جدت کا مظاہرہ کرتا ہے تو کامیاب رہتا ہے۔ غیر متوقع صورتوں سے بھی افسانوں میں ندرت پیدا ہوتی ہے اور ایسے افسانے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جن میں ان صورتوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ غیر متوقع صورتوں سے افسانے میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ڈبلو ڈی ہوویلز کے مشہور مختصر افسانہ 'عورت یا چیتا' کا حوالہ دیا ہے جس میں ایک غریب نوجوان اپنے ملک کی شہزادی کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ بادشاہ کو جب اس کی خبر ملتی ہے تو اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دو چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں تعمیر کرتا ہے۔ ایک میں بھوکا چیتا بند کیا جاتا ہے اور دوسری میں شہزادی۔ محبت کرنے والے نوجوان کو یہ علم نہیں ہے کہ کس کوٹھری میں شہزادی ہے اور کس میں چیتا۔ ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں کنجیاں حوالے کی جاتی ہیں۔ اگر وہ شہزادی والی کوٹھری کھولتا ہے تو اس کی زندگی بخش دی جائے گی اور دوسری کوٹھری کھولتا ہے تو بھوکا درندہ اس کا خاتمہ کردے گا۔

افسانہ نگار آخر میں دکھاتا ہے کہ نوجوان دائیں جانب کی کوٹھری کھولتا ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کوٹھری میں کون ہے۔ اسی تجسس پر کہانی کا خاتمہ کردیتا ہے۔ ایک غیر متوقع صورت کی وجہ سے یہ افسانہ بحث کا موضوع بن جاتا ہے۔ انھوں نے افسانے کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بھی کہا ہے کہ افسانے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہونا چاہیے۔

دسویں باب میں انھوں نے عشقیہ افسانے اور صنفِ نازک کے حوالے سے بات کی ہے۔ ان کے مطابق دنیا کے بہترین افسانے صرف عشقیہ ہوتے ہیں یا جن افسانوں میں عشق کا عنصر ہوتا ہے۔ مگر یہ لازمی نہیں ہے۔ اور بہت سے افسانے بھی بہترین ہوسکتے ہیں۔

اویس احمد ادیب نے اس کتاب میں افسانے کے جن عناصر اور منازل کا ذکر کیا ہے اگر ان کا خیال رکھا جائے تو یقینی طور پر افسانے میں حسن بھی پیدا ہوگا اور وہ افسانہ قاری کو متاثر بھی کرے گا مگر آج کے عہد میں جب افسانے میں نئے نئے تجربے ہورہے ہیں تو افسانے کے فنی اصولوں کا خیال رکھنے والے کتنے لوگ ہیں۔ پھر بھی یہ ضروری ہے کہ جس فن سے انسان کا تعلق ہو ان کے اصولوں سے واقفیت ہونی چاہیے۔ اویس احمد ادیب نے اسی مقصد کے تحت یہ کتاب مرتب کی ہے تاکہ افسانے کی مبادیات سے لوگ واقف ہوسکیں۔ مبتدی افسانہ نگاروں کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

اویس احمد ادیب کی یہ کتاب نایاب تھی۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کی ذاتی کوششوں سے یہ کتاب اشاعتی مرحلے سے گزری ہے اور یقینی طور پر قومی اردو کونسل کا یہ اہم کام ہے کہ وہ مفید مطلب، نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت کو اپنی ترجیحی فہرست میں شامل رکھتی ہے۔ یہ جس مصنف کی کتاب ہے اس کے بارے میں لوگوں کی واقفیت بہت کم ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ اس میں مصنف کے سوانحی کوائف اور دیگر تخلیقی آثار کا بھی اندراج کیا جاتا۔ اس سے قاری کو مصنف کی شخصیت اور علمی مقام و مرتبہ سے بھی آگہی ہوتی اور ان کی دیگر کتابوں تک رسائی کا شوق بھی پیدا ہوتا۔

اویس احمد ادیب سے زیادہ لوگ واقف نہیں ہیں۔ وہ حلیم مسلم کالج کانپور کے صدر شعبۂ اردو اور معاشیات تھے۔ ان کی کتابوں میں تنقیدیں (1944)، اردو کا پہلا ناول شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی (1934)، اردو کا پہلا شاعر اور مدون ولی دکنی (1940) کے علاوہ ایک ڈراما 'عفراء یا ماہ عرب (1945) قابل ذکر ہیں۔ ان کا ایک اہم کتابچہ اردو زبان کی نئی تحقیق (1941) کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں نئی تحقیق کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔ یہ ایسا قیمتی کتابچہ ہے جس کی اشاعت اردو اداروں کی طرف سے نہ صرف ہونی چاہیے بلکہ اسے شائع کرا کر مفت تقسیم کیا جانا چاہیے۔

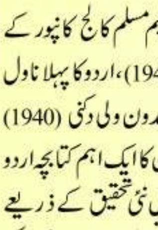

## کلیات ماجدی (جلد سوم) خاکے

ترتیب و تدوین: عطاالرحمٰن قاسمی

صفحات: 253، قیمت: 130 روپے، طباعت اول: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: ڈاکٹر غلام صمدانی، جے این یو، نئی دہلی

'کلیات ماجدی (جلد سوم) خاکے' عبدالماجد دریابادی کی کتاب 'معاصرین' کی تدوین نو سے عبارت ہے۔ عبدالماجد دریابادی نے زندگی کے آخری سالوں میں اہل علم و ادب اور مقتدر و مذہبی شخصیات کی یادوں کو نجو گنے کی غرض سے متعدد خاکے لکھے۔

تحسین فراقی لکھتے ہیں: ''معاصرین میں شامل شخصیے ماجد نے 1970 کے بعد لکھنے شروع کیے اور 1974 میں یہ بڑی تعداد میں لکھے جانے کے بعد صدق جدید میں شائع ہونے لگے۔'' (☆) کتاب 180اہم شخصیتوں کی خاکہ نگاری پر مشتمل ہے۔ انھوں نے ان تمام شخصیتوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ (1) تینتالس بڑے (2) انتیس برابر والے (3) آٹھ چھوٹے۔ بڑوں کی فہرست میں والدین کے علاوہ احمد شریف شیخ سنوسی، اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی جوہر، گاندھی جی، مولانا حسرت موہانی، ریاض خیر آبادی، علامہ اقبال، مولانا شبلی نعمانی، خواجہ حسن نظامی، عبدالحلیم شرر، خواجہ غلام الثقلین اور متعدد دیگر شخصیات کا تذکرہ شامل ہے۔ عنوان کے اعتبار سے بڑوں کی فہرست میں صرف انتالیس کی تعداد ہے لیکن ان میں تین عنوان ایسے ہیں جن کے اندر دو شخصیتوں کا ذکر ہے۔ انھوں نے باضابطہ نمبر درج کر کے اسے واضح بھی کیا ہے۔ جیسے 'والدین' کے تحت والد اور والدہ۔ اسی طرح ''دوانمول ہیرے کے ذیل میں ایک 'مولوی لقاء اللہ عثمانی' اور دوسرے 'مولانا محمد عثمان فارقلیط' کی شخصیت کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک عنوان ہے 'دو گنج مخفی' اس میں 'مولوی عبدالاحد کاکوری' اور مولوی عابد حسین کے حالات زندگی کا مختصر بیان ہے۔ اس طرح بڑوں کی مجموعی تعداد 43 ہے۔

'کچھ برابر والے' اس ضمن میں انتیس شخصیتوں کی خاکہ نگاری اور پیکر تراشی کی گئی ہے۔ بظاہر عنوان کی تعداد چھبیس ہے۔ تاہم دو عنوان 'مہر و سالک' اور 'تین شفاء الملک' کے تحت پانچ افراد (مولوی غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، حکیم عبدالحسیب، خواجہ شمس الدین اور حکیم عبداللطیف) کی سیرت و خاکہ نگاری کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ 'حکیم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب، افضل العلما کرنولی، غازی مسعود، عبدالماجد بدایونی، نواب جمشید علی خاں، مولانا عبدالباری ندوی، سید ہاشمی، پریم چند، ہوشیار جنگ سید ناظر الحسن، مولانا مودودی، بسمل موہانی، ملا واحدی، ابوالکلام، ظفر حسین خان، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ کے شخصیے شامل ہیں۔ 'آٹھ چھوٹے' میں سات عنوان کے تحت آٹھ نام شامل ہیں جن میں علی میاں اس وقت باحیات تھے۔ وہ علی میاں کے بارے میں ان الفاظ سے ابتدا کرتے ہیں کہ ''مرحوم نہیں ماشاء اللہ زندہ سلامت ہیں۔'' اور آخری پیراگراف میں لکھتے ہیں کہ ''میں اپنے وصیت نامے میں لکھا جاتا ہوں کہ میرے وقت موعود کے آجانے پر پہلے تلاش ان ہی کی کی جائے اور اگر یہ مل جائیں تو جنازہ پڑھانے کے حق دار نمبر اول یہی ہیں۔''

مصنف نے اسی نوعیت کی ایک کتاب اور بھی تحریر کی ہے جس کا عنوان 'وفیات ماجدی یا نثری مرثیے' ہے۔ 'وفیات ماجدی میں قلمی خاکوں کے ساتھ ساتھ بعض قلمی چہرے بھی ملتے ہیں۔' اس میں انھوں نے 'خاندان والے، علمائے کرام و بزرگان طریقت، سیاسی لیڈر، شاعر، ادیب وصحافی، ڈاکٹر وطبیب اور دیگر حضرات' کے عنوان کے تحت اہم شخصیتوں کی یادوں کا ایک گلدستہ تیار کیا ہے۔ دونوں کتابوں میں مختلف طبقات کی اہم شخصیتوں کے خدوخال اور روز وشب کو پوری صداقت کے ساتھ خوبصورت اسلوب میں سپرد قلم کیا ہے۔

عبدالماجد دریابادی کی مذکورہ کاوش کو ادبی اور فنی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے خاکہ نگاری کے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف غیر معمولی تخلیقی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ فن خاکہ نگاری کے مختلف پہلوؤں میں جدت پیدا کی ہے۔ اس جدت کی بایں طور نشاندہی کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی بھی شخصیت کے معمولی اور غیر معمولی ہر دو طرح کے افعال وکارکردگی کا جب کسی دوسری شخصیت کے عمل اور اخلاق سے موازنہ کرتے ہیں تب بھی صدق گوئی پر ان کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی۔

زیر تبصرہ کتاب کلیات کی تیسری جلد ہے۔ اس کتاب میں شخصیت نگاری کے اہم نمونے ہیں جن کے مطالعہ سے نہ صرف عظیم شخصیتوں سے مولانا عبدالماجد کے روابط یا ان شخصیتوں کے آپسی تعلقات اور زندگی کے واقعات سے آگہی ہوتی ہے بلکہ اس دور کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور زمانی پس منظر کی تفہیم ہوتی ہے۔

## شرار جستجو

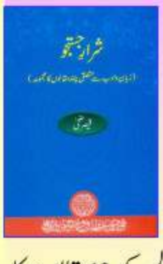

مصنف: قیصر ضحیٰ عالم
صفحات: 125، قیمت: 80روپے
ناشر: قومی کونسل برائے بروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر : ڈاکٹر ہمایوں اشرف، شعبۂ اردو،
ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ 825301 (جھارکھنڈ)

'شرار جستجو' زبان و ادب کے تعلق سے تحریر کردہ قیصر ضحیٰ عالم کے 12 مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1983 میں بہار اردو اکادمی، کے مالی تعاون سے شائع ہوئی تھی لیکن بعض وجوہ سے اردو کے عام قارئین تک اس کی رسائی ممکن نہیں ہو پائی۔ لہٰذا بعد میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام اس کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا۔ یہ یقیناً ایک مستحسن قدم ہے۔ اس کتاب کے مشمولات کے عنوانات ہیں۔ اردو انگریزی ذولسانی آمیزش، حکم و التجا اردو شاعری میں، مروجہ اور روز مرہ کے چند فقرے، انگریزی اخبارات میں دخیل ہندوستانی الفاظ، ادب اور اخلاقیات، کچھ لسانیات کے متعلق، یزداں و اہرمن، قرۃ العین حیدر بحثیت افسانہ نگار، پت جھڑ کی آواز-ایک تجزیہ، آرنلڈ کا مذہبی نقطۂ نظر، جدید شاعری کے چند پہلو اور فراق گورکھپوری-چند تاثرات۔ یہ مقالات متنوع موضوعات کے حامل ہیں۔ ان میں سے بعض کا تعلق لسانی امور سے ہے اور بقیہ ادبی جوان کے عملی اور تاثراتی تنقید کے نمونے ہیں۔ لسانیاتی زمرے کے مضامین میں اردو انگریزی ذولسانی آمیزش، انگریزی اخبارات میں دخیل ہندوستانی الفاظ، مروجہ اور روز مرہ کے چند فقرے اور کچھ لسانیات کے متعلق تازہ بہ کار، اہم اور معلوماتی ہیں۔

انھوں نے انگریزی صحافت میں ہندی اور اردو الفاظ کے استعمال کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ انگریزی صحافت میں بھی کثیر تعداد میں ہندوستانی الفاظ دخیل رہے ہیں۔ انگریزی ایک ایسی زبان ہے جس نے ہمیشہ دوسری زبان کے الفاظ کو اپنانے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے اردو فکشن، شاعری اور صحافت سے متعدد مثالیں بھی پیش کی ہیں جن میں انگریزی الفاظ اور محاورے بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔

'مروجہ اور روز مرہ کے چند فقرے' میں پٹنہ اور گیا کے علاقے میں رائج مگدھی بولی پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے قیصر ضحیٰ صاحب نے یہ بتایا ہے کہ یہ بولی اودھی سے متاثر ہوئی اور اس کے بعد اس نے کچھ اور بھی اثرات قبول کیے۔ اسی طرح 'کچھ لسانیات کے متعلق' میں بھی اہم اور بہت حد تک کارآمد باتیں سامنے آئی ہیں۔ یہ مضامین لسانیات سے مصنف کی خصوصی دلچسپی اور مسلسل تحقیق و تفتیش کے مظہر ہیں۔

'حکم و التجا اردو شاعری میں' ایک قیمتی مضمون ہے جس میں حکم و التجا کے لب و لہجے اور ادائیگی کی وضاحت وصراحت کرتے ہوئے متعدد شعرا کے کلام سے اس کی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے یہ ایک منفرد مضمون ہے۔

'ادب اور اخلاقیات' اور 'یزداں و اہرمن' بہت ہی فکر انگیز مضامین ہیں۔ اوّل الذکر

مضمون میں مصنف نے بجا فرمایا ہے کہ کسی اعلیٰ اخلاقی تصور کے بغیر زندگی میں نہ تو کوئی تنظیم آسکتی ہے اور نہ ہی ادب میں حسن پیدا ہوسکتا ہے۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں سے ہی زندگی سنورتی اور نکھرتی ہے۔ موخر الذکر مضمون ولیم واٹسن کی ایک اہم نظم "Ormazd And Ahriman" کے تجزیے پر محیط ہے۔ مصنف نے اپنے تجزیاتی مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ واٹسن کی مذکورہ نظم زرتشتیوں کے عقیدے سے مزین ہے اور اس میں شاعر نے یزداں اور اہرمن کی سرد جنگ کا ذکر بہت ہنرمندی سے کیا ہے۔

آرنلڈ کے مذہبی نقطۂ نظر کی وضاحت بھی انھوں نے خوب کی ہے۔ آرنلڈ کا خیال ہے کہ عیسائی مذہب کی Poetic Beauty ہی اس کی نمایاں ترین خوبی ہے۔ قیصر ضحیٰ صاحب کا یہ مضمون اس کے اسی خیال کے گرد طواف کرتا نظر آتا ہے۔

اگلے مضمون میں انھوں نے اردو کی جدید شاعری کا تجزیاتی مطالعہ بہت عمدگی کے ساتھ کیا ہے۔ وہ ادب میں تجربے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن تجربے کے نام پر انتشار پسندی کے سخت مخالف نظر آتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے حوالے سے ان کے دونوں مضامین ان کی عملی اور تاثراتی تنقید کے عمدہ نمونے ہیں۔

فراق گورکھپوری پر تحریر کردہ مضمون تاثراتی نوعیت کا ہے۔ اس میں فراق کی شخصیت اور ان کے ادبی معتقدات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چونکہ یہ مضمون فراق کی وفات کے فوری بعد احاطۂ تحریر میں لایا گیا تھا، اس لیے اس میں توصیفی پہلو کچھ زیادہ ہی غالب ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ 'شرار جستجو' میں شامل مضامین دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ اردو میں اس نوع کے مضامین خال خال ہی لکھے جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے احمد یوسف نے اپنے دیباچہ بعنوان 'باتیں چند' میں قیصر ضحیٰ عالم کے سلسلے میں آنے والے دنوں میں ایک اچھے نقاد کی آمد کی بشارت دی ہے۔ بلا شبہ اس کا شمار اردو کی چند اچھی کتابوں میں کیا جائے گا اور اردو کے عوام و خواص قارئین، متعلمین، اساتذہ کرام اور محققین کے لیے یہ کتاب یقیناً سودمند ثابت ہوگی۔ کاغذ عمدہ، طباعت دلکش اور قیمت بھی بہت کم ہے۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے بہ آسانی حاصل کی جاسکتی ہے۔

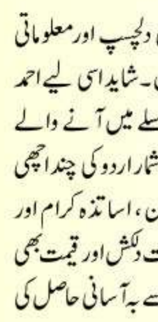


**حسن نعیم** (مونوگراف)

مصنف: شمیم طارق

صفحات: 143، قیمت: 85، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: غلام نبی کمار، P-98، چوتھی منزل، گلی نمبر 2، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

پیش نظر مونوگراف 'حسن نعیم' قومی کونسل کی مطبوعات میں ایک قابل قدر اضافہ کہا جاسکتا ہے۔ حسن نعیم بیسویں صدی کے ایک معتبر غزل گو شاعر کہلاتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، محمد حسن، وہاب اشرفی، مظفر حنفی، خلیق انجم، ابوالکلام قاسمی جیسے ناقدین نے سب سے پہلے حسن نعیم کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا اور معاصر شعرا میں مستند مقام پر فائز کرکے اردو شاعری میں حسن نعیم کی شناخت کے خاص سبب بنے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا مضمون نما تبصرہ اوّلیت کا درجہ رکھتا ہے جو ان کی کتاب 'مضامین نو' میں شامل ہے۔ وہاب اشرفی نے اپنی 'تاریخِ ادب اردو' کی جلد سوم میں حسن نعیم کی زندگی اور شاعری کو اہم موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر احمد کفیل نے حسن نعیم پر وقیع کام کیا ہے۔ ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے اپنی تحقیقی کتاب 'نئی اردو غزل' میں حسن نعیم کو نئی اردو غزل کے معماروں میں شمار کرکے ان پر ایک باب رقم کیا ہے۔ تاہم شمیم طارق کے اس مذکورہ مونوگراف کو حسن نعیم کی زندگی اور شاعری کے اعتراف میں ایک مکمل کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔

زیر نظر کتاب 'حسن نعیم' (مونوگراف) کو شمیم طارق نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدا میں ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کا 'پیش لفظ' شامل ہے جس میں انھوں نے مونوگراف کی ضرورت اور اہمیت کے تعلق سے اپنی بات رکھی ہے۔ اس کے بعد 'حرفِ مدعا' کے عنوان سے مصنف نے حسن نعیم کی نجی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے۔ اس کتاب کا پہلا باب بعنوان 'حسن نعیم: شخص اور شاعر' پر مشتمل ہے۔ اس باب کے آغاز میں حسن نعیم کی پیدائش اور وفات، بیرونی ممالک کے اسفار، ہندوستان میں شیخ پورہ (مونگیر)، پٹنہ، علی گڑھ، کلکتہ، دہلی اور ممبئی جیسی جگہوں میں قیام کا مختصر طور پر ذکر آیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں حسن نعیم کے تخلیقی وجدان، شعری افکار اور داخلی و باطنی کیفیات کا مفصل ذکر بھی کیا گیا ہے۔ شمیم طارق حسن نعیم کی متنوع شعری جہات کو مدِ نظر رکھ کر انھیں اس عہد کا نمائندہ شاعر قرار دیتے ہیں وہ حسن نعیم کو نمائندہ شاعروں میں Trend Setter کے مقام سے سرفراز کرتے ہیں۔ چونکہ مصنف کے حسن نعیم کے ساتھ ممبئی میں گہرے تعلقات رہے ہیں جس کا اندازہ کتاب کے مطالعے سے بخوبی ہوجاتا ہے اس لیے مصنف ان کی شخصیت، نفاست، توازن، خوش مزاجی اور سادہ طبیعت سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اسی بنیاد پر انھوں نے لکھا ہے کہ وہ مزاجاً طنز نگار نہیں تھے مگر غزلوں میں طنزیہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ مصنف نے حسن نعیم کی غزل گوئی میں فکر، تخئیل اور موضوع کی سطح پر خیال کا جائزہ لیا ہے اور اس تعلق سے کئی اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ پہلے باب ہی میں 'خاندان، پیدائش، تعلیم اور ملازمت' اور 'ممبئی میں قیام اور آخری سفر' ذیلی عنوانات کے تحت حسن نعیم کی زندگی کے کئی اور پہلو روشن کیے گئے ہیں جس میں حسن نعیم اور شہر بانو کے تعلقات سے بھی آگہی ہوتی ہے۔

اس کتاب کے دوسرے باب 'تخلیقی سفر' میں حسن نعیم کی ادبی جہتوں کو منظرعام پر لانے کی سعی کی گئی ہے۔ اس باب سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ حسن نعیم کے اردو میں 'اشعار' اور 'دبستان' کے نام سے دو شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ اوّل الذکر ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا اور آخر الذکر شعری مجموعے کو شہر بانو نے ان کی وفات کے بعد شائع کرایا۔ اردو کے علاوہ ان کے دو شعری مجموعے ہندی اور گجراتی رسم الخط میں بالترتیب 'غزل نامہ' اور 'اردو سخنور شیرینی' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ بعد میں 'اردو سخنور شیرینی' کو ہندی میں بھی شائع کیا گیا۔ شمیم طارق نے اس باب میں حسن نعیم کے تخلیقی سفر کی روداد، ان کی زندگی کے نشیب و فراز، ادبی اداروں سے ان کی وابستگی اور ان کے معاصرین کے خیالات پر بھی توجہ مرکوز کی ہے۔ نیز جن ذیلی عنوانات پر مصنف نے خامہ فرسائی کی ہے۔ ان میں 'ترقی پسند میلان: انحراف اور تسلسل'، 'غزل کی تازہ روایت (نئی غزل) کی آبیاری' اور 'نئے تلازمے اور تراکیب' قابل ذکر ہیں۔ اس باب میں مصنف نے اقتباسات پر کچھ زیادہ ہی انحصار کیا ہے۔

تیسرا باب 'حسن نعیم کی غزل مدح وقدح کی روشنی میں' پر مشتمل ہے جس میں شمیم طارق نے کلاسیکی اردو غزل اور جدید اردو غزل کے مزاج، موضوع، معیار اور اس میں سماجی و معاشرتی شعور کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرنا چاہی ہے۔ ان کے مطابق کلاسیکی غزل کے مطالعے، اردو تہذیب سے مکمل آشنائی اور غزل کے مزاج کو اپنا بنا لینے کے سبب حسن نعیم کی غزلوں نے ایک رنگ و آہنگ اختیار کیا۔ اس باب میں حسن نعیم 'معاصرین کی نظر

میں' کالی داس گپتا رضا، پروفیسر محمد حسن، مخمور جالندھری، وحید اختر، قمر رئیس، سید محمد عقیل، زبیر رضوی وغیرہ کے مضامین میں سے اقتباسات شامل کیے گئے ہیں۔ شمیم طارق نے محمد ہاشمی کے اُس تبصرے کو بھی اس حصے میں شامل کیا ہے جس میں حسن نعیم کی شاعری کی تضحیک وتنقیص کی گئی ہے اور پھر اس کے ردعمل میں وہاب اشرفی کے لکھے گئے جوابی تبصرہ کو بھی جگہ دی ہے۔ علاوہ ازیں مصنف نے پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے حسن نعیم کی شعری اختصاص کے حمایت میں لکھے گئے تقریباً پورے تنقیدی مضمون کو ہی اقتباس بنا کر پیش کیا ہے۔ جبکہ اتنے طویل اقتباس کو استعمال کرنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ بہرکیف شمیم طارق نے حسن نعیم کی شعری خوبیوں کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور فن کی خامیوں کی بھی حوالوں کے ساتھ نشاندہی کی ہے۔

کتاب کے آخری باب میں 'انتخاب غزلیات، آخری مجموعۂ کلام 'دبستان' سے' میں حسن نعیم کی منتخب غزلیں ہیں۔ حسن نعیم کا کل سرمایہ سخن ڈیڑھ سو اردو غزلوں پر محیط ہے جس میں بیشتر پانچ سات شعروں پر مشتمل ہیں۔ جن کی طرف 'چھوٹی چھوٹی غزلوں' کہہ کر خلیل الرحمن اعظمی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ اس مونوگراف کے آخر میں کتابیات کی فہرست دی گئی ہے۔

## دیویندر ستیارتھی (مونوگراف)

مصنف: عبدالسمیع

صفحات: 162، قیمت: 90 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، ریسرچ فیلو، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب دیوندر ستیارتھی (مونوگراف) عبدالسمیع کی تصنیف ہے۔ وہ ایک ذہین اور باصلاحیت استاد ہیں اور بنارس ہندو یونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ کر داد وتحسین وصول کر رہی ہیں، جن میں 'آڑے ترچھے آئینے' اور 'اردو میں نثری نظم' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ دیوندر ستیارتھی کی مختلف رسائل وجرائد میں بکھری اور منتشر کہانیوں کو دو جلدوں میں 'شہر شہر آوارگی' کے نام سے شائع کرایا جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی، دہلی کا یُو ا پرسکار بھی ملا۔

زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں ستیارتھی کی تخلیقی نگارشات کی روشنی میں ان کی شخصیت کو سمجھنے اور علمی و ادبی حلقوں میں ان کے کارناموں کو متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ موصوف کی یہ کوشش قابل ستائش ہے کیونکہ اس کتاب سے ستیارتھی کی ہمہ جہت شخصیت میں، ان کی قلندرانہ صفت، برصغیر اور دوسرے ممالک سے لوک گیتوں کو یکجا کرنے میں ان کی انتھک کاوش، لوک گیت کی اصطلاح کو رواج دینے میں ان کی کوشش، ہندوستان کی عظیم شخصیات سے ملاقات، لوک گیتوں کو جمع کرنے میں ان کے ذاتی تجربات، گھریلو زندگی کی بے راہ روی، مختلف رسائل وجرائد سے وابستگی، ہند اور بیرون ہند کے سفر کی روداد، خانہ بدوشی کی شروعات، خانہ بدوشی میں مختلف النوع مسائل کا سامنا، اسکول کی زندگی سے عدم دلچسپی، اس کے اسباب وعلل، گھریلو امور میں اہل خانہ کا رویہ، فطرت سے والہانہ لگاؤ، مختلف زبانوں کے ادیبوں سے گہرے مراسم وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کا مصنف نے پہلے حصے 'سوانح اور شخصیت' میں تفصیلی محاکمہ کرتے ہوئے ستیارتھی کی پیدائش (28 مئی 1908، بھدوڑ ضلع سنگرور، پنجاب) سے لے کر ان کی موت (12 فروری 2003، دہلی) تک کے تمام حالات و واقعات کو اجمال اور تفصیل کے ساتھ پیش کر کے اپنی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

دیوندر ستیارتھی صرف ایک آدمی کا نام نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے۔ جس نے پوری زندگی ادب اور تہذیب وثقافت کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے وقف کر دی۔ ایسے قلندرانہ صفت اردو ادب میں نایاب تو نہیں البتہ کمیاب ضرور ہیں۔ ستیارتھی کی شہرت کا پورا دارومدار ان کی لوک گیتوں پر قائم ہے۔ 'لوک گیت' کی اصطلاح اگرچہ ان کا وضع کردہ نہیں ہے لیکن اس اصطلاح کو رواج دینے میں ستیارتھی کا اہم رول رہا ہے۔ لوک گیت کی اصطلاح سے قبل اردو میں یہ 'دیہاتی گیت' ہندی میں 'گرام گیت' اور پنجابی میں 'پنڈو گیت' اور بنگلہ میں 'پلی گیت' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مصنف نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ سنیتی کمار چٹرجی 'لوک گیت' کے مختلف زبانوں میں مختلف نام سے مطمئن نہیں تھے اس لیے انھوں نے ستیارتھی سے کہا کہ اگر ان ناموں کے بجائے صرف لوگ گیت کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اگر یہ نام چلن میں آجائے تو بہتر ہوگا۔ ستیارتھی نے کہا آپ بنگلہ میں اسے پلی گیت کی جگہ استعمال کیجیے اردو، ہندی اور پنجابی میں میں کوشش کروں گا۔ ستیارتھی کی کوششوں سے یہ اصطلاح نہ صرف ادبی حلقوں میں متعارف ہوئی بلکہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی اسی اصطلاح کا استعمال شروع ہوا اور آج بھی انھیں لوک گیت ہی کہا جاتا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ 'دیوندر ستیارتھی کی افسانہ نگاری' پر مشتمل ہے۔ اس میں مصنف نے ستیارتھی کی افسانہ نگاری کو ان کے افسانے 'نئے دیوتا'' اور بنسری بجتی رہی' اور 'شہر شہر آوارگی' کی روشنی میں پرکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مذکورہ افسانوں کا تجزیاتی محاکمہ پیش کرتے ہوئے فن افسانہ نگاری میں ان کی اہمیت، افسانوں کی تکنیک، اس کے اسلوب اور موضوعات ومسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے ستیارتھی کے نظریاتی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا احساس ہوتا ہے۔ کئی افسانے ایسے ہیں جن کا ذکر کتاب میں ہوا ہے جو اس احساس کو مزید تقویت پہنچاتے ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ 'دیوندر ستیارتھی کے لوک گیت' پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں ان کی لوک گیتوں پر مشتمل ایک کتاب 'گائے جا ہندوستان' کا تنقیدی و تجزیاتی محاسبہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ستیارتھی نے لوک گیتوں کو اس کتاب میں کس طرح دیکھنے کی کوشش کی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں شاعری، تنقید اور لوک گیت کردار کے طور پر آئے ہیں، یہ خود اپنی باتیں کرتے ہیں اور اپنا دفاع بھی کرتے ہیں۔ اس طرح لوک گیتوں کو پڑھتے ہوئے تخلیق کار کے ذوق جمال اور اس کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

کتاب کا چوتھا حصہ 'دیوندر ستیارتھی کے خاکے' کے عنوان سے ہے۔ اس میں مصنف نے ان کی ان تحریروں کو شامل کیا ہے جو شخصی نوعیت کے ہیں۔ ان کے خاکے مروجہ خاکوں سے مختلف ہیں۔ مصنف نے ان کے چند خاکوں کی روشنی میں صنف خاکہ نگاری میں ان کی اہمیت وافادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح وہ لوک گیت کو مرکز میں رکھ کر کسی خطے کی تاریخ، تہذیب اور تمدن کا جال بننے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح اپنے شخصی مضامین میں بھی کسی شخصیت کو سامنے رکھ کر اس کی زندگی، طرز عمل اور عادات واطوار کا بیان کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ ان پر افسانے کا گمان گزرتا ہے۔ کتاب کے آخر میں ستیارتھی کی تخلیقات کا مختصر انتخاب شامل ہے۔ اس میں نئے دیوتا، جنم بھومی، پریوں کی باتیں، کفن میں ایک سوا ایک سال، یوپی کی لوری، منی پور کی وادی میں اور ہندوستانی لوریاں اور لوک گیت قابل ذکر ہیں۔ کتابت وطباعت، دیدہ زیب سرورق اور قیمت کے اعتبار سے یہ اچھی کتاب ہے۔ امید ہے علمی و ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

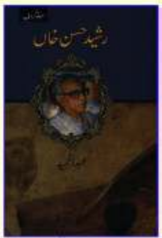

## رشید حسن خاں (مونوگراف)

مصنف: عبدالحمید
صفحات: 122، قیمت: 75 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: مومنہ خاتون، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو ادب میں رشید حسن خان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے تحقیق و تدوین کے میدان میں اس معتبر روایت کی توسیع کی ہے جو قاضی عبد الودود، حافظ محمود شیرانی اور مولانا امتیاز علی عرشی نے قائم کی تھی۔ ان دونوں میدانوں میں انھوں نے اپنی وسعت نظری، ژرف نگاہی، دقت نظری اور وسعت مطالعہ کے ذریعے اپنی منفرد شناخت قائم کرتے ہوئے آنے والے محققین اور مدوّنین کے لیے مثالی نمونہ فراہم کیا ہے۔ انھوں نے تنقید، تحقیق، تدوین، اردو املا، صحت زبان، زبان وقواعد، اصلاح سخن، معائب سخن، تذکیر وتانیث جیسے اہم موضوعات پر گرانقدر کارنامے انجام دیے۔

زیر تبصرہ کتاب 'رشید حسن خاں' (مونوگراف) ڈاکٹر عبدالحمید کی تازہ ترین تصنیف ہے جس میں رشید حسن خاں کے مذکورہ تحقیقی اوصاف اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے مختصر وقت میں ان کے علمی و ادبی اور تحقیقی کارناموں سے واقف کرایا جا سکے۔ کونسل کی یہ پیش رفت قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر عبدالحمید کا علمی و ادبی مرکز تحقیق کا میدان ہے انھوں نے رشید حسن خاں کی علمی فتوحات پر ایک جامع تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ 'سوانحی کوائف' پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں رشید حسن خاں کی پیدائش سے لے کر تا دم مرگ ان کے علمی و ادبی سفر کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے تاکہ قاری کم وقت میں زیادہ سے زیادہ استفادہ کر کے ان کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کر سکے۔ کتاب کا دوسرا حصہ 'تحقیق' ہے جس میں باغ و بہار، فسانۂ عجائب، مثنوی گلزار نسیم، مثنویات شوق، زٹل نامہ، مثنوی سحر البیان، مصطلحات ٹھگی جیسی اہم کتابوں کی تدوین کر کے ان سب کو ان کے اصل متن کی روشنی میں اپنی تحقیق پیش کی ہے جن کا ڈاکٹر عبدالحمید نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے اور ان کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے ساتھ ہی ان کی اہم تحقیقی کتاب 'ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ' تحقیق، تدوین، روایت میں رشید حسن خاں نے ادبی تحقیق کے جو معیار اور اصول قائم کیے ہیں انھیں کی روشنی میں مصنف نے اپنی بات کو آگے بڑھایا ہے اور ان کے پیش کردہ اصول ونظریات سے اتفاق بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ مذکورہ بالا کتابوں میں تحقیق کے اصول اور طریقہ کار کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ کتاب کا تیسرا حصہ 'تدوین' ہے۔ اس حصے میں مصنف نے باغ و بہار، فسانۂ عجائب، مثنوی گلزار نسیم، مثنویات شوق، زٹل نامہ، مثنوی سحر البیان، مصطلحات ٹھگی وغیرہ کی تدوین کرتے وقت اس کے اصول وضوابط کی روشنی میں حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور تدوین کرتے وقت منشاء مصنف کا خیال بھی رکھا ہے۔ اردو تدوین کے جو اصول اور طریقہ کار ہیں ان کی روشنی میں انھوں نے مذکورہ کتابوں کی تدوین کے اصول وضوابط مثلاً متن اور روایت متن، تالیف متن، تنقید متن، تحقیق متن، تاریخ متن، تاریخ کتابت متن، تاریخ طباعت متن، تصحیح متن، ترتیب متن، تحشیہ متن اور تعلیقات متن کی روشنی میں تدوین کا فریضہ انجام دیا ہے۔

کتاب کا چوتھا حصہ 'تنقید' کا ہے۔ رشید حسن خاں محقق و مدون کے علاوہ ایک اچھے نقاد بھی تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا زیادہ تر حصہ زبان و بیان، املا، لسانیات اور قواعد وغیرہ سے متعلق ہے۔ 'تلاش وتعبیر' 'تفہیم' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر عبد الحمید نے رشید حسن خان کی تنقیدی بصیرت کو ان کی مذکورہ کتاب کی روشنی میں پرکھنے اور ان کا تفصیلی محاکمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا پانچواں حصہ 'املا اور قواعد' سے متعلق ہے۔ اس میں زبان وبیان اور قواعد واملا سے متعلق مضامین کا اجمالی طور پر تجزیہ کرتے ہوئے صحت الفاظ، مشترک الفاظ، لغت اور استعمال عام، ملائی- بالائی وغیرہ کو مثالوں کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مذکورہ تمام موضوعات پر رشید حسن خان نے محققانہ رویہ اختیار کیا ہے اور ان موضوعات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ زبان اور قواعد سے متعلق ان کی دیگر تصانیف میں اردو املا، عبارت کیسے لکھیں، اردو کیسے لکھیں، انشا اور تلفظ وغیرہ کو پڑھتے ہوئے لسانیات پر کمال کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے زبان و بیان، تلفظ اور املا سے متعلق جو جو خامیاں اس وقت در آئی تھیں ان سب کی حتی الامکان اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی یہ کوشش کامیاب بھی رہی ہے۔ رشید حسن کی مذکورہ تمام کوششوں کو عبدالحمید نے اس کتاب میں اجمالاً ہی سہی پیش کرنے کوشش کی ہے۔ کتاب کا آخری حصہ 'نمونہ مضامین' کے عنوان سے ہے۔ جس میں عبدالحمید نے رشید حسن خاں کے کچھ اہم مضامین مثلاً کچھ اصول تحقیق کے بارے میں، زبان و بیان، طریق کار، شہرت، روایت اور تحقیق کے علاوہ ملائی۔ بالائی قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ مضامین کو نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے تاکہ ان کی تحقیق، تدوین اور تنقید سے متعلق وسعت مطالعہ اور فکری جہت کو واضح کیا جا سکے۔ مثلاً انھوں نے اپنے ایک مضمون 'ملائی۔ بالائی' میں ملائی اور بالائی کے اصل موجد کون تھے، پہلی بار کس نے کہاں استعمال کیا، اس کی اصل کیا ہے، علمائے لغت نے کسے اصل قرار دیا ہے اس پر تحقیقی نقطہ نظر ڈالی اور تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ 'یہ مان لینا چاہیے کہ یہ دونوں لفظ پہلے بھی فصیح تھے اور اب بھی فصیح ہیں جو صاحب چاہیں 'بالائی' کہیں اور جس کا جی چاہے 'ملائی' کہے۔ گفتگو اور تحریر میں بعض مقامات ایسے بھی آسکتے ہیں جہاں صرف حسن بیان کے لحاظ سے فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کہاں پر ان میں سے کون سا لفظ کھپایا جائے'۔ اس طرح سے اس کتاب میں شامل تمام مضامین مصنف کی تحقیقی بصیرت اور اس سے والہانہ لگاؤ کی عکاس ہیں۔ ایسی کتابیں ادب کے ہر طالب علم کے پاس ہونی چاہیے اور اس کا مطالعہ بھی کیا جانا چاہیے تاکہ ہم سب کے اندر بھی تحقیقی بصیرت کا مادہ پیدا ہو سکے۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے، کتابت اور طباعت بھی بہتر ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔ کونسل کی اس طرح کی کاوش ادب کے طالب علموں کے لیے سودمند ثابت ہوگی۔ امید ہے ادبی حلقوں میں اس میں پذیرائی ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

# تحقیق و تنقید

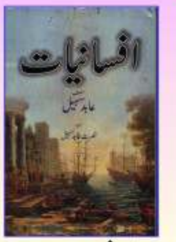


## افسانیات

مصنف: عابد سہیل، مرتبہ: نصرت عابد سہیل
صفحات: 168، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: ظفر عالم، A-41 نفیس روڈ بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

زیر نظر کتاب فکشن کے مشہور قلم کار عابد سہیل کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، جسے نصرت عابد سہیل نے مرتب کیا ہے۔ کتاب کو پانچ عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ اول سرخی 'ملاقاتیں' جس میں پہلا مضمون 'ایک گفتگو' جو کہ ممتاز عالم اور عابد سہیل کے سوال وجواب پر مبنی ہے، اس میں عابد سہیل نے افسانہ، ناول پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا مضمون، 'واقعے سے افسانے تک' نیر مسعود، عابد سہیل، انیس اشفاق، کی نادر گفتگو پر مشتمل ہے۔ یہ مضمون افسانے سے متعلق تمام بنیادی مسائل اور رجحان کا تفصیل سے احاطہ کرتا ہے۔

دوسری سرخی 'نظریات' کے عنوان سے ہے۔ جس میں پہلا مضمون 'آج کا افسانہ چند زاویے' میں مصنف نے ترقی پسند اور جدیدیت تحریک کی بین الاقوامی خصوصیات بیان کرنے کے بعد اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ موجودہ دور کے افسانہ نگاروں نے بھی معنی خیز افسانے تخلیق کیے ہیں۔ اس سلسلے سے متعلق انھوں نے، شوکت حیات کا افسانہ 'گنبد کے کبوتر'، غضنفر کا 'پرزہ'، عبدالصمد کا 'سحرالبیانی'، طارق چھتاری کا 'نیم پلیٹ' پر بہترین خامہ فرسائی کی ہے۔ دوسرا مضمون 'نئی حقیقت پسندی اور اردو افسانہ' میں اردو کے کئی مشہور افسانہ نگاروں کے حوالے سے فکشن کی نئی حقیقت پسندی کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔

'مطالعے' کے عنوان میں مصنف کے چھ مضامین شامل ہیں، پہلا 'قمر رئیس اور افسانے کی پرکھ: یلدرم سے رتن سنگھ تک' میں قمر رئیس کی افسانہ فہمی کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا ہے۔ قمر رئیس کا اپنے پیش روؤں سے لے کر رتن سنگھ کی فکشن نگاری کے تئیں کیا خیال تھا اس پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ تین افسانے: الاؤ، بالکونی، متھن میں مصنف نے تینوں افسانوں کا بہترین تجزیہ کیا ہے۔ پہلا سہیل عظیم آبادی کا افسانہ 'الاؤ' جسے مصنف نے کسان تحریک پر اردو کا سب سے پہلا افسانہ تسلیم کیا ہے۔ عابد سہیل نے اس افسانے کی مکالمہ نگاری کو کمزور بتایا ہے۔ 'بالکونی' جو کہ کرشن چندر کا افسانہ ہے۔ مصنف نے اس افسانے کی فنی خوبی اور خامی کی وضاحت بہترین پیرائے میں کی ہے۔ 'متھن' کے بارے میں عابد سہیل کا خیال ہے کہ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں سب سے منفرد ہے، جس کا جواز انھوں نے یہ تلاش کیا ہے کہ بیدی نے اس افسانے میں عورت کو باہمت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'اقبال متین کے تین افسانے (ایک غیر رسمی سا تنقیدی مطالعہ)' ایک ایسا مضمون ہے جس میں مصنف نے اقبال متین کی زندگی کے کچھ اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے، اور ان کے تین افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ 'آ گہی کے ویرانے' پر عمیق نگاہ ڈالتے ہوئے سب سے اچھا افسانہ تسلیم کیا ہے۔ موصوف کے دوسرے دو افسانوں کینڈل کالونی، یہ کس کی تصویر ہے؟، کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ محاکمہ کیا ہے جس سے افسانہ نگار کی فنی کاوشوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ 'دھمک: ایک مطالعہ' عبدالصمد کا ایک بہترین ناول ہے، اس کے بارے میں عابد سہیل کا خیال ہے کہ مصنف نے روایتی انداز سے انحراف کرتے ہوئے زندگی کو نت نئے پہلو سے دیکھنے اور دکھانے کی سعی کی ہے۔ عبدالصمد کے افسانے ('سیاہ کاغذ کی دھجیاں کی روشنی میں') مصنف نے مذکورہ مجموعے میں شامل افسانوں کے اہم نکات کی وضاحت تفصیل سے کی ہے اور کہا ہے کہ سیاہ کاغذ کی دھجیاں' کے تیرہ افسانے، مجموعی طور سے 'فصل بہار کا اثبات' کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن اسے اصطلاحی طور پر رجائی نقطہ نظر کہنا غلط نہ ہوگا کیونکہ 'بہار کا اثبات' صرف اس کی خواہش پر اسرار ہے، عبدالصمد کے افسانے climex پر کسی اچانک موڑ سے پیدا ہونے والے لطف پر انحصار نہیں کرتے، اس مجموعے کا کوئی افسانہ ایسا نہیں جس میں کسی نہ کسی مسئلہ پر واقعات کرداروں اور ان کے درمیان کے عمل اور رد عمل کے حوالے سے متوجہ نہ کیا گیا ہو۔ ان میں ذہنی تحریکات ضرور ہیں لیکن option کھلے ہوئے ہیں۔

عبدالصمد کے یہاں افسانہ واقعات اور کرداروں کی مطابقت اور ان کے درمیان کی داخلی کشمکش سے خود کو آشکار کرتا ہے۔ وہ مطابقت اور کشمکش کو مرکز توجہ بنانے کے لیے مصنوعی تکنیک کا سہارا نہیں لیتے۔ انھیں احساس رہتا ہے کہ ترسیل وابلاغ میں مدد نہیں کرتا بلکہ رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے''۔ مذکورہ بالا نکات سے عبدالصمد کے افسانوی مجموعے کے تاثر کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ کتاب میں شامل اقبال مجید کا افسانہ 'اضطراب' جو کہ ایک دلچسپ افسانہ ہے اس افسانے کے ذریعے موجودہ دور کے سماجی مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دراصل جدید دور کی سائنسی ایجادات نے جہاں انسانوں کی زندگی کو پر لطف بنایا ہے، وہیں دوسری طرف ایک ایسے سماج کی تعمیر وتشکیل بھی ہو رہی ہے، جو نئی نسل کے لیے مضر ثابت ہو رہے ہیں۔ مجموعی طور پر اقبال مجید نے مشرقی زندگی میں راہ پانے والی خرابیوں کا بہت خوبصورتی سے محاکمہ کیا ہے۔

'افسانے' کی سرخی کے تحت خود مصنف کے اجنبی، ملاقات اور پیر محمد کے نام سے تین افسانے شامل ہیں۔ 'اجنبی' میں مصنف نے بڑے الجھے الجھے انداز سے کلائمکس تیار کیا ہے۔ افسانے کی متعدد بار قرأت کرنے کے بعد بھی قاری کو وہم میں مبتلا ہونا پڑے گا کہ مصنف کس طرح کی اجنبیت پیش کرنا چاہتا ہے۔ میرے خیال سے یہ افسانہ حالت عجلت میں تحریر کیا گیا ہے۔ 'ملاقات' جو کہ ایک بہترین پیرائے میں بیان کیا ہوا افسانہ ہے جس میں اول تا آخر پڑھنے والے کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اس افسانے میں انسانی نفسیات کو بہت خوبصورت انداز سے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'پیر محمد' ایک روایتی انداز میں تحریر کیا ہوا افسانہ ہے اور ایک بوڑھے ڈرائیور کی کہانی ہے۔ جو کسی کالج کے پرنسپل کا ڈرائیور تھا لیکن ریٹائر ہونے کے بعد بھی اسے اپنے پیشے سے منسلک ہونا پڑا۔ دراصل یہ شخص تین لڑکیوں کا باپ ہے۔ بڑی لڑکی کسی بیماری کے سبب چل بسی، دوسری کی شادی ہو جاتی ہے، تیسری جو کہ سب سے چھوٹی ہے دل کی مریضہ ہے۔ اس کے علاج کے لیے پیر محمد لوگوں کو کار چلانا سکھاتا ہے تاکہ ان پیسوں سے اپنی بیٹی کا علاج کرا سکے۔ ایک دن اس کی چھوٹی بیٹی کا انتقال ہو جاتا ہے جسے وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ بیٹی کے انتقال سے پیر محمد بہت افسردہ ہو جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد وہ بھی اس دار فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔ درحقیقت افسانے کے ذریعہ سماجی مشکلات سے انسان پر جو منفی اثرات ثبت ہوتے ہیں اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں ایچ جی ویلس، کے ناول 'The Invisible Man') کا مختصراً تنقیدی جائزہ 'دیباچہ: غیر مرئی انسان' کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے۔ جسے مصنف نے بہت غور وخوض کے بعد تحریر کیا ہے۔

آخر میں اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب میں کمپوزنگ کی کافی غلطیاں ہیں۔ بہرکیف مجھے امید ہے کہ آئندہ درستگی کا خیال رکھا جائے گا۔

## تنقیدی بحثیں

مصنف: عباس رضا نیر
صفحات: 223، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: جمیرا خاتون، 1033،
حویلی بختاور خان، ٹیامحل، جامع مسجد دہلی

زیر تبصرہ کتاب تنقیدی بحثیں ادبی تنقید کا ایک نمونہ ہے جس میں مختلف اوقات میں لکھے گئے وہ مضامین ہیں جو بین الاقوامی سمیناروں میں پڑھے گئے ہیں اور ادبی جریدوں میں شائع بھی ہوئے۔ اس کتاب میں کل 14 مضامین ہیں جس میں اردو کے نامور ادیبوں جیسے انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، مجروح سلطان پوری، فراق گورکھپوری، باقر دہلوی، ابوالکلام آزاد، پریم چند کے تخلیقی سرمائے کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

ان مقالات کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے کتاب کی فہرست پر نظر ڈالنا ضروری ہے کہ یہ مقالات کتنے اہم موضوعات پر مشتمل ہیں۔ کتاب کا پہلا مضمون 'بہادر شاہ ظفر اپنے نصیب کی تماشہ گاہ' ہے۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے کہ وقت اور نصیب کی تماشہ گاہ میں بہادر شاہ ظفر اس اکیلی ذات کا نام ہے جو اپنی محرومیوں، مجبوریوں کا خود تماشہ گاہ بھی ہے اور تماشائی بھی، قاری نے بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے پس منظر میں ان کی تین نمائندہ غزلوں کے محاکمے کی کوشش کی اور تینوں غزلوں کے مسلسل اشعار کو تعبیر و تفہیم کے اس سلسلے میں شامل کیا ہے۔ یہ غزلیں شاعر کی زندگی کا پس منظر بیان کرتی ہیں اور ان غزلوں کو سامنے رکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر اپنے نفسِ مضمون کو اظہار کا پیرایہ عطا کرنے میں کہاں تک کامیاب ہیں۔ مصنف نے یہ واضح کرنے کی سعی کی ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری ان کی نجی زندگی کی حقیقت ہے۔

کتاب کا دوسرا مضمون 'جہد آزادی اور مسدس افق' ہے۔ جس میں لکھنو کے شاعر منشی دوارکا پرشاد افق کی اردو شاعری پر ان کے 'مسدس افق' کا بخوبی تجزیہ کیا گیا ہے مصنف کا کہنا ہے کہ افق کا کلام اپنے عہد میں ہندوستانی عوام کو نئی تہذیب کی چکاچوند میں گم ہوجانے کی بجائے اپنی پرانی جڑوں کی طرف پلٹنے اور مضبوط کرنے کا احساس کراتا ہے اور ساتھ ہی ہندوستانی عوام کو اپنی مادری زبان اور مشرقی علوم کی اہمیت کا احساس بھی دلاتے ہیں۔

'اپنی زمین اور اپنی تہذیب کا شاعر: فراق' میں مصنف نے فراق کی زندگی کے چند پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی شاعری میں موجود ازدواجی زندگی کی شدید تلخیوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جہاں ان کا غم ان کا مرہم ہوجاتا ہے اور دکھ درد، کامیابی و ناکامی مختلف احساسات میں تحلیل ہوکر ایک وجدانی کیفیت اختیار کر لیتے ہیں۔

کتاب کا اگلا مضمون 'ہند، فارس اور ن م راشد: ایران میں اجنبی' کا تجزیہ ہے۔ ایران میں اجنبی، ن م راشد کی تیرہ مسلسل نظموں کا مجموعہ ہے جس کو زیر بحث لاکر مصنف نے مجموعے کی ہر نظم کا الگ الگ تجزیہ کیا ہے۔ من وسلوی، میزان، نارسائی، ہمہ اوست، مارسیا، دست ستمگر، درویش، وغیرہ کا مختصر مگر جامع تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ن م راشد نے ایرانی کرداروں، علامتوں، ثقافتوں اور منظر ناموں کے حوالوں سے اپنی نظموں کو موثر اور معتبر بنایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایران میں اجنبی راشد کی اہم نظم ہے اور مصنف کے اس جامع مضمون نے اس مجموعے کی اہمیت کو سمجھنے میں اور بھی زیادہ آسانی پیدا کی ہے۔

کتاب کا اگلا مضمون 'مجروح کی شعری جمالیات' ہے۔ اس مضمون میں مجروح سلطان پوری کی شاعرانہ خوبیوں کو لے کر بحث کی گئی ہے۔ مجروح کی غزلوں میں جو نزاکت و لطافت، لفظوں کی ترتیب و ترکیب کا انداز پایا جاتا ہے اسے مصنف نے مثال کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا اگلا مضمون 'دیہی زندگی کی کشاکش اور پریم چند ہے۔ جس میں پریم چند کے مشہور افسانے 'پوس کی رات' کے حوالے سے دیہی زندگی کی کشاکشوں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اختری بیگم: ایک تہذیبی دستاویز کتاب کا اگلا مضمون ہے۔ جس میں مصنف نے اردو کے مشہور ناول نگار مرزا ہادی رسوا کے ایک ناول 'اختری بیگم' میں اودھ کے تہذیبی عناصر کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور ناول کے مختلف پیراگراف کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ امراو جان اور شریف زادہ میں موجود تہذیبی عناصر اختری بیگم میں بھی ملتے ہیں اس لیے اسے نظر انداز کرنا غلط ہے۔ 'قرۃ العین کا تخلیقی سفر ایک مجموعی جائزہ' کتاب کا اگلا مضمون ہے۔ اس مضمون میں قرۃ العین کے پانچ ناول میرے بھی صنم خانے، سفینہ غم دل، آگ کا دریا، آخر شب کے ہمسفر، کار جہاں دراز کے علاوہ چاندنی بیگم اور سیتا ہرن جو کہ ایک ناولٹ ہے مصنف ان سبھی ناولوں کا مختصر خلاصہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ناول نگار کے ناول لکھنے کی اہم وجوہات، حالات و واقعات کی روشنی میں قراۃ العین کے تخلیقی سفر کا جائزہ پیش کیا ہے۔

کتاب کے اگلے دو مضمون 'اردو صحافت کا مجاہد اول: مولانا باقر دہلوی' اور 'اردو صحافت اور مولانا ابوالکلام آزاد' دونوں مضامین میں اردو صحافت کی تاریخ کے اہم صحافیوں پر بطور مجاہد آزادی اور بحیثیت صحافی بحث کر کے ان کے کردار و زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں 'منشی نولکشور اور مرزا غالب' اور 'بیسویں صدی میں لکھنو کا اردو ادب' بھی معیاری مضامین ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنف کی یہ کتاب ادب کی تفہیم کے لیے اور قاری کو اردو ادب کے اہم گوشوں کو سمجھنے کے لیے معاون ثابت ہوگی۔

## سکندر فہمی

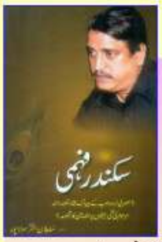


مرتب: سلطان اختر
صفحات: 134، قیمت: 200 روپے
ناشر: عبدالفاروقی فاؤنڈیشن شولاپور
مبصر: ابرار احمد اجراوی، ایٹ+پوسٹ اجرا، وایا رایام فیکٹری، ضلع مدھوبنی، بہار

سکندر احمد (2013-1958) عصر حاضر کے نامور فکشن نقاد تھے۔ ان کا اسلوب نقد تجزیاتی اور وضاحت و علمیت سے مملو تھا۔ حالاں کہ رسمی طور پر وہ بینک میں ملازمت کرتے تھے، مگر انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے فکشن تنقید کے باب میں نئے سنگ میل قائم کیے۔ شمس الرحمٰن فاروقی بھی ان کے اسلوب تنقید اور فکشن تنقید کے باب میں ان کی جدت پسند طبیعت کے مداح رہے تھے۔ وہ اردو ادبیات کے ساتھ انگریزی ادب و تاریخ کا بھی گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ وہ فرسودہ تنقیدی روش کے پیرو نہیں تھے۔ انھوں نے صرف فکشن کو محور بنا کر نئے سرے سے تنقیدی روایت کو تقویت بخشی۔ ان کی کتاب 'مضامین سکندر احمد' اردو کے موجودہ تنقیدی سرمایے میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن افسوس کہ انھیں زیادہ عمر نصیب نہ ہوسکی اور وہ 55 سال کی عمر میں ہی اردو کی تنقیدی دنیا کو سوگوار چھوڑ گئے۔ معاصر تنقیدی منظر نامے میں ان کا قد بہت اونچا تھا، اس لیے ان کے تنقیدی کام سے دنیائے ادب کو واقف کرانے کے لیے احباب نے ان کی شخصیت اور خدمات کو مرکز بنا کر 5 جنوری 2015 کو ایک قومی سیمینار کا انعقاد کیا۔ سیمینار

سے پہلے ان کی بیگم غزالہ سکندر بھی ان کی پہلی برسی پر ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ مرتب کر کے انھیں شایان شان خراج عقیدت پیش کر چکی تھیں، مگر ان کے کارناموں پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے مقصد سے یہ سمینار منعقد کیا گیا تھا، اس سمینار میں بھی کچھ ایسے مضامین پڑھے گئے، جس میں معروضیت کو کم، ان سے عقیدت اور محبت کے عناصر کا ہی غلبہ تھا، مگر کچھ مقالہ نگاروں نے غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے صرف ان کے فن اور ان کی تنقیدی خدمات پر اپنی بحث مرکوز رکھی ہے۔ اس سمینار میں ملک کے ارباب علم و ادب نے شرکت کی اور ان کی تنقیدی خدمات کے مختلف گوشوں پر اپنے وقیع مقالات پیش کیے۔

زیر نظر کتاب 'سکندر فہمی' کل 13 مقالات پر مشتمل ہے۔ دو مضامین میں سکندر احمد کے تنقیدی اور عروضی مضامین و مقالات سے منتخب اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ اخیر میں ان کے تنقیدی مضامین پر مشاہیر علم و ادب کے تأثرات کو بھی مختصراً جمع کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں عکس سکندر احمد اور توشیحی جائزے کے عنوان سے سکندر احمد کی ادبی زندگی کے مختلف تنقیدی اور ادبی پڑاؤ کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عکس سکندر احمد میں سکندر احمد کے قلم سے نکلنے والے تمام اردو اور انگریزی مضامین کے عناوین کا ذکر بھی کیا گیا ہے، جس سے قاری کو بیک نظر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ انھوں نے زبان و ادب اور نظریاتی اور عملی مباحث سے متعلق کن موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا کہ سکندر احمد کا ذہنی میلان علم عروض اور اس کی مختلف شاخوں کی طرف تھا، اس لیے انھوں نے اس مشکل فن پر 9 مفصل مضامین لکھے ہیں، جو اس وقت ملک کے اہم اور معیاری ادبی رسائل میں شائع ہوئے تھے اور اہل ذوق نے انھیں بنظر تحسین دیکھا تھا۔ انھوں نے مابعد جدیدیت اور لسانیات کو بھی مرکز مطالعہ بنایا اور اس پر تفصیلی مضامین لکھے۔

زیر تبصرہ کتاب میں جن مشاہیر کے مضامین شامل ہیں، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ سکندر احمد کے مضامین کے تأثرات (پروفیسر نرنجن سنگھ تسنیم)، مضامین سکندر احمد کا مطالعہ (رفیق شاہین)، اکیسویں صدی میں اردو ادب کی تنقید کا توانا نام (رفیق جعفر)، سکندر احمد: اردو تنقید کا ایک رویہ (ڈاکٹر اشفاق انجم)، نقد افسانہ کا روشن استعارہ (ڈاکٹر غضنفر اقبال)، مطالعۂ مضامین سکندر احمد (ڈاکٹر عبید اللہ چودھری)، سکندر احمد لسانی، ادبی اور عروضی خدمات (ڈاکٹر شبیر اقبال)، سکندر احمد کے بے باک ادبی نظریات انٹرویو کی روشنی میں (ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار)، سکندر احمد کے انٹرویو (ڈاکٹر عبد الرشید شیخ)، قرۃ العینیت اور سکندر احمد: قلیل حیات اور جامع خدمات (شمس الضحیٰ اسرائیل)، سکندر احمد: مختلف جہتوں کا شاعر (امان افسر)، سکندر احمد ایک ابھرتا ستارہ جو ڈوب گیا (سردار سلیم) ان عناوین سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ مضمون نگاروں نے سکندر احمد کی شخصیت پر صرف تأثراتی اور جذباتی قسم کی تحریر نہیں لکھی ہے، بلکہ ان کے ادبی سرمایے سے مکالمہ قائم کرتے ہوئے، ان کی ادبی اور تنقیدی زندگی کے مختلف گوشوں سے مباحثہ بھی کیا ہے۔

سارے مضمون نگاروں نے ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ان کی تنقید نویسی اور ان کی عروض شناسی کے فن کو مطمح نظر بنایا ہے۔

کتاب میں پروف کی بھی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ ان باتوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو یہ کتاب سکندر فہمی کی تنقیدی معروضات کے تعارف کے باب میں سنگ میل ثابت ہوگی۔ تاہم کتاب کی قیمت کچھ زیادہ رکھ دی گئی ہے۔

## ادب جہاں

مصنف: ڈاکٹر معصوم شرقی
صفحات 347 قیمت: 300 روپے
ناشر: تخلیق کار پبلشرز، دہلی
مبصر: ثاقب عمران، گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'ادب جہاں' ڈاکٹر معصوم شرقی کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کا تعلق مغربی بنگال سے ہے۔ ان کی بنیادی پہچان تو ایک شاعر کی ہے لیکن تحقیقی و تنقیدی میدان میں بھی خاصا درک رکھتے ہیں جن کے متعلق پروفیسر کوثر مظہری کی یہ بات بالکل درست ہے کہ ''ان کے نثری اسلوب میں بھی کاٹ اور کساؤ خوب خوب ہے۔'' بہر حال زیر تبصرہ کتاب میں شاعری، تنقید، ناول، افسانہ، مراسلہ اور سفرنامہ کے تعلق سے کئی مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کے متعلق مصنف نے 'حرف خود' میں لکھا ہے کہ ان میں سے بیشتر مضامین کتابی صورت میں آنے سے پہلے رسائل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جو مضامین خصوصیت کے حامل ہیں ان میں راہی معصوم رضا کا آدھا گاؤں، ندی: تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ، ندیا کہاں ہے تیرا دیش: ایک مطالعہ، ایک تجزیہ، مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت: خطوط کے تناظر میں اہم ہیں۔

راہی معصوم رضا کا ناول 'آدھا گاؤں' بعض وجوہ سے پہلے ہندی زبان میں شائع ہوا تھا۔ 2003 میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے بحیثیت مترجم ناول کو اردو زبان میں شائع کیا ہے۔ صاحب کتاب نے اس جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ صرف رسم الخط کی تبدیلی کے ذریعہ ناول کو پہلے اردو سے ہندی میں شائع کیا گیا اور بعد میں اسے اردو رسم الخط کا لباس پہنا دیا گیا۔ جہاں تک ترجمہ کرنے کا معاملہ ہے تو صاحب کتاب نے یہاں تک کہا ہے کہ ''اس ناول کا ترجمہ تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔'' لیکن ادب میں اس طرح کی باتیں مناسب نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی مترجم اس کام کو بھی کر گزرے۔

صاحب کتاب نے شموئل احمد کے ناول 'ندی' کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ دراصل شموئل احمد نے اس ناول میں جس پہلو کو ابھارنے کی کوشش کی ہے اسے موجودہ زمانے میں Marital Rape کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کا اظہار زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے بھی کیا ہے۔ مضمون کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک چیز کہیں نہ کہیں ذہن میں الجھن پیدا کرتی ہے کہ مصنف نے ناول 'ندی' کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے یا اس ناول پر لکھے جانے والے مضامین کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ چونکہ مضمون دوسری بات پر دلالت کرتا ہے اس لیے ممکن ہے انھوں نے قنبر علی کی ترتیب کردہ کتاب 'ندی: تجزیاتی مطالعہ' کا ہی تجزیہ کیا ہو۔ صاحب کتاب نے جہاں مضامین کا تجزیہ کیا ہے وہیں ناول کے متعلق ان کی اپنی آرا اصل متن کے مطالعے پر اُکساتی ہیں۔

'ندیا، کہاں ہے تیرا دیش: ایک مطالعہ، ایک تجزیہ' کے تحت صاحب کتاب نے شہزاد منظر کے چودہ افسانوں کا تجزیہ بحسن و خوبی کیا ہے۔ ابوالکلام آزاد پر لکھی جانے والی تحریر اہم ضرور ہے لیکن اصل مضمون کی ابتدا ہونے تک تقریباً چار صفحات گزر جاتے ہیں۔ ان صفحات میں مصنف نے خطوط نگاری کی اہمیت پر گفتگو کی ہے اور ساتھ ہی مولانا آزاد کی خطوط نگاری کی اہمیت کے سلسلے میں مختلف لوگوں کی آراء جمع کر دی ہیں۔ جبکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ مصنف چند سطروں کی تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف آ جاتا۔ اس کے بعد کی تحریر موضوع کا ساتھ بھی دیتی ہے اور اس کا مطالعہ قاری کی معلومات میں اضافے کا کام کرتا ہے۔

اس کے علاوہ مجھے ایک اہم مضمون 'کلکتے کا ادبی ماحول: بیسویں صدی میں' کا مطالعہ

کرنے کا موقع ملا۔ ناول، افسانے، شاعری یا شخصیت پر تو مضامین بہت مل جاتے ہیں لیکن 'کلکتے کا ادبی ماحول: بیسویں صدی میں' جیسا مضمون انفرادیت کا حامل ہے ساتھ ہی محنت اور وقت کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ صاحب کتاب نے اس مضمون کے تحت سب سے پہلے بنگال کے منظرنامے پر اردو ادب کی ترویج واشاعت کے حوالے سے اجمالاً گفتگو کی ہے۔ اسی ترقی کو مزید جلا بخشنے میں جو شعرا بیسویں صدی میں پیش پیش رہے اور جو آج بھی مغربی بنگال کے ادبی ماحول کو جلا بخشنے میں سرگرم عمل ہیں ایسے ہی شعرا میں سے چند کا تذکرہ کرتے ہوئے صاحب کتاب نے پچاس شعرا کو منتخب کیا ہے۔ انھوں نے منتخب شعرا کا مختصر سوانحی احوال پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے منتخب اشعار اور غزلوں کو بھی پیش کیا ہے تاکہ قارئین خود بھی اس بات کا فیصلہ کر سکیں کہ مغربی بنگال میں ہونے والی شاعری کا معیار کیا ہے۔ ان شعرا کے احوال بیان کرتے ہوئے انھوں نے صرف سوانحی حالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان شعرا کے کلام پر بھی ان کے تنقیدی خیالات دیکھے جا سکتے ہیں۔

کتاب کی اشاعت کی بات کریں تو کتاب کا کاغذ عمدہ اور اس کی چھپائی صاف ہے۔ کتاب کی قیمت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کتاب پروف کی غلطیوں سے پاک ہے۔ صاحب کتاب اس اہم اور اچھی کتاب کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

## دھلی کی خواتین فکشن نگار

مصنفہ : نشاں زیدی
صفحات : 190، قیمت: 300 روپے
ناشر : براؤن پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر : ڈاکٹر سیّد احمد قادری، 7، نیو کریم گنج، گیا 823001 (بہار)

زیر تبصرہ کتاب کسی یونیورسٹی کے لیے لکھا گیا تحقیقی مقالے کا حصہ ہے۔ اس کے اضافی حصے کو حذف کر کے کتابی شکل میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا ہے۔

کتاب میں اپنے 'پیش لفظ' میں نشان زیدی نے اس کتاب کی پیشکش کا جو جواز پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ''اس کتاب میں خواتین فکشن نگاروں کے مطالعے کے حوالے سے پیش کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ یہ شہر اپنی موجودہ صورت میں ہو یا قدیم شکل میں، ہندوستان کا دھڑکتا ہوا دل رہا ہے۔ دہلی کی زبان اور اس کی تہذیب پر زمانے نے جو اثرات مرتب کیے ہیں، وہ نہ صرف دہلی کی ہی تاریخ کا بلکہ پورے ملک کی تاریخ کا ایک حصہ ہے''۔ (صفحہ: 10-9)

اپنی ان باتوں کی تفصیلات اور تاثرات کے لیے نشان زیدی نے کتاب کو چار ابواب میں منقسم کیا ہے۔ باب اوّل 'اردو نثر میں خواتین کا حصہ، آزادی سے پہلے' باب دوم 'آزادی کے بعد دہلی کی خواتین ناول نگار' باب سوم 'آزادی کے بعد دہلی کی خواتین افسانہ نگار' اور باب چہارم 'آزادی کے بعد دہلی کی خواتین ڈرامہ نگار' پر مشتمل ہے۔ ہر باب کے اختتام پر حواشی درج ہے، جس نے بلاشبہ اس کتاب کو تحقیقی لحاظ سے اہم بنا دیا ہے۔

کتاب کا مطالعہ اس امر کا غماز ہے کہ نشاں زیدی نے اپنے تحقیقی مقالے کی تیاری میں کافی محنت اور جستجو سے کام لیا ہے اور تحقیق وتنقید کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی کہیں کہیں کچھ کمیاں راہ پا گئی ہیں، جیسے اپنے پہلے باب 'اردو نثر میں خواتین کا حصہ آزادی سے پہلے' میں مصنفہ نے اردو کی پہلی ناول نگار رشیدۃ النسا اور ان کے بارے میں تفصیلی روشنی ضرور ڈالی ہے، لیکن افسوس کہ مصنفہ نے اس بات کا کہیں پر بھی یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ رشیدۃ النسا بیگم (1853-1929) کا تعلق ریاست بہار کے قدیم شہر عظیم آباد (موجودہ پٹنہ سٹی) سے تھا اور وہ سید وحیدالدین خان بہادر کی دختر تھیں۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اردو کی پہلی خاتون ناول نگار کے سلسلے میں کبھی یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ ان کا تعلق بھی دہلی سے تھا۔ گرچہ انھوں نے اپنے پہلے ناول 'اصلاح النسا' (1881) میں اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا، بلکہ خود کو بنت شمس العلماً مولوی سید وحیدالدین خان بہادر اور ہمشیرہ شمس العلما مولوی سید امداد امام تحریر کیا تھا۔ ان تفصیلات کے علاوہ بھی بہت ساری معلومات اس سلسلے میں مصنفہ کو فراہم ہو جاتیں، اگر وہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں موجود اس ناول کے پہلے نسخے سے استفادہ کرتیں۔ مصنفہ نے 2007 میں طبع ثانی کو ہی سامنے رکھ کر تفصیل بیان کر دی ہے۔

دوسرے باب 'آزادی کے بعد دہلی کی خواتین ناول نگار' کے تحت نشاں زیدی نے صالحہ عابد حسین، حمیدہ سلطان، رضیہ سجاد ظہیر، صغرا مہدی، آمنہ ابوالحسن کے ناولوں پر بہت تفصیل سے تحقیقی اور تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے دہلی کی ان ناول نگاروں کے ضمن میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ نشاں زیدی نے اس باب کے آخری پیراگراف کے چند سطور قبل لکھا ہے کہ......

''... مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواتین اردو ناول نگار صرف اپنی ذات اور خاندان تک محدود نہیں ہیں، بلکہ نئے نظام نے جس گلوبل عورت کو جنم دیا ہے، ان تمام سیاسی اور سماجی تغیرات سے آگاہ ہیں اور ہر پل بدلتی دنیا سے باخبر۔ ان کا ارتکاز خانگی اقدار پر نہیں ہے اور نہ ہی وہ روایتی رسمی علاقہ میں محصور ہیں، بلکہ انھوں نے حیات و کائنات میں تمام تر مسائل کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھتی ہیں اور ان پر ردعمل کے اظہار میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔'' (صفحہ: 97)

''آزادی کے بعد خواتین افسانہ نگار'' جیسے اہم باب میں بھی ابتدائی صفحات میں کسی بحث یا تعارفی کلمات کی بجائے صالحہ عابد حسین، حمیدہ سلطان، رضیہ سجاد ظہیر، سرلا دیوی، صغرا مہدی، آمنہ ابوالحسن، شمیم نکہت جیسی معروف افسانہ نگاروں تک اپنی تحقیق اور تنقید کو محدود رکھا ہے، جبکہ عہد حاضر میں مذکورہ بالا خواتین افسانہ نگاروں کی کافی بڑی تعداد افسانوی ادب میں گرانقدر اضافہ کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں اس کتاب کی مصنفہ نشاں زیدی نے اپنے پیش لفظ میں اس کی وضاحت یوں کی ہے.....

''میں نے اپنی کتاب میں انہی خواتین کو شامل کیا ہے، جن کا 1980 سے سفر جاری ہے'' (صفحہ: 10)

میرے خیال میں یہ جواز درست نہیں ہے، سفر جاری رہتے ہوئے بھی دہلی سے تعلق رکھنے والی بعض خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے افکار و اظہار سے جس طرح اعلیٰ مقام بنایا ہے، ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اب تک ان کا جو بھی افسانوی سرمایہ سامنے آ کر قبولیت اور مقبولیت حاصل کر چکا تھا، ان پر مصنفہ کو توجہ دینی چاہیے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ باب تشنہ ہے۔ اپنے آخری باب 'آزادی کے بعد دہلی کی خواتین ڈرامہ نگار' میں بھی مصنفہ نے صالحہ عابد حسین کے ڈراموں تک ہی اپنی تحقیق وتنقید کو محدود رکھا ہے، اس سلسلے میں مزید تفصیلات ہوتیں، تو بہتر ہوتا۔ مجموعی طور پر کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اپنے موضوع پر مصنفہ نے محنت کی ہے، اس لیے ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اگلے ایڈیشن میں جو کمیاں رہ گئی ہیں، وہ نہ صرف دور ہوں گی بلکہ کتاب پوری طرح اپڈیٹ بھی ہوگی۔

براؤن بک پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی نے خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ شائع کی ہے، قیمت بھی مناسب ہے

## خوئے مطالعہ

مصنف: حافظ کرناٹکی
صفحات: 240، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: شگفتہ پروین، مکان نمبر 122، گلی نمبر 1، ذاکر نگر، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'خوئے مطالعہ' ہمیں جنوبی ہند (ریاست کرناٹک) کی اہم ادبی شخصیات کے تعارفی خاکوں اور ان کے ادبی کارناموں سے نہ صرف متعارف کراتی ہے بلکہ جنوبی ہند میں اردو کی موجودہ صورتِ حال اور اس کے پھلنے پھولنے کے راز کا انکشاف بھی کرتی ہے۔ کتاب کے مصنف 'حافظ کرناٹکی' کی اس کتاب کا جو اہم وصف ہے وہ یہ کہ انھوں نے اسے صرف کرناٹک تک ہی محدود نہ رکھ کر بعض دوسرے اہم موضوعات سے بھی ہمکنار کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اور اپنے عمدہ اور مفید مشورے سے اردو داں طبقے کو نوازا ہے۔

عمدہ اور خوبصورت عنوان کے ساتھ چھپی ہوئی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب میں شامل بیشتر مقالے کا تعلق مختلف مواقع پر لکھے گئے سمینار کے مقالات، بعض مخلصین کی کتابوں کے لیے تاثرات اور تقاریظ سے ہیں۔ تمام مضامین اہم اور معلوماتی ہیں۔ حافظ صاحب کی اس کتاب کی اہمیت میری نظر میں خاص طور سے باب اول اور باب پنجم کے تحت ہے۔ باب اول میں نظام تعلیم میں ادب اطفال کی اہمیت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ بچوں کی تعلیم وتربیت میں پیدا ہونے والے رکاوٹ ومسائل کو محض بروئے کار لانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس خامی کو حل کر کے اس کمی کو دور کرنے کے کئی اہم نکات بھی پیش کیے گئے ہیں، جس کے ذریعے ادب اطفال کی اہمیت اور بچوں کی ٹھیک تربیت دینے کی فہرست سازی میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ موجودہ باب جو باب ادراک سے موسوم ہے۔ اس میں 8 مضامین شامل ہیں جس میں پہلا مضمون نعت کی لفظیات سے متعلق ہے۔ بقیہ مضامین نظام تعلیم میں ادب اطفال کی اہمیت، بچوں کا ادب.... مختصرہ جائزہ، بیت بازی کے اصول، کلیدی خطبہ بچوں کا ادب مسائل وامکانات، روحانی سفر کی علمی داستان۔ عرفان الطریقت، چھٹی میں بچوں کی نگرانی، عنوانات کے تحت ہیں۔ کتاب کا پانچواں باب جو 'باب ترسیل' کے نام سے ہے۔ وہ ہمارے جدید ذہن رکھنے والے اردو داں طبقے کے لیے بے حد معلوماتی ہے۔ اس میں مصنف نے ٹکنالوجی کے اس دور میں اردو کی ترقی کے امکانات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے کہ اردو والے زیادہ سے زیادہ ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ ساتھ ہی سول سروسیز کی تیاری اور اردو زبان سے متعلق ایک مختصر مضمون بھی پیش کیا گیا ہے۔ جس میں حافظ صاحب نے سول سروسیز کی جانب اردو طلبہ کی محرومی کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے اور افسوس ظاہر کیا ہے کہ روز بروز اردو بولنے والے طلبا وطالبات کی تعداد میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔ جب کہ اس میدان میں ہمارے طالب علم دوسری زبانوں کے طالب علموں کے ساتھ برابر کا حصہ لے سکتے ہیں۔ اس میدان میں رکاوٹ پیدا ہونے والے کئی مسائل کو بھی بروئے کار لایا گیا ہے اور ساتھ ہی مشورہ بھی کہ اس راستے کے روڑے کو کیسے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اب ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ اس جانب سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔ ساتھ ہی اردو رسائل وجرائد کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے ریاست کرناٹک کا اہم ترین اخبار روزنامہ 'سالار' اور دو ماہی ظرافت اور اس کے مدیر عظیم الدین عظیم سے متعلق چند معلوماتی گفتگو پیش کی گئی ہے۔ بعد ازیں اساتذہ سے وابستہ توقعات، اردو مادری زبان وثقافت کا چہرہ، اردو اساتذہ اور اردو زبان کی تدریس کے نام سے مضمون شامل ہیں۔

کتاب کا اصل محور باقی چار ابواب کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ہیں باب افہام، باب تفہیم، باب ابلاغ اور آخری یعنی چھٹا باب روشن چراغ۔ حافظ صاحب نے ان چار ابواب کے ذریعے جنوبی ہند بالخصوص ریاست کرناٹک کی ادبی شخصیات اور ان کے عمدہ تخلیقی کارناموں سے قاری کو متعارف کرانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ مندرجہ بالا ابواب میں کل 27 مقالے شامل ہیں۔ محمد اسداللہ صاحب کا ڈبل رول، شاہینہ بیگم کی ناول داستان ایک مثالی خاتون کی، تنقید نگار ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن کا نقد وبصیرت، مولانا ابوالکلام آزاد شخص وعکس اور ایک عبقری شخصیت بابائے تعلیم ڈاکٹر ممتاز احمد خاں اور الامین تحریک کی نصف صدی کے علاوہ تمام مقالے جنوبی ہند کے نامور شعراء اور ان کی تصانیف سے متعلق لکھے گئے ہیں۔ ان شعرا نے شاعری میں خاص طور سے رباعی کے میدان میں جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ امید ہے یہ کتاب جنوبی ہند سے متعلق معلومات حاصل کرنے والے قارئین کے لیے اہم ثابت ہوگی اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے پڑھی جائے گی۔

# فکشن

## شہتوت

مصنف: شہاب دائروی، مرتبہ: پروفیسر عشرت آرا سلطانہ
صفحات: 216، قیمت: 300 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: سفینہ بیگم، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اردو افسانہ کی روایت تقریباً ایک صدی سے زیادہ کے زمانی عرصے پر مشتمل ہے۔ پریم چند سے لے کر موجودہ دور تک کے افسانوں میں متنوع موضوعات کو پیش کیا جاتا رہا ہے جس میں مختلف مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ عصمت چغتائی، بیدی، منٹو، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، انور سجاد، غیاث احمد گدی، اقبال متین وغیرہ مشہور افسانہ نگاروں کے عہد میں بے شمار لوگ افسانے تخلیق کر رہے تھے جن کی حیثیت ان فنکاروں کے مقابلے میں ماند پڑ گئی اور وہ ایک طویل عرصے تک حاشیہ پر پڑے رہے۔ انھیں میں سے ایک نام شہاب دائروی کا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'شہتوت' جس کو پروفیسر عشرت آرا سلطانہ نے مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں حرف حرف حقیقت کے نام سے پروفیسر عشرت آرا سلطانہ کا پیش لفظ ہے اس کے بعد مجموعے سے متعلق منظر کلیم، بے نام گیلانی اور نثار احمد صدیقی کے مضامین ہیں اور پھر افسانوں کی فہرست اس طرح ہے۔ کہرا، دیو جی، چالک، فاصلہ، لوٹن، شہتوت، خالی کیبن، فضلو، پلاسٹک کا انسان، مہربان، کہرے کا پھول، بڑے میاں، رشتے کی کڑیاں، مقدس رشوت، بابا، من کی بھوک،، پرانا اور نیا ہندوستان، کھردرے ہاتھ، آوارہ خط کا سفر، جرم، چہرے، افسوس کا بوجھ، ان کی قیمت، احساس کی روشنی، وہاب اشرفی: ایک انسان، ایک فن کار، دل ایک مندر، محبت کا درد۔ وہاب اشرفی سے متعلق تحریر کو شہاب دائروی کی یادوں پر مشتمل تحریر قرار دیا جائے گا۔

شہاب دائروی نے اپنے افسانوں میں مختلف مسائل کی عکاسی کی ہے۔ لیکن ان کے بعض افسانے یک موضوعی ہیں۔ جس میں جنس کی کارفرمائی جابجا نظر آتی ہے۔ انھوں نے عورت کے کردار کو کہیں مظلوم بنا کر پیش کیا ہے تو کہیں ظالم اور عورت کے اس کریہہ چہرے سے بھی نقاب کشائی کی ہے جب وہ اپنے مفاد اور غرض کی خاطر اسفل ترین

راستہ اختیار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی اور بعض دفعہ اپنی جنسی ناآسودگیوں کے سبب غلط راہ پر نکل جاتی ہے لیکن اس کے پس پردہ ان اسباب کی نشاندہی بھی کی ہے جو ان تمام کارگزاریوں کا باعث بنتی ہیں۔ شہاب دائروی نے انسانی رشتوں کی اہمیت، قدیم اقدار کی بقا، صلہ رحمی، ہمدردی، بے بسی لاچاری، ایمانداری، انسانیت کا درد، شوہر بیوی کے باہمی تعلقات، بڑوں کا عدم پاس ولحاظ، عورت کی بڑھتی ہوئی بے حیائی، انعام اور ایوارڈ کے لالچ میں قلم کی سودے بازی، گلیمر دنیا کی رنگینیاں اور اس کے پیچھے چھپے کالے دھن کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ کئی افسانوں میں مرد کی بالادستی تو کہیں اس کی حالت زار اور کسمپرسی کا ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مظلوم محض عورت ہی نہیں ہوتی بلکہ اکثر مقامات پر مرد بھی اسی زمرے میں شامل ہو جاتا ہے اور زندگی میں نامساعد حالات کا شکار ہو کر شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہاب اشرفی ایک انسان ایک فن کار کے نام سے جو مضمون اس افسانوی مجموعے میں موجود ہے اس طرح اس کی شمولیت غیر مناسب ہے۔ جس میں شہاب دائروی نے ان سے اپنی ملاقات اور یادوں کے توسط سے بہت سی باتوں کی نقشہ کشی کی ہے۔ افسانے کا ایک اہم عنصر ایسے واقعات کو تشکیل دینا ہے جو حقیقت کی عکاسی کریں۔ لیکن انھوں نے اپنے بیشتر افسانوں میں Filmy situation پیدا کر کے واقعہ کو غیر حقیقی بنا دیا ہے جو عقل سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ چند افسانوں میں منطقی ربط کا فقدان ہے اور اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مصنف ایک جست میں واقعہ کے نتائج پر پہنچنے کے لیے بے قرار ہو۔ بہت سے افسانوں میں اختتام surprising ہے جو بعض دفعہ تو افسانہ میں حسن پیدا کرتا ہے لیکن بعض دفعہ قصہ پن کو مجروح کرتا ہے۔ شہاب دائروی نے معاشرہ میں موجود اہم پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع تو بنایا ہے مگر وہ افسانہ کے فنی لوازمات اور شعریات پر مکمل نہیں اترتے۔ افسانوں میں لب ولہجہ، تذکیر وتانیث اور پروف کی غلطیاں موجود ہیں۔ کتاب کے بیک کور پر شہاب دائروی کی تصویر چسپاں ہے اور سرورق دلکش ہے۔

## بدلتے موسم کا غم

مصنف: ایس۔ایم۔عباس

صفحات: 200، قیمت: 260 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایس ایم عباس، محلّہ تاڑتلہ، جونپور، یوپی

مبصر: محمد آفتاب عالم، 142، کاویری ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی 67

ایس۔ایم۔عباس کا دوسو صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ اسم بامسمیٰ ہے جس میں پچیس عمدہ، اعلیٰ، معیاری، کامیاب اور متاثر کن افسانے ہیں جو قارئین کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔ اس کتاب میں جو افسانے شامل ہیں ان کے عنوانات، گیلی مٹی کے نقوش، بیمار، بند دروازے کی تھاپ، اداس منظروں کا سفر، آئینہ آئینہ گرد، دوسرا رخ، تعزیت، نہ کہنے والی بات، کہاں پہ جاکے رکے گا، ڈھلتے سائے، دھوئیں کا تخت، موسم کا حال، ارادہ، دیجیے اور لیجیے، روبرو، پروچن، ضرب تقسیم، ایک بدرنگ تصویر، لوٹتا جزیرہ، پسپائی، موزیک، چادر، بکھراؤ، بدلتے موسم کا غم اور ادھوری عبارت ہیں۔

اس افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ 'گیلی مٹی کے نقوش' ہے۔ اس میں دو قوم اور دوا لگ الگ مذاہب کے پیروکاروں کے ایک ہی گھر آنگن میں اتحاد واتفاق سے رہنے، گھی اور شکر بن کر زندگی گزارنے اور درگا پرشاد اور منور علی کے ایک ہی کنبہ کہلانے کا بیان ہے نیز ایک دوجے کی جدائی پر ان کی آہ وفغاں اور آہ وزاری کرنے اور ان دونوں کی بے چین زندگی کو بڑے ہی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے اور اس میں ان اسباب و وجوہات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جو اتحاد واتفاق اور آپسی بھائی چارے کو انتشار اور دشمنی میں بدل دیتے ہیں۔

اس مجموعے میں شامل افسانوں میں 'بیمار' بھی ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اس افسانے کا آغاز اور انجام دونوں قابل توجہ ہے۔ اس میں معاشرتی واخلاقی قدروں کی پامالی اور تیزی سے بدلتے حالات کی فنکارانہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ بیماری جسمانی بھی ہوتی ہے اور روحانی بھی۔ جسمانی مرض کا علاج ومعالجہ ہوتا ہے لیکن روحانی، فکری اور باطنی امراض کا علاج غیر ممکن ہے۔ اخلاقی قدروں کے زوال کو بیماری کی صورت میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی کا جو پیکر تراشا گیا ہے وہ بڑا ہی انوکھا، نرالا اور اچھوتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کہانی میں جان آگئی ہے اور اس کے کردار جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔

'آئینہ آئینہ گرد' بھی ایک پرتاثیر افسانہ ہے اس میں بھی گاؤں کی جدید اور قدیم روایت اور اخلاقی قدروں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ پوری کہانی ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی اور انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ مہابلی اور مولا بخش اس کے اہم کردار ہیں اور پوری کہانی انھیں کے گرد طواف کرتی ہے۔ اس میں ایس ایم عباس کا معاشرتی نظریہ اور ان کی تجزیاتی ہنرمندی نظر آتی ہے۔

'بدلتے موسم کا غم' بھی دل کو چھو لینے والا افسانہ ہے جس میں موسی، بھانجے اور اس کی پتوہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ موسی نے 'کپل' کے ساتھ جو احسانات کیے ہیں اور اسے جس ناز وادا سے پالا ہے اور جس حسن اخلاق سے اس کی پرورش وپرداخت کی تھی اس کے بدلے میں موسی کو جدائی، تنہائی اور اداسی اور اکیلا پن میسر آتا ہے اور کپل سب کچھ چاہتے اور جانتے ہوئے بھی بیوی کا غلام اور مجبور محض نظر آتا ہے۔ کپل اپنی موسی (سرلا) کی خدمت کر کے اپنے پر کیے ہوئے احسانات کا بدلہ چکانا چاہتا ہے مگر جب ایک دن سرلا کپل کے گھر پہنچتی ہے تو اس کو دیکھ کر کپل کی بیوی (دیپا) کے رویے اور غیر اخلاقی برتاؤ سے اسے سخت رنج پہنچتا ہے اور وہ ماضی کی باتوں کو یاد کر کے دل ہی دل میں روتی، اور آہ وزاری کرتی ہے۔ یہ کہانی ہمارے سماج، معاشرے اور اطراف کے ماحول کی عکاس ہے۔ اور اس کی بنت ایسی ہے کہ ہمیں حیرت میں ڈالتی ہے۔ اور بار بار پڑھنے پر ہمیں مجبور کرتی ہے اور یہ درس بھی دیتی ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہی ہونا چاہیے اور اپنے محسن کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

اس مجموعے کے تقریباً تمام افسانے اپنے موضوع، مواد، تکنیک، منظر وفضا، زبان وبیان اور انداز پیش کش کے اعتبار سے کامیاب اور غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

سرورق خوبصورت او دیدہ زیب ہے۔ کمپوزنگ کی کہیں کہیں ایک دو غلطیاں در آئی ہیں جو اردو زبان وادب کی کتابوں کا خاصہ ہے۔ مجموعی طور پر کتاب قابل مطالعہ ہے۔

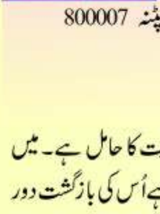


## لفظوں کا لہو (ناول)

تخلیق کار: سلمان عبدالصمد

صفحات: 224، قیمت: 100، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: دائمی پرواز ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، لکھنؤ

مبصر: کامران غنی صبا، عالم گنج، مین روڈ، ثقہ ٹولی، پوسٹ گلزار باغ، پٹنہ 800007

گرے ہیں لفظ ورق پر لہو لہو ہو کر
محاذ زیست سے لوٹا ہوں سرخرو ہو کر

سلمان عبدالصمد کا ناول 'لفظوں کا لہو' کئی اعتبار سے انفرادیت کا حامل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے 'لفظوں سے لہو نچوڑ' کر جو داستان رقم کی ہے اُس کی بازگشت دور تک اور دیر تک سنائی دیتی رہے گی۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد سلمان عبدالصمد اس عہد کے سب سے کم عمر ناول نگار بن گئے ہیں۔ 'لفظوں کا لہو' میں بنیادی طور پر صحافت کو

موضوع بنایا گیا ہے لیکن ضمنی طور پر ہندوستانی نوجوانوں کی نفسیات، ہندوستان کا بدلتا سیاسی وسماجی منظر نامہ، ٹکنالوجی اور میڈیا کے سماج پر پڑنے والے مثبت ومنفی اثرات، مذہب اور جنسی موضوعات کو بھی touch کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

224 صفحات اور 27 ابواب پر مشتمل اس ناول کی کہانی بنیادی طور پر چار کرداروں محسن، نائلہ، نیلا اور زنیرا کے گرد گھومتی ہے۔ چند ضمنی کردار بھی وقتاً فوقتاً پلاٹ کو آگے بڑھانے میں معاونت کرتے ہیں۔ ناول کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار کا مطالعہ ومشاہدہ انتہائی وسیع ہے لیکن کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مطالعات ومشاہدات کو بیان کرنے کے لیے اضافی مکالمات اور واقعات کا سہارا لیا ہے۔ 'لفظوں کا لہو' سلمان عبد الصمد کا پہلا ناول ہے۔ اسلوب، فن یا تکنیک کے نقطۂ نظر سے ناول میں کچھ کمزوریاں ہوسکتی ہیں لیکن موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے یہ ایک اچھوتا ناول ہے۔ ناول کا پلاٹ بہت ہی مربوط ہے۔ واقعات ایک دوسرے میں اس قدر ضم ہیں کہ ہر واقعہ دوسرے واقعہ کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ کرداروں کے اعتبار سے مکالمے بھی فطری اور مانوس ہیں۔ ناول نگار نے مکالموں کی مدد سے کئی جگہ بہت ہی اہم سوالات بھی جنم دیے ہیں۔ چند مثالیں:

''قانون کی چمک انکساری سے بھی بڑھتی یا نہیں۔ قانون کی گرفت کبھی کبھی ڈھیلے ہاتھوں سے بھی مضبوط ہوتی'' (صفحہ 121)۔ ''.....لیکن کیوں؟ کیا انسانی رشتوں کی ویلیڈٹی ہوتی ہے؟ کیا اس کی بھی اکسپائری ڈیٹ ہوتی ہے؟ کیا انسانی رشتوں کی سرحدیں ہوتی ہیں۔ (صفحہ 140) ''مذہب کی دیواریں نہ گراؤ، رہنے دو۔ زبان کی دیواریں نہ گراؤ رہنے دو! ذات پات کی دیواریں نہ گراؤ، رہنے دو... دیواروں کے بغیر مکان کا تصور نہیں۔ دیوار کے بغیر ایسی کھڑکیوں کا وجود نہیں، جن سے حوصلوں کی ہوا آئے۔ دیوار کے بغیر تحفظ ممکن نہیں۔ دیوار کے بغیر محفوظ پناہ گاہ کی تعمیر ممکن نہیں۔ اس لیے تمام دیواروں کو رہنے دو۔ ان دیواروں پر... رشتوں کی چھت ڈال دو!... محبت کے شامیانے تان دو! (صفحہ 220)

مذکورہ مثالوں میں 'رشتوں کی ویلیڈٹی'، 'پیٹ اور پیٹھ کی بھوک سے جنم لینے والے جرائم' اور تفریق کی دیواروں پر محبت کے شامیانے تاننے کی بات ہماری فکر کو نیا زاویہ دیتی ہے لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر رشتوں کی ویلیڈٹی نہیں ہوتی ہے تو آخر ہمارے رشتے تاش کے پتوں کی طرح کیوں بکھرتے رہتے ہیں؟ مذہب کے نام پر ہو رہا ہے۔ مذہبی جرائم کے لیے بھی کیا ہم پیٹ اور پیٹھ کی بھوک کو ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں؟

ناول میں ایوان صحافت کے جو حقائق مناظر اور مکالموں کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں وہ بالکل صداقت پر مبنی ہیں۔ اردو اخبارات کے مالکان، کارکن صحافیوں کا جو استحصال کرتے ہیں اسے بیان کرنے کے لیے 'لفظوں کا لہو' ہی سب سے بہتر ذریعہ اظہار ہے۔ ناول نگار خود بھی ایک منجھے ہوئے صحافی ہیں۔ صحافت کی دنیا کو انھوں نے قریب سے دیکھا ہے۔ امتیاز انجم نے اس حوالے سے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''صحافت نے پوری دنیا کو آئینہ دکھانے کا کام کیا ہے تاہم آج تک کسی نے صحافت کو آئینہ نہیں دکھایا ہے۔ صحافت کے دم توڑتے اقدار اور رشتوں کی رسہ کشی پر مبنی یہ ناول ان (سلمان عبد الصمد) کی خلاقانہ ذہنیت اور حساس طبیعت کا فلسفیانہ اظہار ہے۔''

اس ناول میں پایا جانے والا اعتدال کا پہلو بھی ہمیں متوجہ کرتا ہے، وہ اس طرح کہ سلمان نے ایک طرف جہاں عورتوں کو مظلوم ومقہور دکھایا ہے، وہیں مردوں کی الجھنوں کو بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً اگر محسن اخبار میں چہرہ بناتا ہے۔ اکمل کے اشاروں پر ناچتا ہے تو اسے نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا جاتا ہے، لیکن گہرائی میں جا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ محسن کا چہرہ بنانا یا پھر اکمل کے اشاروں پر ناچنا فقط اپنے لیے نہیں، بلکہ عورتوں کے لیے ہے یا پھر ایک کنبہ کی پرورش و پرداخت کے لیے۔ ایسے میں اگر محسن کی داغداری یا پست خیالی سامنے آتی ہے تو اس کا ذمہ دار فقط محسن ہی ہے کیا؟ اسی طرح ناول کے صفحات پر فلسفیانہ تناظر میں چھوٹے چھوٹے واقعہ کو اہم بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ سلمان کے اس طریقے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی ہمارے اردو گرد پھیلی ہوئی ہے، بس اسے صحیح سمت ورفتار اور فلسفیانہ اظہار کی ضرورت ہے۔ مجموعی طور سے سلمان عبد الصمد کی یہ پہلی کاوش ہر اعتبار سے لائق ستائش ہے۔ ناول نہ صرف خواص میں بلکہ عوام میں بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ ملک و بیرون ملک میں اس ناول پر گفتگو بھی ہو رہی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ سلمان عبد الصمد نے فکشن کی دنیا میں لہولہو لفظوں سے جو دستک دی ہے اس کی بازگشت دیر تک سنائی دے گی اور ان کا تخلیقی سفر کامیابیوں کے ساتھ آگے بڑھتا رہے گا۔

## خواتین

### خواتین یکتائے زمن

مصنف: سعدیہ اقبال

صفحات: 256، قیمت: 156 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: راشد الاسلام، E-241/2A، گراؤنڈ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی

تحریر وتقریر کی طرح عظیم شخصیات کے کارہائے نمایاں اور ان کے حالات زندگی تاریخ کے ہر دور میں نئی نسل کے لیے مشعل راہ کا کام کرتے ہیں۔ عملی میدان میں بھی ایسے لوگوں کی اہمیت وافادیت رہی ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو اور کسی بھی میدان کا ہو۔ یہاں اگر بات کی جائے کسی زبان کی تو اس کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے اب زبان چاہے عربی، انگلش، اردو ہو یا ہندی یا کوئی اور زبان روز اوّل سے ہی لوگ اس کے دلدادہ رہے ہیں۔ اس سے کبھی دل جوڑنے کا کام لیا گیا ہے تو کبھی حمیت وغیرت کو مہمیز لگانے کا۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا میں ہر ہفتہ شائع ہونے والے 'امنگ' کے خواتین واطفال کے صفحہ پر 'مشعل: صفحہ تاریخ پر نقش ثبت کرنے والی خواتین کی داستان حیات' میں اپنے منصبی فرائض ادا کرنے والی محترمہ سعدیہ اقبال کی کتاب 'خواتین یکتائے زمن' ان ہی کالموں کا مجموعہ ہے جو اپنے آپ میں ایک عمدہ اور قابل اعتناء کتاب ہے۔ مصنفہ موصوفہ کی یہ کتاب 62 عناوین پر مشتمل، خوبصورت ڈیزائننگ اور لے آؤٹ کے ساتھ منظر عام پر لائی گئی ہے جن میں سے ہر ایک عنوان سبق آموز ہے اس پر مکمل ایک کتاب تصنیف کی جاسکتی ہے۔ اس میں مختلف ادوار کی ممتاز خواتین کے حوالے سے مضامین تحریر کیے گئے ہیں۔ آغاز حضرت آسیہ بنت مزاحم سے ہوا ہے۔ انھوں نے کئی شقوں میں ان خواتین کو تقسیم کیا ہے۔ علوم وفنون اور ادبیات میں امتیازی نقوش مرتسم کرنے والی جن خواتین پر مضامین شامل ہیں ان میں چاند بی بی، رضیہ سلطان، انوشہ انصاری، رجنی پنڈت، مریم جمیلہ، ارون دھتی رائے، سنیتا نارائن، ہیلن کیلر، بھانومتی، انگمو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اندلس کی خردمند خواتین، جنگ آزادی کی جانباز خواتین، گاندھی تحریک سے وابستہ مسلم خواتین پر بھی مضامین ہیں۔ مجموعی طور پر خواتین نے مختلف میدانوں میں جو تاریخ رقم کی ہے اس کے حوالے سے یہ کتاب حوالہ جاتی حیثیت کی حامل ہے۔

مصنفہ موصوفہ کی یہ ایک قابل مبارک باد کوشش ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہیں کیونکہ انھوں نے اس کتاب میں بلاتفریق مذہب وملت یعنی ہندو مسلم خواتین کے مابین بغیر امتیاز کیے جگہ دی ہے۔ ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ وہ اس کتاب میں صرف مسلم

خواتین کو جگہ دیتیں مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا جو کہ قابل تعریف ہے۔ اسی کڑی کی ایک بات یہ بھی ہے کہ مصنفہ نے صرف ان خواتین کے حالات زندگی پر قلم نہیں اٹھایا جو عورتیں صرف پڑھی لکھی یا اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں یا تحریر وتقریر سے ان کا تعلق ہو بلکہ ان خواتین کے کارہائے زندگی کو بھی جگہ دی ہے جو پڑھی لکھی نہیں ہیں، کسی بڑے خاندان سے تعلق نہیں ہے، اور نہ ہی حسن کی ملکہ ہے اس خاتون کا نام بھانومتی ہے۔ مصنف موصوفہ خود بھانومتی کے بارے میں لکھتی ہیں: 'بھانومتی' جس کی جرأت اور حوصلے نے صرف عورتوں کو ہی نہیں مردوں کو بھی جینے کا سلیقہ سکھایا۔ آج کے معاشرے میں ایسی ہی باحوصلہ اور بہادر خاتون کی ضرورت ہے جو زندگی کا رخ موڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اگر تمام خواتین اور بچیاں واقعی بھانومتی جیسے جرأت مندانہ قدم اٹھائیں تو مجال ہے کہ ان کی عزت وآبرو پر کوئی بھی ہاتھ لگا سکے یا ان کا استحصال کرسکے۔ اپنے گاؤں والوں کے حق کے لیے جدوجہد کرنے کے سبب اتر پردیش کے بہرائچ ضلع کی بھانومتی کو ہندوستان کی 100 عظیم خواتین کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ کبھی محنت ومشقت کرکے دووقت کی روٹی کا انتظام کرنے والی بھانومتی آج کل شہ سرخیوں میں ہیں۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا کے اس کالم کو لوگ اور خاص طور پر یونیورسٹیوں کے طلبہ بغور پڑھتے اور اپنی ریسرچ کے لیے مواد اکٹھا کرنے کی بھی اس کے ذریعے کوشش کرتے ہیں۔ موصوفہ کی محنت اور ان کی صلاحیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ کتاب ریسرچ اسکالروں اور ان لوگوں کے لیے بھی بہت کارآمد ہوگی جو ادب سے ذرا برابر بھی شغف رکھتا ہو۔

سعدیہ اقبال کوئی نیا نام نہیں ہے لیکن زیرنظر کتاب کو دیکھ کر ان کی شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مصنفہ کی ذہانت کو داد دینی چاہیے کہ انھوں نے ایسے موضوع کا انتخاب کیا اور اس کو بحسن خوبی انجام تک پہنچایا۔

بہرکیف یہ کتاب صرف خواتین اور بچیوں کے لیے ہی نہیں مردوں اور نوجوان لڑکوں کے لیے بھی ایک عمدہ معلومات کا ذریعہ ہے۔ خاص کر والدین کو چاہیے کہ اس قسم کی کتابیں، اخبار اور رسائل اپنے گھروں میں منگوائیں تاکہ ماضی وحال کی عظیم خواتین کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں کو پڑھ کر ان کے گھر کی عورتوں اور بچیوں کو مثبت طریقے سے سوچنے کی صلاحیت پیدا ہو، کیونکہ رائٹر نے ہر سطح کے افراد کے لیے اچھے اور آسان انداز میں عمدہ خیالات، بہترین معانی اور اچھے نقوش پیش کیے ہیں۔ آج بازاروں میں روز نئی نئی کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں اور لوگوں میں مصنف بننے کی ہوڑ سی لگی ہوئی ہے لیکن 'یکتائے زمن' کو دیکھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ روز اردو کی نئی کتابیں منظر عام پر آتی رہیں اور امید ہے کہ یہ کتاب لوگوں میں اپنا ایک مقام ضرور متعین کرے گی۔

## فلسفہ

### فلاسفہ اپنے آئینہ خانے میں

مصنف: شرجیل احمد خان

صفحات: 140، قیمت: 50 روپے

ناشر: خدیجہ شرجیل، امرپالی، ایڈن پارک، نوئیڈا، یوپی

مبصر: اقرا سبحان، A-10 بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

شرجیل احمد خان تقریباً ایک درجن سے زائد کتابوں کے مولف ومصنف ہیں۔ شرجیل احمد کی کتابوں کا بیشتر موضوع فلسفہ ہے۔ فلسفے میں ان کی غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ اپنی اس دلچسپی کے اظہار کے لیے انھوں نے اردو زبان کو اظہار کا وسیلہ بنایا، جس سے اردو جو کہ قدیم زمانے میں بھی علمی موضوعات کا بار بہ حسن وخوبی اٹھاتی رہی ہے، جدید زمانے میں بھی اس اعتماد کو تقویت ملتی ہے کہ آج بھی اردو میں علمی موضوعات کی ابلاغ وترسیل کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

زیرتبصرہ کتاب میں مغرب کے بعض مشہور ومعروف مفکروں کے ایسے افکار و نظریات کو نہایت اختصار اور چابکدستی سے پیش کیا گیا جنھیں ان مفکروں اور حکما کے کلیدی خیالات کہہ سکتے ہیں یا یہ کہ شرجیل احمد خاں نے جن افکار کو کتاب میں درج کیا ہے وہی ان مغربی مفکروں کے لیے وجہ شہرت اور بقائے دوام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مغربی مفکرین میں افلاطون پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ فلسفے کے دقیق افکار ومسائل کو بیان کرنے کے لیے شرجیل احمد خاں نے سادہ اور رواں زبان کا استعمال کیا ہے۔ اس کتاب میں اپی کورین کے 33 اقوال، ڈیموکریٹس کے 23 اقوال، لاہستی اور فطرت میں درج جارجیاس کے نظریات، بالخصوص اپنے نظریے کی وضاحت میں جارجیاس نے جو تین تاویلیں دی ہیں ان کی وضاحت مثلاً (1) کسی شئے کا بھی وجود نہیں ہے۔ (2) اگر کسی شے کا وجود مان بھی لیں تو یہ انسان کے دائرۂ فہم اور ادراک کے باہر ہے۔ (3) اگر مان لیں کہ یہ قابل فہم وادراک ہے، پھر بھی ان حقیقت کا ابلاغ ناممکن ہے نہ اس کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔ PHADO میں درج افلاطون کے مکالمے کو مکالمے کی طرز پر درج کیا گیا ہے، ان مکالموں سے افلاطون کے نظریہ علم کی وضاحت ہوتی ہے۔ برکلے کا مکالمہ جس سے برکلے کے نظریۂ علم کی وضاحت ہوتی ہے۔ برکلے کا نظریۂ علم تجرباتی نظریۂ علم ہے جس کی رو سے علم وجدان کے بجائے تجربات کا رہین منت ہے۔ اس کے نزدیک صرف اسی شئے کا وجود ہے جس کا ہم ادراک کرتے ہیں یعنی جس شئے کا ادراک نہ کیا گیا ہو وہ وجود بھی نہیں رکھتی۔ یہاں ایک مشکل یہ پیدا ہوتی ہے کہ جب ہم کسی کمرے میں موجود ہوں تو کمرے میں موجود اشیا کا ادراک بھی کرتے ہیں لیکن جب کمرہ بند کرکے باہر چلے جاتے ہیں تو ان اشیا کا ادراک بھی نہیں رہ جاتا۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ اب وہ اشیا جنھیں ہم کمرے میں دیکھ رہے تھے یا محسوس کررہے تھے اب موجود نہیں ہیں؟ ظاہر ہے وہ اب بھی موجود ہیں۔ برکلے نے اس مشکل کا جو حل پیش کیا ہے اسے شرجیل احمد خاں نے نہایت سادہ اور لفظوں میں سریع الفہم بنا دیا ہے وہ لکھتے ہیں: ''اس نے کہا کہ جب ہم اشیا کا ادراک نہیں کرتے تو ان کا ادراک خدائی ذہن کررہا ہوتا ہے۔''، ہیوم کے خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ ہیوم بھی تجرباتی مکتبہ فکر کے تسلسل کی ایک کڑی ہے اور تجرباتی نظریۂ علم کی تائید کرتا ہے۔ ڈیکارٹ ایک عقل پرست فلسفی اور جدید فلسفے کا بانی مانا جاتا ہے، اس کتاب میں ڈیکارٹ کے افکار کو غور وفکر کے عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ شرجیل احمد خاں تراجم کے ذریعے ان فلاسفہ کے خیالات کو محض درج ہی نہیں کرتے بلکہ پہلے ان کے تصورات کے بارے میں تعارفی گفتگو بھی کرتے ہیں اور ان کے تصورات وخیالات کا منبع کیا ہے اس کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ مثلاً ڈیکارٹ کے افکار کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کے خیالات بوعلی سینا کے رہین منت ہیں جنھوں نے 6 صدی قبل کہا تھا کہ عقل اپنی کارکردگی میں حواس کے تابع نہیں ہے عقل آزادانہ حقیقت کا ادراک کرسکتی ہے۔ یہی بات ڈیکارٹ کے فلسفے کی اساس ہے۔ نیز ڈیکارٹ کی بعض باتوں پر غزالی کے خیالات کا پرتو بھی ہے۔ غزالی کا اثر ڈیکارٹ پر کتنا گہرا ہے اس بات کا اندازہ Lewis کے اس بیان سے بھی لگایا جاسکتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ اگر غزالی کی کتاب اس وقت منظر عام پر آجاتی جب ڈیکارٹ

کی کتاب شائع ہوئی تھی تو ڈیکارٹ کے افکار غزالی کے فلسفہ کا سرقہ سمجھے جاتے۔ بہرحال شرجیل احمد خاں نے ڈیکارٹ کی تصنیف Meditation کا ترجمہ اور تلخیص قابل فہم انداز میں کیا ہے، جسے ہم ایک کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔

ایک لائق ذکر بات یہ بھی ہے کہ شرجیل احمد خاں نے فلاسفہ کے اقوال کے انتخاب میں ایسی باتوں کو ترجیح دی ہے جن کا تعلق اعلیٰ اخلاقی اقدار سے ہے اور انسان اگر ان اقدار کو اپنا لائحہ عمل بنا لے تو یقینی طور پر ایک پرمسرت زندگی کا اہل ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

(1) فطرت کی نعمتیں جو آسانی سے ہمیں میسر ہوجاتی ہیں ان کے بھی اپنے حدود ہیں، لیکن ہوس کی دولت بڑی سرعت سے ضائع ہوجاتی ہے۔ (اپی کورین)

(2) ایک منصف مزاج انسان اعلیٰ ذہنی طمانیت سے ہمکنار ہوتا ہے جب کہ ایک غیر منصف مزاج انسان ذہنی انتشار کا شکار رہتا ہے۔ (اپی کورین)

(3) جو دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہے وہ اس شخص سے زیادہ مغموم ہوتا ہے جو خود تکلیف سے گزرتا ہے۔ (ڈیموکریٹس)

(4) ایسی زندگی جس میں فرصت کے اوقات میسر نہ ہوں ایسے لمبے سفر کے مترادف ہے جس کی راہ میں کوئی آرام گاہ نہ ہو۔ (ڈیموکریٹس)

اس کتاب کا پیش لفظ مشہور ناقد، افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے۔ مشہور فلسفیانہ تصورات پر مبنی یہ کتاب گراں قدر سرمایہ ہے اور شرجیل احمد خاں ان فلسفیانہ تصورات کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لیے یقیناً ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ بلاشبہ مصنف نے دریا کو کوزے میں سمو دیا ہے۔ مجھے اس کتاب کو پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی اور ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ کتاب کے مطالعے سے قبل میں کس قدر محروم تھی۔ یقیناً یہ کتاب قارئین کے علم و فہم میں اضافے کا باعث ہوگی۔ البتہ ایک بات جو اس کتاب میں بری طرح کھٹکتی ہے وہ غلطیاں ہیں۔ لیکن یہ غلطیاں کتاب کی اہمیت و افادیت کو کم نہیں کرتیں۔

## مضامین

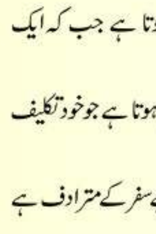


### کامیابی کا راز

مصنف: حمید ادیبی ناندوروی

صفحات: 202، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: بزم تحریک شعر و ادب، ناندورہ ضلع بلڈانہ

مبصر: وسیم مینائی، تارین جلال نگر، شاہجہاں پور 242001 (یوپی)

حمید ادیبی ناندوری کی کتاب 'کامیابی کا راز' اتنی عمدہ، جامع اور مفید ہے کہ اسے ایک ہی نشست میں ختم کیے بغیر بند کردینا میرے لیے ناممکن تھا۔ یہ کتاب جسے بھی دستیاب ہوگی وہ میری ہی طرح اسے ایک ہی نشست میں ختم کیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اس کتاب میں بہت سی خوبیاں، کارآمد باتیں اور کامیاب زندگی کے اصول و ضوابط قلمبند ہیں۔ اس کے مطالعے سے مجھے علم ہوا کہ حمید ادیبی ناندوری کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ وہ سرکاری ملازم نہیں ہیں اور نہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور نہ ہی وہ بڑے کاروباری ہیں۔ البتہ زبان و ادب میں وہ جس طرح گرانقدر کارنامے انجام دے رہے ہیں وہ ان کے بلند ادبی قد و قامت کے بین ثبوت ہیں۔ اب تک ان کی چار تصانیف منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوکر ادب نوازوں سے داد و تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ ان کا ناول 'پھول کھل گئے' اور افسانوی مجموعہ 'جہاں چاہ، وہاں راہ' نیز تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'ہمیں انصاف چاہیے' کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ اسی طرح ان کے مزاحیہ اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'میں، شاعری اور مشاعرہ' بھی کافی مقبول ہوا۔ اب ان کا پانچواں مجموعۂ مضامین 'کامیابی کا راز' زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا ہے۔

'کامیابی کا راز' حمید ادیبی کے تقریباً 35 مضامین کا مجموعہ ہے۔ ہر مضمون کی زبان نہایت فصیح اور سلیس ہے۔ حمید ادیبی اپنے 'پیش لفظ' میں 'کامیابی کا راز' کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''زیر نظر کتاب میں زیادہ سے زیادہ ایسا مواد شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو زندگی کے لیے بے حد مفید اور کارآمد ہے۔ اگر اس کتاب میں بتائے گئے اصولوں اور طریقوں پر سچے جذبے کے ساتھ عمل کیا جائے تو ایک مفید، خوش حال اور مثالی زندگی کی تعمیر ہوسکتی ہے۔''

ابتدا میں پروفیسر ڈاکٹر محمد سعد اللہ کا مضمون 'گلہائے تعارف' اور اعجاز پروانہ ناندوروی کا مضمون 'لفظ لفظ خوشبو' شامل ہے۔ ڈاکٹر محمد سعد اللہ اپنے مضمون میں 'کامیابی کا راز' کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

'کامیابی کا راز' صرف ایک کتاب نہیں، عجیب و غریب، حیرت انگیز اور دلچسپ معلومات کا خزانہ ہے۔ یہ ایک رہبر بھی ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر آدمی کی رہنمائی کرتی نظر آتی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ مصنف کی زندگی کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں پیش کیے گئے مضامین گو کہ انفرادی حیثیت رکھتے ہیں مگر سب کا متن 'کامیابی' ہے۔ ہر مضمون ایک مخصوص رنگ اور جداگانہ انداز سے تحریر کیا گیا ہے اور قاری کے ذہن کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ تمام مضمون ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور بڑے ترتیب سے پیش کیے گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے تمام مضامین ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ ساری کتاب ادبی چاشنی سے معمور ہے اور اسے کافی دلچسپ بنایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مضمون ختم کرنے کے بعد قاری کا جی خود بخود دوسرا مضمون پڑھنے کو چاہتا ہے۔''

حمید ادیبی ناندوروی نے چونکہ شاہانہ اور عیش و عشرت والی زندگی نہیں گزاری ہے۔ معاشی اور سماجی مسائل و مشکلات کے ناگ نے انھیں اپنے منھ میں پھانسے رکھا ہے اس لیے انھیں اس بات کا بخوبی علم و احساس ہے کہ غریبوں اور امیروں کی زندگیوں میں کتنا فرق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جس نے کبھی دکھ والی زندگی نہیں گزاری اسے دوسرے کے دکھ کا احساس ہرگز نہیں ہوتا۔ جس نے ناکامی کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا، ہر موڑ پر کامیابی اس کے قدموں میں لونڈی بن کر نچھاور رہی اس کو دوسروں کی ناکامی کا احساس نہیں ہوتا۔ احساس تو اسی شخص کو ہوتا ہے جو ان سب سے دوچار ہوتا ہے۔

حمید ادیبی نے دکھ کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لیے وہ دوسروں کو دکھ میں دیکھ کر یا دوسروں کی غیر ترقی یافتہ زندگی کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں ان کی کتاب ''کامیابی کا راز'' اسی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اپنے تلخ تجربات کو سطور کے قالب میں ڈھال کر ہر شخص کو کامیاب زندگی گزارنے کے اصول و ضوابط سے روشناس کرانے کی قابل تعریف کوشش کی ہے۔ انھوں نے ادب کا دامن بھی اپنے ہاتھوں سے نہیں چھوڑا ہے اور نہ ہی تصنع سے کام لیا ہے۔ بڑی شائستگی، سنجیدگی، متانت، خلوص اور ہمدردی کے ساتھ نہایت کارآمد مضامین قلمبند کیے اور پھر انھیں کتاب کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ یقیناً یہ کتاب اسم بامسمیٰ ہے۔

'کامیابی کا راز' 202 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت صرف 100 روپیہ ہے جو اس گرانی کے دور میں قطعی مناسب ہے۔

■

# عالمی اردو نامہ

## اردو انسٹی ٹیوٹ کا پروگرام

شکاگو: 16 ستمبر 2017 کو اردو انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایک اسٹیج شو پروگرام 'فکر و فن' پیش کیا گیا۔ اس پروگرام کی میزبانی کے فرائض امین حیدر نے انجام دیے اور اردو کی باکمال ادیبہ اور شاعرہ محترمہ رضیہ فصیح احمد اس پروگرام کی مہمان خصوصی تھیں۔

پروگرام فکر و فن کا آغاز اردو انسٹی ٹیوٹ کے جنرل

سکریٹری ڈاکٹر لطیب سیف کے استقبالیہ سے ہوا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور اردو انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اردو انسٹی ٹیوٹ نے ہمیشہ معیاری پروگرام پیش کیے ہیں، اردو کلاسوں کا اہتمام کیا ہے۔ اشعار و اظہار جیسے پروگرام کے ذریعے اردو سکھانے کی کوشش کی۔ انھوں نے شکاگو کے اردو ادب کے بچھڑنے والے شعراء اور ادباء کی خدمات کو خراج عقیدت بھی پیش کیا۔

پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے امین حیدر نے رضیہ فصیح احمد کو دعوت دی کہ وہ اسٹیج پر تشریف لائیں اور ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ محترمہ رضیہ فصیح احمد صاحبہ ہمارے عہد کی باکمال ادیبہ ہیں۔ یہ اپنے اظہار کے لیے مختلف جہتوں کا استعمال کرتی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ان جملہ اصناف پر طبع آزمائی کی بلکہ ایک نیا سمت بھی عطا کیا۔

اس پورے پروگرام میں امین حیدر نے رضیہ فصیح احمد سے ان کی زندگی کے حالات سے لے کر ان کی افسانہ و ناول نگاری کے علاوہ دیگر اصناف تحریر، شاعری، ایوارڈز، معاصرین، امریکہ میں اردو کے مستقبل کے بارے میں کئی دلچسپ سوالات کیے۔ پروگرام کا آغاز رضیہ فصیح احمد کی ایک حمد سے کیا گیا جسے ندا رحمان نے پرسوز لحن میں پیش کیا اور سماع باندھ دیا۔ حسن خان نے خوبصورت ترنم کے ساتھ محترمہ کی ایک نعت پیش کی۔ حسن خان کے بعد اعجاز ہاشمی نے بھی اپنے مخصوص انداز اور مترنم آواز میں ایک غزل پیش کی جسے موسیقی سے عدیل بیگ صاحب نے ہم آہنگ کیا۔ ریاض نیازی (نیاز فتح پوری کے فرزند) نے محترمہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے مضمون 'آپ پاگلوں کو بے وقوف نہیں بنا سکتے' سے ایک اقتباس پڑھ کر سنایا۔ یاسمین خان نے محترمہ کا ایک افسانہ 'نینی مام اور نانی اماں' بڑی مہارت کے ساتھ ڈرامائی انداز میں پیش کیا۔ شگفتہ ہاشمی نے رضیہ فصیح احمد کی ایک نظم موسیقی کے ساتھ موثر انداز میں پڑھی۔ اس نظم میں معاشی ہجرت کے کرب کا اظہار کیا گیا ہے۔ پروفیسر ضیاء حسن نے محترمہ کا لکھا ایک مضمون 'قصوروار کون میں یا وہ؟' پیش کیا۔ پروگرام کے آخیر میں امین حیدر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، امین حیدر اردو انسٹی ٹیوٹ، شکاگو، امریکہ 28 ستمبر 2017

## امریکہ میں سرسید احمد خاں کی دوسو سالہ جشن پیدائش تقریب

**علی گڑھ:** علی گڑھ ایلومنائی ایسوسی ایشن، واشنگٹن ڈی سی نے سرسید احمد خاں کی دوصد سالہ جشن پیدائش تقریبات کے تحت ٹرش امریکن کمیونٹی سنٹر واشنگٹن ڈی سی میں کئی پروگرام منعقد کیے۔ واضح رہے کہ علی گڑھ ایلومنائی ایسوسی ایشن،

واشنگٹن ڈی سی، امریکہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغین کی سب سے قدیم تنظیم ہے۔ تقریبات کے تحت ''آج کے کثیر ثقافتی سماج میں پرامن بقائے باہم'' موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر سرسید اور ان کے رفقا کی تصاویر، سرسید کی تحریر کردہ کتابوں اور علی گڑھ تحریک پر مبنی نمائش لگائی گئی۔ ایم اے او کالج کے قیام کے لیے سرسید کی جدوجہد پر مبنی ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔ اس کے علاوہ موجودہ امریکی سماج میں جنوب ایشیائی تارکین وطن کے تجربات پر مبنی مزاحیہ ڈرامہ پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے اے ایم یو ایلومنائی ڈاکٹر فریک ایف اسلام نے کہا کہ موجودہ وقت میں ہندوستان کی اقلیتوں اور محروم طبقات میں بازار پر مبنی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے بہت زیادہ کوششیں کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کا معیار زندگی بہتر ہو اور مقابلہ کی صلاحیت پیدا ہو۔ مرسر یونیورسٹی اٹلانٹا کے فلسفہ کے پروفیسر جیوفری ولیٹ نے سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مرسر یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے درمیان ایک ایم او یو ہوا تھا، جو تعلیمی تبادلے کا ایک کامیاب پروگرام ثابت ہوا ہے اور دونوں یونیورسٹیاں ہند امریکہ کے درمیان بہتر رابطے کی راہ ہموار کر رہی ہیں۔ جارج میسن یونیورسٹی، ورجینیا کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر عبدالعزیز سچیدینا نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ بین مذہبی مکالمہ پر سرسید احمد خاں کے خیالات اور ان کی کتابوں سے بقائے باہم کے تصور کو تقویت ملی ہے اور دنیا کو ہم آہنگی کا پیغام ملا ہے۔ پروگرام کے انعقاد میں امریکن انڈین مسلمس، اردو اکادمی آف میری لینڈ، مونٹگومری نوابس جیسی تنظیموں کا تعاون شامل رہا۔ اس موقعے پر امریکہ اور کناڈا سے اے ایم یو کے فارغین اور احباب موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 ستمبر 2017

## برطانیہ: اردو زبان کی فلم مائی پیور لینڈ آسکر کے لیے نامزد

**لندن:** برطانیہ نے آسکر 2018 کی غیر ملکی زبان کیٹیگری میں اردو زبان کی ایک فیچر فلم 'مائی پیور لینڈ' کو نامزد کیا ہے۔ 'مائی پیور لینڈ' ہدایت کار سرمد مسعود کی پہلی فلم ہے۔ پوری فلم کی فلم سازی پاکستان میں کی گئی ہے۔ یہ فلم ایک ایسے شخص کی بڑی بیٹی کی حقیقی کہانی پر مبنی ہے جنھوں نے اپنی زمین کو بچانے کے لیے 200 ڈکیتوں کے خلاف لڑائی کے لیے ہتھیاروں کا استعمال کیا۔ فلم میں اہم کردار ایک ڈانسر اور اداکار سہائی آبرو نے ادا کیا ہے۔ یہ فلم ناز ودھار بجو کے بارے میں ہے جو دیہی سندھ میں اپنی 2 بہنوں اور ایک بھائی کے ساتھ پرورش پا کر بڑی ہوئی اور بطور 'سندھ کی مضبوط ترین خاتون' مسلح ڈکیتوں سے اپنی زمین کو بچانے کے لیے 41 سال تک زندہ رہی۔ یہ فلم پاکستان کی دیہی زندگی کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ فلم کی پہلی نمائش ایڈنبرگ فلم فیسٹول میں کی گئی اور برطانیہ میں 15 ستمبر کو ریلیز کی گئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 ستمبر 2017

# قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
## خبرنامہ

## ہندوستانی مذاہب اور ثقافت سے متعلق کتابوں کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت: پروفیسر ارتضیٰ کریم

### قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں مذہب اور ثقافت پینل کی میٹنگ

**نئی دهلی:** اردو زبان میں ایسی کتابوں کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے جن کے ذریعے ملک کی مختلف ثقافتوں اور مذاہب کو سمجھا جاسکے تاکہ عوام الناس ایک دوسرے کے مذاہب کی اساس سے واقف ہوں اور ایک دوسرے کے لیے محبت و بھائی چارگی کا مظاہرہ

کریں۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے یہاں مذہب اور ثقافت پینل کی میٹنگ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں اس طرح کے موضوعات پر لکھنے والے مصنفین کی کمی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مصنفین اس جانب بھی متوجہ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ یہ مذہب وثقافت پینل اس معنی میں منفرد اور اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے تحت ہندوستانی مذاہب اور ثقافت کے تعلق سے کونسل ایسی کتابوں اور تراجم کو منظر عام پر لا سکے جس سے بین مذاہب مکالمے کی بہتر صورت نکل پائے۔

پروفیسر سید عین الحسن نے کہا کہ انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے لیے مختلف مذاہب کے مشترکہ عناصر کو تلاش کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ مختلف مذاہب اور ثقافتوں پر اردو زبان میں زیادہ سے زیادہ لکھا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ پورے ہندوستان سے اس موضوع پر کام کے لیے تجاویز آئیں اور قومی کونسل ان پر غور کرکے شائع کرے۔ ڈاکٹر فریدہ خانم نے کہا کہ اس پینل کے تحت ہونے والے اشاعتی کام کے ذریعے ہر مذہب وثقافت کو سمجھا جاسکے گا۔ پروفیسر زینت شوکت علی نے قومی کونسل کے مذہب اور ثقافت پینل کے بارے میں کہا کہ اس پینل کی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے ہم ہر ایک مذہب کو سمجھ سکیں گے۔ اپنے مذہب کو بھی اور دوسروں کے مذہب کو بھی۔

مولانا صہیب قاسمی نے کہا کہ این سی پی یو ایل ایک ایسا ادارہ ہے جس کے تحت فروغ اردو کا بڑا کام ہو رہا ہے اور اس کے ذریعے پورے ملک میں مثبت پیغام جارہا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ مذہب و ثقافت پینل کے اشاعتی کام کے ذریعے لوگ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں گے اور قریب آسکیں گے۔ میٹنگ میں کئی تجاویز زیر غور آئیں، مختلف کتابوں کو حتمی منظوری دی گئی اور کتابوں کے متعدد خاکوں پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ میٹنگ میں جن دیگر شخصیات نے شرکت کی ان میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ہمدرد یونیورسٹی کے پروفیسر غلام یحییٰ انجم، مولانا مبارک حسین مصباحی، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر شمس اقبال، ایجوکیشن اسسٹنٹ آفیسر محمد فیروز عالم اور ٹیکنیکل اسسٹنٹ آبگینہ عارف کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 ستمبر 2017

# قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں لیگل پینل کی میٹنگ

**نئی دہلی:** 21 ستمبر، اردو داں طبقے کو قانونی نکات اور باریکیوں سے واقف کرانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان قانون سے متعلق کتابیں شائع کرتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ لیگل پینل کے تحت قانونی اصطلاحات اور کتابوں کے تعلق سے میٹنگوں کا انعقاد بھی ہوتا رہا ہے۔ اسی تعلق سے قومی کونسل کے صدر دفتر میں لیگل پینل کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے اردو میں قانونی اصطلاحات اور دور جدید میں ان کی افادیت کے عنوان سے سہ روزہ ریفریشر کورس کے انعقاد کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس ریفریشر کورس میں مختلف شعبہ جات سے متعلق افسران خصوصی طور پر محکمہ پولیس، سی بی آئی اور دیگر تحقیقاتی ایجنسیوں کے علاوہ محکمہ مالیات سے وابستہ حضرات کو مدعو کیا جائے گا اور ماہرین قانون کی خدمات بھی لی جائیں گی تاکہ قانونی اصطلاحات کی افہام و تفہیم کے راستے ہموار ہوسکیں۔

اس میٹنگ کی صدارت معروف ماہر قانون پروفیسر طاہر محمود نے کی۔ انھوں نے 'ہندوستان میں اردو کی آئینی اور قانونی حیثیت' کے عنوان سے منعقدہ سمینار میں پڑھے گئے مقالات کی اشاعت کو ضروری قرار دیا۔ اس سے نہ صرف اردو قارئین کے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ اردو کے آئینی نکات کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔ اس موقع پر ڈاکٹر ظفر محفوظ نعمانی کی کتاب انٹرنیشنل لا کی اشاعت کو بھی منظوری دی گئی۔ اس کے علاوہ دیگر ممبران نے بھی مفید مشورے دیے جسے ایجنڈے میں شامل کرلیا گیا۔

اس میٹنگ میں پروفیسر طاہر محمود، پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم، جناب احتشام عابدی، ڈاکٹر محمد ظفر محفوظ نعمانی، ڈاکٹر افضل قادری، جناب سید اقبال احمد کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر محمد فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ محترمہ ذیشان فاطمہ اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 ستمبر 2017


قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی فخریہ پیش کش

ملک و بیرون ملک کے تخلیق کاروں و مضمون نگاروں سے التماس ہے کہ خواتین عالم کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے والے مضامین، انٹرویوز، افسانے، انشائیے، منتخب اشعار، نظمیں، غزلیں اور خواتین کے کارہائے نمایاں پر مبنی رپورٹ وغیرہ ارسال کریں۔ خواتین کے لیے اور خواتین کے ذریعے لکھے گئے مضامین کو ترجیحی بنیاد پر شائع کیا جائے گا۔ مضامین مندرجہ ذیل ای میل پر بھیجیں۔

**ایڈیٹر**: پروفیسر ارتضیٰ کریم

E-mail:kduniya@ncpul.in

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

# کونسل کے تعاون سے

## داراشکوہ کے عہد میں فارسی اور دیگر ہندوستانی زبانوں پر مشترکہ تہذیب کے اثرات

**نئی دہلی:** ریا ایجوکیشنل سوسائٹی اور قومی کونسل کے اشتراک سے داراشکوہ کے عہد میں فارسی اور دیگر ہندوستانی زبانوں پر مشترکہ تہذیب کے اثرات کے عنوان پر کروڑی مل کالج دہلی یونیورسٹی میں دو روزہ قومی سمینار 17-16 ستمبر کو منعقد کیا گیا جس میں کلیدی خطبہ پروفیسر منیجر پانڈے نے پیش کیا اور صدارت پروفیسر اے ایس نارنگ نے کی جبکہ ڈاکٹر انیتا سینی نے

مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ سمینار کا پہلا پیپر پروفیسر عزیز الدین نے پیش کیا۔ اجلاس میں ڈاکٹر اخلاق احمد، پروفیسر منیند رٹھا کر اور دیوندر چوبے نے داراشکوہ کے فکر و فلسفے پر سیر حاصل گفتگو کی۔ دوسرے دن کے اجلاس میں پروفیسر علیم اشرف اور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر نعمان خان نے کی۔ اختتامی جلسے کی صدارت شاہد مہدی اور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی جبکہ ڈاکٹر این سی پی یو ایل پروفیسر ارتضیٰ کریم مہمان خصوصی تھے۔ اس جلسے میں ڈاکٹر سمیر مشرا اور سید شاہد اشرف نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اور ریا ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر ایس کے عبدالرحیم نے تمام مقالہ نگاروں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ بعد ازاں استاد انیس احمد خان اور ریحان عباس نے اپنے صوفی کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ سمینار کے روح رواں ڈاکٹر منی بھوشن تھے۔ ڈاکٹر ساجد حسین صدر شعبہ اردو دیال سنگھ ایوننگ کالج نے داراشکوہ کی تلاش و تفہیم کے حوالے سے جانکاری دی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 18 ستمبر 2017

## گجرات میں تعلیمی سطح پر اردو زبان کے فروغ کا مسئلہ

**احمد آباد:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، (حکومت ہند)، نئی دہلی اور آنند فاؤنڈیشن، احمد آباد کے باہمی اشتراک سے ایک اہم ورکشاپ بعنوان 'گجرات میں تعلیمی سطح پر اردو زبان کے فروغ کا مسئلہ' راجیہ پروڈھ شکشن سنسادھن کیندر (تعلیمی کھنڈ) گجرات ودیا پیٹھ کیمپس، آشرم روڈ، احمد آباد میں مورخہ 27 اگست 2017 بروز اتوار انعقاد پذیر ہوا۔

پہلی نشست کی صدارت پروفیسر محی الدین بومبے والا نے کی، ابتداء جناب ابہام رشید صاحب (سابق پرنسپل) نے کہا کہ اردو تعلیم کی موجودہ صورت حال میں بہتری لانے کے لیے سب سے اہم رول اساتذہ کرام کا

ہوگا، وہی اس قافلہ کے سالار ہیں۔ انھوں نے اساتذۂ کرام کے نام ایک سوالنامہ جاری کیا اور کہا کہ اساتذۂ کرام کے جواب سے صحیح صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر نثار احمد انصاری نے اپنے خیالات پیش کیے۔

اس موقعے پر مولانا رجب علی مہتمم مدرسہ فاطمہ زہرہ (آنند) نے اردو زبان سے متعلق کہا کہ اردو زبان ہمارا تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ ہے۔ ہمارا اس سے غفلت برتنا حد درجہ نادانی ہوگی۔ ہمیں اردو کو گلے لگائے رکھنا ہوگا۔ صدر جناب ندیم انصاری نے ایک سوالنامہ اردو اساتذہ کے نام پیش کیا اور اردو کے گرتے معیار پر افسوس کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر پروفیسر انور ظہیر انصاری نے اپنے خیالات سامعین کے سامنے پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ زبان کے ساتھ مذہب کو جوڑنا انتہائی غلط نظریہ ہے اس کی مذمت ہونی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی تعلیم حاصل کرنے سے ہمیں کوئی روک نہیں سکتا۔ ڈاکٹر موصوف کے بعد جناب زین العابدین انصاری صاحب نے اردو زبان اور تعلیم سے متعلق اپنے خیالات پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ ہم جلد ہی احمد آباد، گجرات سے ایک اردو اخبار نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس ارادے کو پورا کرنے کا وعدہ بھی کرتے ہیں۔

آخر میں صدر جلسہ پروفیسر محی الدین بومبے والا نے اردو زبان و ادب سے متعلق اپنے زریں خیالات سے نوازا۔ انھوں نے کہا کہ دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان جاننے والوں کو اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اردو میڈیم اسکولوں کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے اور رہے گی ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ گجرات نے کبھی اس سے غفلت نہیں برتی۔

اختتامی کلمات شری وجے آنند (صدر آنند فاؤنڈیشن، احمد آباد) نے ادا کیے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، (حکومت ہند) نے ہمیں اس لائق سمجھا کہ ہم ایسا اہم پروگرام کرسکیں۔ اس کے لیے انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، بھارت سرکار کا شکریہ ادا کیا۔

ورکشاپ کے دوسرے اور آخری حصے کے ابتدا ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر پروفیسر انور ظہیر انصاری نے کی۔ اردو کی جانب سے گجرات کے مختلف علاقوں کے 50 اساتذہ کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی جبکہ ہال میں 40 اساتذہ حاضر تھے۔ پروفیسر انور ظہیر انصاری نے اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اردو زبان کے فروغ کے لیے اسے اچھی علامت قرار دیا۔

پریس ریلیز: اشفاق شیخ، احمد آباد، 15 ستمبر 2017

## مدارس میں اردو زبان و ادب کی صورتِ حال

**رامپور:** اردو زبان و ادب کے فروغ میں مدارس کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مدارس نے بڑے بڑے شعرا اور نثر نگار پیدا کیے ہیں۔ آج بھی مدارس میں اردو اہمیت کے ساتھ پڑھی اور بولی جاتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار حقانی القاسمی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ٹانڈہ رامپور کے مدرسہ ضیاء الاسلام میں منعقدہ سمینار میں اپنے کلیدی خطبے کے دوران کیا۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنی صدارتی تقریر کے دوران کہا کہ مدارس میں اردو زبان کا جو معیار ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے، البتہ ادب کی طرف اہل مدارس کی توجہ نسبتاً کم ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر شریف احمد نے اپنی تقریر کے دوران اہل مدارس کو عصری تعلیم کی طرف متوجہ کراتے ہوئے کہا کہ دینی تعلیم تو بہرحال اہمیت کی حامل ہے لیکن اس کے ساتھ عصری تعلیم بھی بہت ضروری ہے۔ مدرسہ والوں کو ان تمام چیزوں کو سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے جن کی دنیوی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے۔ مہمان ذی وقار ڈاکٹر عابد حسین نے سمینار کے موضوع کو سراہا اور اس میں پڑھے گئے مقالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سمینار موضوع کے اعتبار سے بھی کامیاب ہے اور مواد کے اعتبار سے بھی۔ مولانا محمد خالد قاسمی نے استقبالیہ کلمات ادا کیے۔ اس سمینار میں ڈاکٹر اطہر مسعود خان، سید افتخار حسین جعفری، سمیع الدین خاں شاداب، ارشاد سیانوی، ظفر عالم، نایاب حسن قاسمی، جسیم الدین قاسمی، سلمان عبدالصمد، یوسف رام پوری، نجم الدین، شہاب الدین، فیروز اختر قاسمی اور محمد یونس نے مقالے پڑھے۔ پروگرام کے کنوینر سلیم تانڈوی نے اردو زبان اور مدارس کے حوالے اپنی نظم پیش کی۔ نظامت کے فرائض یوسف رامپوری نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 ستمبر 2017

'اڈیشہ میں اردو کے تعلیمی مسائل اور ان کا حل' کے موضوع پر منعقدہ سمینار

## اڈیشہ میں اردو کے تعلیمی مسائل اور ان کا حل

**بھوبنیشور:** مدنی ویمنس ویلفیئر ایسوسی ایشن اڈیشہ بھوبنیشور کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (بھارت سرکار) نئی دہلی کے تعاون سے یک روزہ سمینار بعنوان 'اڈیشہ میں اردو کے تعلیمی مسائل اور ان کے حل' کا انعقاد اڈیشہ ریڈ کراس بھون کے وسیع ہال میں ہوا جس کی صدارت فقیر موہن یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق پروفیسر ڈاکٹر شیخ مبین اللہ نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کے طور پر سکریٹری اڈیشہ اردو اکادمی نے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ جب سے انھوں نے اڈیشہ اکادمی میں قدم رکھا ہے۔ ان کے پاس اردو کے تئیں مسائل آتے رہتے ہیں اور ان کے حل کے لیے وہ پوری ایمانداری سے کوشش کرتے ہیں لیکن اردو داں کو بھی اردو کے فروغ کے لیے ایماندارانہ کوشش کرنی چاہیے۔ سمینار سے خطاب کرتے ہوئے مولانا محمد مطیع اللہ نازش نے کہا کہ اردو ملک کی تہذیب ملک میں بسنے والے ہر ہندوستانی کی زبان ہے اور اردو کی ترقی روکنے میں وہ ذمے دار ہیں جو اس زبان کو کسی مذہب سے جوڑتے ہیں۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے صدائے اڈیشہ کے ایڈیٹر جناب قریش نے کہا کہ اردو اخبارات نے ہندوستانی نوجوانوں کے ذہن میں قومیت کا شعور جگانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستان کی تاریخ اردو اخبارات کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

اڈیشہ کے مشہور شاعر سید نورالہی ناطق نے کہا کہ اردو زبان میں اڈیشہ کی ادبی و ثقافتی تاریخ بہت قدیم ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ منظم طور پر ہر گھر میں اردو کی بتدائی تعلیم ماہر اساتذہ سے کرائی جائے اور اپنے نونہالوں کو اردو سے رغبت دلائی جائے۔ سمینار میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا نواب علی حبیبی نے اردو زبان کی مٹھاس اور اس کے ادب کو ہندوستانی تہذیب کا ورثہ قرار دیا۔

مدرسہ ٹیچرس ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری منور احمد حبیبی نے مہمان ذی وقار کی حیثیت سے شرکت کی اور اپنے تاثرات بیان کیے۔ ان کے علاوہ دیگر کئی اردو داں شخصیت نے شرکت کی اور اردو کے مسائل پر بے باک طریقے سے اپنی بات رکھی۔ آخر میں ایسوسی ایشن کے سکریٹری نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ جبکہ سمینار کی نظامت فاضل نوجوان مولانا کلیم الدین رضوی نے بحسن وخوبی انجام دی۔

پریس ریلیز: مدنی ویمنس ویلفیئر ایسوسی ایشن، اڈیشہ، 22 ستمبر 2017

## 'مہامشاعرہ' کا انعقاد

**ناگپور:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی کے مالی تعاون اور وِدربھ مائناریٹی ملٹی پرپز رورل ڈیولپمنٹ ایجوکیشنل سوسائٹی (کامٹی) ناگپور کے زیر اہتمام 5 ستمبر 2017 یوم اساتذہ کے موقع پر یک روزہ ریاستی مشاعرہ بعنوان 'مہا مشاعرہ' کا انعقاد مسلم سماج بھون، املی باغ، کامٹی میں کیا گیا۔

مشاعرہ ڈاکٹر مدحت الاختر کی صدارت میں منعقد ہوا، نظامت کے فرائض رضوان رضوی نے بخوبی انجام دیے۔ اس مشاعرے میں اشتیاق کامل، ڈاکٹر ضمیر کبیر نقی جعفری، شمشاد شاد، شبنم خان شبنم، عمران فیض، عمران جون پوری اور جمیل انصاری جمیل صاحبان نے بطور شاعر شرکت کی۔ مہمانان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، محمد حفظ الرحمٰن، ڈاکٹر رفیق اے۔ ایس، راجیند رراے بولے، محمد توحید الحق اور ڈاکٹر محمد نسیم اختر موجود تھے۔

پریس ریلیز: ریحان کوثر، ناگپور، 23 ستمبر 2017

# اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

**قومی:**

## ہندی دوس پر صدر جمہوریہ کا خطاب

**نئی دھلی:** عزت مآب جناب رام ناتھ کووند نے ہندی دوس کے موقعے پر وگیان بھون میں منعقد تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندی پر ہمارا وجود منحصر کرتا ہے۔ مذہب تقسیم کرسکتا

ہے لیکن زبانیں ہمیشہ جوڑتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زبان سے جو قربت آتی ہے وہ کسی دیگر چیز سے نہیں آتی۔ اس پروگرام کی صدارت وزیر داخلہ جناب راج ناتھ سنگھ نے کی۔ امور داخلہ کے وزیر مملکت گنگارام اہیر اور کرن رجیجو بھی اس تقریب میں موجود تھے۔ صدر جمہوریہ نے کہا کہ ملک کا وجود ہندی پر ہی منحصر ہے۔ انھوں نے اپنی بات کی تشریح میں شاعر مشرق علامہ اقبال کی مشہور نظم سارے جہاں سے اچھا کے آخری مصرع کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندی ہیں ہم اسے اتنا ہی رہنے دیجیے۔ انھوں نے پورا مصرع پڑھتے ہوئے کہا کہ اس میں وطن بعد میں آتا ہے۔ بعد میں انھوں نے پورا مصرع پڑھا 'ہندی ہیں ہم وطن ہے، ہندوستاں ہمارا' مسٹر کووند نے کہا کہ ہندی ملک کی ہمہ جہت ثقافت کو ظاہر کرنے کی پوری طرح اہل ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہندی کا وجود غیر ہندی بولنے والوں کے ہندی کے استعمال پر منحصر کرتا ہے۔ اس لیے ہندی بولنے والوں کو دوسری زبان اور علاقائی زبانوں کو بھی مناسب احترام دینا ہوگا۔ وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ نے کہا کہ ہندی مادری زبان اور سرکاری زبان ہی نہیں بلکہ رابطہ کی زبان بھی ہے جس نے آزادی کی جنگ کے دوران پورے ہندوستان کو آپس میں جوڑ دیا۔ انھوں نے کہا کہ ایک سروے کے مطابق 800 کمیونٹی زبانوں میں سے 799 کمیونٹی زبان بولنے والوں نے تسلیم کیا ہے کہ وہ ہندی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ مسٹر سنگھ نے چین کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ وہ انگریزی کے بل پر نہیں بلکہ منڈارین کے بل پر عظیم طاقت بنا ہے اسی طرح ہندوستان بھی ہندی کے فروغ کے بغیر بڑی طاقت نہیں بن سکتا۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے یوم ہندی کے موقعے پر ملک کے عوام کو مبارکباد دی ہے۔ سرکاری کام کاج میں ہندی کو فروغ دینے کے لیے یکم ستمبر سے 14 ستمبر تک ہندی پکھواڑا منایا جاتا ہے۔ کانگریس صدر سونیا گاندھی نے یوم ہندی کے موقعے پر ملک کی عوام کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ہندی نہ صرف ہمارے ملک کا ثقافتی ورثہ ہے، بلکہ پوری دنیا میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندی کی خدمت کرنے والے سبھی ادبا، مورخین، مصنفین، دستکاروں اور اساتذہ کا شکریہ۔ انھوں نے کہا کہ 1918 کے 'ہندی ساہتیہ سمیلن' میں مہاتما گاندھی نے ہندی کو عام لوگوں کی زبان بھی کہا تھا اور اب ہندوستان نے اسے وسیع پیمانے پر اپنالیا ہے۔ 14 ستمبر 1949 کے دن آئین ساز اسمبلی کی طرف سے ہندی کو راج بھاشا کا درجہ ملا تھا اور ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ اس دن کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ہر سال 14 ستمبر کو ہندی دن منایا جائے۔ 14 ستمبر 1953 کو پہلا ہندی دوس منایا گیا تھا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 ستمبر 2017

## دنیا کے سب سے بڑے آن لائن ٹیچرس ٹریننگ پروگرام کا آغاز

**نئی دھلی:** برسر ملازمت غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی تربیت کے لیے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ (این آئی او ایس) کے ایک معیاری پروگرام ڈپلومہ ان ایلمینٹری ایجوکیشن (ڈی ای آئی ای ڈی) آغاز کا فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر مسٹر پرکاش جاوڈیکر نے نئی دہلی میں کیا۔ اساتذہ کی تربیت سے متعلق یہ پروگرام غیر تربیت یافتہ سرکاری حکومت سے امداد یافتہ، نجی امداد یافتہ تسلیم شدہ اسکولوں میں برسر ملازمت غیر تربیت یافتہ ایلمینٹری

اسکولوں کے اساتذہ کے لیے تیار کیا گیا ہے اور اس میں 15 لاکھ (تقریباً) اساتذہ نے اب تک اندراج کرایا ہے۔ یہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ (این آئی او ایس) کا آن لائن اور فاصلاتی تعلیم سے متعلق ایک کورس ہے۔ اس کا مقصد اساتذہ کی پیشہ ورانہ اہلیت کو بڑھانا اور اطلاعات و مواصلات پر مبنی صلاحیت سازی ہے۔

اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب پرکاش جاوڈیکر نے کہا کہ سبھی غیر تربیت یافتہ اساتذہ کو 2019 تک ٹریننگ دے دی جائے گی۔ اساتذہ کی دستیابی اور معیاری تعلیم طلبا کا حق ہے۔ جدت طرازی اور بہترین طور طریقوں سے یہ بات یقینی بنے گی کہ بہترین اذہان ملک میں جدت طرازی کے اہل بن سکیں اور اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے این آئی او ایس نے اس سمت میں اقدام کیا ہے تاکہ زمینی سطح پر ہی اس کام سے جڑا جاسکے۔

جناب پرکاش جاوڈیکر نے یہ بھی کہا کہ حکومت نظام تعلیم کو بہتر بنانے کے تئیں پابند عہد ہے اور 31 مارچ 2019 تک تقریباً 15 لاکھ غیر تربیت یافتہ اساتذہ کو تربیت دے دی جائے گی اور کامیابی کے ساتھ کورس کی تکمیل کرنے پر اساتذہ کو ڈپلومہ کی ڈگری دی جائے گی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ سویم (ایس ڈبلیو اے وائی اے ایم) کے آغاز کے پہلے سال میں ہی آن لائن ٹریننگ کے معاملے میں ہم عالمی ریکارڈ قائم کر چکے ہیں۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ 31 مارچ 2019 کے

بعد ٹریننگ سے متعلق اس پروگرام میں کوئی توسیع نہیں ہوگی۔

فروغ انسانی وسائل کے وزیر مملکت (اسکولی تعلیم اور خواندگی) جناب اپیندر کشواہا نے ہنرمندی اور معلومات میں اضافے کی بدولت ہندوستان کو تعلیمی اعتبار سے سپر پاور بنانے کے لیے معیار، جدت طرازی اور ریسرچ کے تعلق سے تعلیمی ضرورتوں کے بارے میں نئی جہات کو متعارف کرانے کی سمت میں مسٹر پرکاش جاوڈیکر کی سنجیدہ کوششوں کی ستائش کی۔ انھوں نے ٹیچروں کے معیار کو بہتر بنانے کے اپنے مقصد کے لیے این آئی او ایس کو مبارکباد دی۔

این آئی او ایس کے چیئرمین پروفیسر سی بی شرما نے اس موقعے پر کہا کہ کسی بھی ادارے کے لیے تربیت نہ صرف اہم ہے بلکہ یہ انتہائی ضروری بھی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن'، دہلی، 14 اکتوبر 2017

## این سی پی یو ایل کی بقا مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر کی مرہونِ منت

**مرادآباد:** چند ماہ قبل نیتی آیوگ کی جانب سے شائع ہونے والے اس بیان نے کہ جلد ہی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی یا پھر مولانا آزاد اردو یونیورسٹی حیدرآباد میں ضم کیا جاسکتا ہے۔ اس خبر نے پورے ملک کے محبان اردو کو بے چین کردیا تھا اور بڑی تعداد میں مذکورہ اصحاب نے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پرکاش جاوڈیکر کو خطوط روانہ کیے تھے کہ اگر این سی پی یو ایل کی موجودہ خودمختاری کو ختم کیا جاتا ہے تو اس سے اردو زبان و ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ اسی طرح بے شمار معروف صحافیوں نے بھی اخبارات میں اپنے آرٹیکلس میں یہی بات واضح طور پر تحریر کی تھی اور این سی پی یو ایل کی موجودہ خودمختاری کو برقرار رکھنے کی صلاح دی تھی۔ متعدد تنظیموں نے بھی اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ خاص طور پر ملی ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کا جو ایک گیارہ رکنی وفد موجودہ وزیر پرکاش جاوڈیکر سے ملا تھا تو انھوں نے یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ اس مسئلے پر محبان اردو کے جذبات کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ وفد نے محسوس کیا تھا کہ وہ خود بھی اردو زبان کے شیدائی ہیں اور قومی اردو کونسل کی موجودہ کارکردگی سے بھی پوری طرح مطمئن ہیں اور اسی کے بعد مرکزی حکومت کی جانب سے جب یہ واضح کیا گیا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی موجودہ حیثیت میں فی الحال کوئی تبدیلی نہیں کی جارہی ہے تو ملک کے ہزاروں محبان اردو نے حکومت کے اس فیصلے کی بھرپور ستائش کی۔ آج ملی ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کی مجلس عاملہ کی ایک اہم میٹنگ میں بھی این سی پی یو ایل کی بقا کے لیے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر کی بھرپور ستائش کی گئی۔

تنظیم کے جنرل سکریٹری مختار صدیقی نے کہا کہ پرکاش جاوڈیکر کی شخصیت اس لیے بھی محترم ہوجاتی ہے کہ انھوں نے وزارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ صرف این سی پی یو ایل بلکہ ان تمام محکمہ جات کے لیے بھی کیا جو ان کی وزارت کے تحت آتے ہیں۔ مختار صدیقی نے مزید کہا کہ این سی پی یو ایل کی خودمختاری پرکاش جاوڈیکر اور کونسل کے موجودہ ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کی بے مثال خدمات کا نتیجہ ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 ستمبر 2017

## سفرناموں کی اہمیت پر شعبہ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی میں دو روزہ بین الاقوامی سمینار

**الہ آباد:** تاریخ کی کتابوں میں درج حقائق کا جائزہ اگر معاصر سفرناموں کی روشنی میں لیا جائے تو بہت سے

حقائق خود بخود سامنے آجائیں گے۔ لہٰذا ان پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ساتھ ہی تکنیکی سہولیات کی فراہمی نے آج سفرنامہ کو مسافرنامے میں تبدیل کردیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبہ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی میں دو روزہ بین الاقوامی سمینار کے افتتاحی اجلاس کے دوران اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کیا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے خواہش ظاہر کی کہ اس سمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کتابی شکل میں شائع ہوں، تاکہ زیادہ لوگ مستفید ہوسکیں۔ انھوں نے مطالعہ کی عادت ڈالنے پر بھی زور دیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کلیدی خطبہ پیش کیا، جس میں انھوں نے سفرناموں پر مختلف جہات سے روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ان کی قرأت میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے، کیونکہ بعض اوقات ان میں جھوٹی اطلاعات بھی شامل ہوتی ہیں۔ انھوں نے سفرنامہ ناصر خسرو، اخبار الہند والسین وغیرہ کا ذکر ان کی ادبی و سماجی اہمیت کے اعتبار سے بطور خاص کیا۔

پروگرام کے مہمان خصوصی آقائی حجت اللہ عابدی نے سفرنامہ لکھنے والوں کی جاں فشانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان لوگوں کی تحریریں سفر کی صعوبتوں سے چھن کر نکلتی ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر فارسی زبان میں کی جس کا خلاصہ پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے اردو میں سامعین کے لیے پیش کیا۔ پروفیسر کے ایس مشرا، ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے اچھی اردو میں اپنی تقریر پیش کرکے سامعین کو حیرت میں ڈال دیا۔ انھوں نے کہا کہ سفرنامے آنکھوں دیکھی حقیقت ہیں، اسی لیے وہ تاریخ سے الگ ہیں۔ پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے انیسویں صدی کے ایک سفرنامے کے حوالے سے دو تہذیبوں کی دلچسپ سماجی داستان بیان کی جس میں مصنف نے عورتوں کے مسائل پر بھی گفتگو کی۔

اس سے قبل جلسے کا آغاز شعبہ کے طالب علم محمد قاسم کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد صدر شعبہ ڈاکٹر صالحہ رشید نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا، جن میں صدر نشین حضرات کے علاوہ پورے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں سے شرکت کررہے مندوبین پروفیسر اقبال حسین ای ایف ایل یو حیدرآباد، پروفیسر عائشہ رئیس برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال، پروفیسر وجیہ الدین ایم ایس یونیورسٹی بڑودہ، پروفیسر عراق رضا زیدی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، پروفیسر حبیب اللہ خان جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی دہلی یونیورسٹی، پروفیسر عمر کمال الدین لکھنؤ یونیورسٹی پروفیسر مسعود عالم فلاحی اردو عربی فارسی چشتی یونیورسٹی لکھنؤ کے علاوہ دیگر شرکا نے بحیثیت مندوبین شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 ستمبر 2017

## پہلا عظیم بیگ چغتائی یادگاری خطبہ

**جودھپور:** عظیم بیگ چغتائی اردو کے ان چند اولین فکشن نگاروں میں سے تھے جنھیں ہم نے اس طرح یاد نہیں کیا جیسا کہ ان کا حق تھا۔ عظیم بیگ چغتائی نے اپنے قلم کی توانائی سے وہ تخلیقات دیں جو آج بھی ہمارے ادب کا بڑا سرمایہ ہے۔ ان کی زندگی سے متعلق حقائق کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیاں فروغ پاگئیں لیکن ان پر ہمیں ازسرِ نو کام کرنا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا

آزاد یونیورسٹی جودھپور میں منعقد ہونے والے پہلے عظیم بیگ چغتائی یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے مشہور ناقد اور اردو دانشور پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد یونیورسٹی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے لیکچر شروع کرنے کی تجویز پیش کی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سامنے اگر عظیم بیگ چغتائی پر ایک انٹرنیشنل سیمینار کرنے کی تجویز پیش کی جائے گی تو ہم پوری طرح سے مدد کرنے کو تیار ہیں۔ پروگرام کے آغاز میں مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے جنرل سکریٹری محمد عتیق نے مہمانوں کا استقبال کیا اور سوسائٹی اور مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی۔

پروگرام کی نظامت ادیب و مصنف ڈاکٹر مظفر حسین سید نے کی۔ اس موقعے پر راجستھان اردو اکادمی کے چیئرمین اشرف علی خلجی نے اعلان کیا کہ اردو اکادمی جودھپور میں عظیم بیگ چغتائی کی قبر کی تعمیر نو کرائے گی اور عظیم بیگ چغتائی پر ایک سیمینار کا انعقاد بھی ہوگا۔

اس موقعے پر معروف شاعر اور ادیب شین کاف نظام نے پروفیسر اختر الواسع کو مبارکباد دی کہ انھوں نے عظیم بیگ چغتائی کو ایک دفعہ پھر زندہ کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کے ادبی سرمائے کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس خطبے کی صدارت کرتے ہوئے مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے وائس چانسلر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہم قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے ہر سال اس خطبے کے انعقاد کی ذمے داری ہماری یونیورسٹی کو دی ہے۔ عظیم بیگ چغتائی جسمانی طور پر کیسے ہی بیمار اور کمزور رہے ہوں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اعتبار سے غیر معمولی طور پر توانا تھے۔ انھوں نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا جن میں اعظم جودھپوری، عثمان غنی میمن، رام سنگھ آریہ اور فضل الرحمٰن، حاجی عباد اللہ قریشی، حنیف لوہانی، خالد قریشی، فیروز قاضی، پروگرام ڈائرکٹر محمد امین، مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے رجسٹرار ڈاکٹر عمران خان پٹھان، اسسٹنٹ پروفیسر عبدالعزیز اور بڑی تعداد میں اساتذہ اور طلبا شامل تھے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 اکتوبر 2017

**دہلی:**

## ریختہ میں ریختی کا مقام

**نئی دہلی:** نقش اور سی اے آر ڈی سی کے زیر اہتمام اردو اکادمی کے تعاون سے 'ریختہ میں ریختی کا مقام' کے عنوان سے ایک سیمینار وکل ہند مشاعرے کا انعقاد غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں ہوا جس کی صدارت بزرگ استاد شاعر احمد جلیسری نے کی جبکہ مشاعرے کی نظامت امیر امروہوی نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دی۔ مہمانان خصوصی کے طور پر شگفتہ یاسمین مہک، فصیح چودھری، نسیم نوری، شہاب انور، بیگم وسیم راشد، چشمہ فاروقی اور مینا خان نے شرکت کی۔ اس موقعے پر احمد جلیسری کی تحریر کردہ کتاب رسوائیاں ہرجائیاں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ پی ایچ ڈی کی طالبہ محترمہ صبا اور گلشن نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا۔ مشاعرے کی شمع تمام مہمانان نے مشترکہ طور پر روشن کی، مشاعرے کا آغاز سرفراز احمد فراز دہلوی کے نعتیہ کلام سے ہوا۔ اس موقعے پر احمد جلیسری، ڈاکٹر شمس رمزی، شہاب انور امروہوی، امیر امروہوی، راشدہ باقی حیا، مینا خان مشرف چودھری، عرفان اعظمی، انس فیضی، عارف دہلوی، افضال دہلوی، جگدیش ہمراز، میاں میرٹھی، اسلم خورشید، سیما اقبال ادا، پراچی گورکھپوری اور صدف خالد نے بھی اپنے کلام سے نوازا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 ستمبر 2017

## این سی ای آر ٹی کو ڈگری دینے کا اختیار

**نئی دہلی:** نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (این سی ای آر ٹی) کو اب جلد ہی طلبا کو ڈگری دینے کا اختیار مل جائے گا۔ این سی ای آر ٹی کے ڈائرکٹر رشی کیش سینا پتی نے یو این آئی کو بتایا کہ این سی ای آر ٹی کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (آئی آئی ٹی) کی طرح قومی اہمیت کے حامل ادارے کا درجہ جلد ہی ملنے والا ہے اور یہ درجہ حاصل ہوتے ہی اسے طلبا کو ڈگریاں دینے کا اختیار مل جائے گا۔ اس کے علاوہ طلبا اب یہاں سے ایم فل اور پی ایچ ڈی بھی حاصل کر سکیں گے۔ انھوں نے بتایا کہ انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت نے اس تجویز کو منظوری دے دی ہے اور وزارت قانون نے اس سلسلے میں ایک بل کا شروعاتی خاکہ بھی تیار کرلیا ہے۔ اب اسے متعلقہ وزارتوں کو بھیجا جائے گا جن کے ریمارکس کے بعد مجوزہ بل کی حتمی شکل تیار ہو جائے گی اور اسے کابینہ کی منظوری کے لیے بھیجا جائے گا۔ کابینہ کی منظوری ملتے ہی اس بل کو پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔ مسٹر سینا پتی نے امید ظاہر کی کہ پارلیمنٹ کے سرمائی اجلاس میں اگر یہ بل پیش نہیں کیا جا سکا تو آئندہ بجٹ سیشن میں اسے ضرور پیش کر دیا جائے گا۔ آئندہ تعلیمی سال سے طلبا کو ڈگریاں ملنے کا کام شروع ہو جائے گا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 18 ستمبر 2017

**اترپردیش:**

## ملک کی آزادی میں اردو اخباروں کا تعاون

**لکھنؤ:** عظیم مجاہد آزادی، ایڈیٹر دہلی اردو اخبار مولوی محمد باقر کا 160 واں یوم شہادت ڈاکٹر اے۔ پی جے عبدالکلام ٹرسٹ کی جانب سے لکھنؤ کے وکرما دتیہ مارگ پر منایا گیا۔ اس موقعے پر ایک سیمینار بعنوان 'ملک کی آزادی میں اردو اخباروں کا تعاون' انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے مہمان خصوصی مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے کہا کہ مولوی محمد باقر پہلے اردو اخبار کے مالک اور ایڈیٹر تھے جن کو ملک کی آزادی کے لیے آرٹیکل لکھنے اور عوام میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے انگریزوں نے 16 ستمبر 1857 کو توپ سے اڑا دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ دنیا کے پہلے ایڈیٹر تھے جن کو اپنے ملک کی آزادی کے لیے آواز اٹھانے کی پاداش میں سزا دی گئی۔ انھوں نے کہا کہ پڑھائی جانے والی کتابوں کے نصاب میں مولوی محمد باقر کی سوانح حیات کو شامل کیا جائے۔ اس موقعے پر اپنے خطاب میں محمد مشتاق پردھان نے کہا کہ اتنے عظیم مجاہد آزادی کا یوم شہادت مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو بڑے پیمانے پر منانا چاہیے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے عبدالنصیر ناصر نے کہا کہ دہلی یونیورسٹی کا نام مولوی محمد باقر کے نام سے رکھا جائے اور ان کی یادگار میں یونیورسٹی قائم کی جائے۔ آخر میں مہمانوں کا شکریہ اے پی جے عبدالکلام ٹرسٹ کے نائب صدر انور عالم نے ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 ستمبر 2017

## 'اردو زبان: تہذیب وتاریخ کے تناظر میں'

**لکھنؤ:** اردو زبان صرف ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک تہذیب، تاریخ اور وابستگی کا نام ہے۔ اس زبان کو پڑھنے

اور اس کی تعلیم دینے والے بہت ہی قابل قدر ہیں۔ اردو کو صرف ایک زبان کے طور پر نہیں بلکہ ایک تہذیبی اور ثقافتی ورثے کے طور پر پڑھنے اور پڑھانے کی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اپنے اس عظیم سرمائے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر اور معروف ادیب و شاعر پروفیسر خالد محمود نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں توسیعی خطبے کے دوران کیا۔ انھوں نے 'اردو زبان، تہذیب اور تاریخ کے تناظر میں' موضوع پر توسیعی خطبہ پیش کیا۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر اور طلبہ نے خصوصی طور پر شرکت کی۔

پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ مادری زبان ہونے کی

وجہ سے اس زبان کے تئیں ہماری جو ذمے داریاں ہیں بدقسمتی سے ہم نے انھیں ادا نہیں کیا۔ ادب اور تہذیب و ثقافت کا ایک بڑا سرمایہ اس زبان میں موجود ہے اور جس طرح ہم اس زبان سے دور ہوتے جارہے ہیں اسی طرح ہم اس کے تہذیبی اور ثقافتی سرمایے سے بھی دور ہوتے جارہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ستم یہ ہے کہ ہمارے اندر اس کا احساس بھی نہیں ہے کہ ہم اپنی زبان سے دور ہورہے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک بہترین تہذیب اور ثقافت کو کھوتے جارہے ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اردو کے طلبا کے سامنے بہت سے چیلنجز ہیں لیکن اگر وہ اس زبان کے توسط سے تہذیب و ثقافت اور اخلاق و ادب کے علمبردار بن جائیں تو بہت کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ زبان محض روزگار کے توسط سے فروغ نہیں پاسکتی جب تک کہ ہمارے اندر اس کے سیکھنے کا شوق اور جذبہ نہ ہو۔ اس موقعے پر کیمپس کے انچارج ڈاکٹر عبدالقدوس نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ توسیعی خطبات ہمارے تعلیمی پروگرام کا حصہ ہیں۔ ہم کتاب کے ساتھ ساتھ طلبا کو ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملاقات کراتے رہتے ہیں۔ نئے تعلیمی سال کا یہ پہلا لیکچر ہے۔ توسیعی خطبے میں ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر مجاہدالاسلام اور ڈاکٹر نور فاطمہ بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر عشرت ناہید نے شکریے کے کلمات ادا کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 ستمبر 2017

## 'یادِ جگر'

**مراد آباد:** جگر مراد آبادی فیڈریشن کے زیر اہتمام مقامی آئی ایم اے ہال کچہری کمپاؤنڈ میں 'یادِ جگر' کے عنوان سے ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کا آغاز جگر مراد آبادی کے کلام سے کیا گیا۔ نعت پاک محمد ناظم نے پیش کی۔ مشاعرے کی صدارت معروف گیت کار مہیشور تیواری نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رحمٰن مصور دہلوی نے انجام دیے۔ مشاعرے کے مہمان خصوصی ڈاکٹر ایس ٹی حسن و ہمایوں قدیر تھے۔ جگر فیڈریشن کے صدر عالمی شہرت یافتہ شاعر منصور عثمانی اور جنرل سکریٹری سید یوسف علی نے جگر مراد آبادی کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات و اوصاف حمیدہ پر روشنی ڈالی۔ صدر مشاعرہ نے کہا کہ جگر مراد آبادی ایک وطن پرست اور تغزل کے باکمال شاعر تھے جن کی خدمات کی وجہ سے جگر صاحب اور شہر جگر کا نام دنیائے علم و ادب میں ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ اس موقعے پر مہمانان ومیزبان شعرا نے اشعار پیش کیے۔ ان میں مہیشور تیواری، اطہر عنایتی، حبیب سوز، منصور عثمانی، ڈاکٹر مجاہد فراز، ڈاکٹر کرشن کمار ناز، ڈاکٹر رحمٰن مصور، عزم شاکری، کلیم صمد وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 ستمبر 2017

## مشہور خطاط محمد احرار ہندی کی خطاطی کی نمائش

**رامپور:** رامپور رضا لائبریری میں ملک کے مشہور خطاط و خوشنویس جناب محمد احرار ہندی کی آمد پر ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور ان کے خطاطی کے نمونوں کی ایک نمائش بھی لگائی گئی جس کا افتتاح بریلی سے تشریف لائے روہیل کھنڈ یونیورسٹی کے شعبۂ ایران شناسی کے پروفیسر ابھے کمار سنگھ نے کیا۔ اور اسٹاف اور ناظرین نے خطاطی کے نمونوں کو خوب سراہا۔

اس موقعے پر اپنے خیر مقدمی کلمات میں ان کا مختصر تعارف کراتے ہوئے رضا لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر حسن عباس نے کہا کہ آج کمپیوٹر کے دور میں انسان اتنا مشینی ہوگیا ہے کہ انسان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں

اور اس فن کی اہمیت تقریباً ختم ہوتی جارہی ہے اور فن خوشنویسی کے جاننے والے بہت کم ہوتے جارہے ہیں۔ پھر بھی ایسے دور میں جناب احرار ہندی کا اس فن میں اتنی مہارت حاصل کرنا اور اس فن کی دل و جان سے آبیاری کرنا بہت بڑی بات ہے۔ ہمیں ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور ان کے فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

مہمان خصوصی ماہر خطاط و خوشنویس جناب احرار ہندی نے کہا کہ میں دھنباد کے ایسے علاقہ سے ہوں جو علمی طور پر بالکل پسماندہ ہے۔ مجھے اپنے بچپن سے ہی اس فن سے لگاؤ تھا اور میں نے یہ اپنے والد محترم سے سیکھا ہے وہ اپنے فن کے استاد تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایران کے ماہر خوشنویسوں نے میرے ان نمونوں کو بہت پسند کیا ہے۔ وہاں کے ایک استاد خوش نویس رسول مرادی ہندستان تشریف لائے تھے اور ان کے فن کی' میری خطاطی کے نمونوں کے ساتھ مشترک نمائش غالب انسٹی ٹیوٹ میں لگائی جاچکی ہے۔

اس موقعے پر بریلی سے تشریف لائے پروفیسر ابھے کمار سنگھ نے کہا کہ یہاں آکر احرار کے خطاطی کے نمونے کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ کمپیوٹر کے اس دور میں جس نے خطاطی کے فن کو بہت نقصان پہنچایا ہے، آج بھی ایسے ماہر خطاط موجود ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے حاضرین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈائرکٹر رضا لائبریری، رامپور، 15 ستمبر 2017

## برطانیہ کے ڈپٹی ہائی کمشنر کا دورۂ دیوبند

**دیوبند:** برطانیہ کے قونصل خانہ کے ڈپٹی ہائی کمشنر ڈاکٹر الیگزینڈر ایوانس، سیکنڈ سکریٹری ہائی کمشنر ای ڈی بونسلی اور اسعد مرزا پر مشتمل تین رکنی وفد عالمی شہرت یافتہ دینی دانش گاہ دارالعلوم دیوبند پہنچا۔ وفد نے پہلے مہمان خانے پہنچ کر دارالعلوم کے مہتمم مفتی ابوالقاسم نعمانی اور نائب مہتمم مولانا عبدالخالق مدراسی سے ملاقات کی۔ دوران گفتگو مولانا عبدالخالق مدراسی نے وفد کو دارالعلوم کی تاریخ مختصراً بتائی اور دارالعلوم میں دی جانے والی تعلیم کے سلسلے میں تفصیلات سے آگاہ کیا۔ وفد نے خواہش ظاہر کی کہ وہ یہاں کی طرز تعلیم کا عملی طور سے مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے اس ذوق اور تجسس کو دیکھتے ہوئے مفتی ابوالقاسم نعمانی وفد کے اراکین کو اپنے ہمراہ لے کر ایک درس گاہ میں لے گئے جہاں اراکین وفد نے کافی دیر تک یہاں کے طرز تعلیم کا عملی مشاہدہ کیا۔

ڈاکٹر الیگزینڈر ایوانس اور ای ڈی بونسلی نے کہا کہ وہ کافی عرصے سے اس تجسس میں تھے کہ دینی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بہت کم عمر مسلم بچے عربی کی ضخیم کتب اور کلام پاک کو کس طرح سے ازبر کرلیتے ہیں، اس کا بذات خود مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ ضخیم کتب اور کلام پاک ان کے حافظے میں بغیر کسی زیر زبر کی غلطی کے حرف بہ حرف محفوظ رہتی ہیں۔ اراکین وفد نے اس کو معجزہ سے تعبیر کیا۔ درس میں شرکت کرنے کے بعد قونصل خانے کے افسران نے دارالعلوم دیوبند کی تاریخی لائبریری کا نہایت انہماک کے ساتھ جائزہ لیا اور ہزاروں علوم وفنون پر مبنی کتابوں کے ذخیرے کو انمول اور دنیا کے بیشتر نایاب علوم کا خزانہ بتایا۔ بعد ازاں وفد نے دارالعلوم کی دیدہ زیب، عالی شان اور فن تعمیر کا نمونہ مسجد رشید کا دیدار کیا۔ ڈپٹی ہائی کمشنر ڈاکٹر الیگزینڈر ایوانس، سیکنڈ سکریٹری ہائی کمشنر ای ڈی بونسلی اور اسعد مرزا نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ آج یہاں آکر فخر اور طمانیت محسوس کررہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دارالعلوم دیوبند کے دیدار کے بعد ان کی تشنگی میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 اکتوبر 2017

## خواتین کی تعلیم، خواندگی اور خود کفالت

**لکھنؤ:** بزم خواتین کی جانب سے ایک روزہ سمینار میں 'خواتین کی تعلیم، خواندگی اور خود کفالت' جیسے اہم موضوع پر چرچا ہوئی جس میں خواتین کے اَپ گریڈیشن اور آتش گیر عنوان پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ سمینار وحید اللہ ہال فرنگی محل چوک میں منعقد کیا گیا جس میں ڈاکٹر عشرت ناہید،

اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی، ڈاکٹر تسلیم چشتی (صدر شعبۂ فارسی، کرامت ڈگری کالج)، مشہور وکیل ریتا پانڈے نے اپنے خیالات کو پیش کیا۔ سمینار کی صدارت بزم خواتین کی صدر بیگم شہناز سدرت نے کی۔ خواتین کی تعلیم کے لیے کام کر رہیں بیگم سدرت نے بتایا کہ بزم خواتین کا مقصد ضرورت مند خواتین کی مدد کرنا ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عشرت ناہید نے کہا کہ عورت کے دم سے ہی کائنات کی تمام رونقیں ہیں۔ اسی میں سماج کو بدلنے کی قوت ہے۔ اس کا خود کفیل ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر تسلیم چشتی نے بتایا کہ تعلیم اور خود کفالت سے ہی مسلم خواتین کی ترقی ممکن ہے، کیونکہ خواتین کفالت صرف علم کے زور پر ہی پاسکتی ہیں۔ ریتا پانڈے نے کہا کہ ہمیں اس بات پر زور دینا چاہیے کہ خواتین سماج میں تبدیلیاں لائیں۔ شہناز سدرت نے بھی موجودہ خواتین کو 'سمان کوش یوجنا' سے بھی واقف کرایا جو کہ طلاق شدہ خواتین کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے متجاوز ہے۔ بزم خواتین کی صدر شہناز سدرت نے سبھی خواتین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' لکھنؤ، 15 اکتوبر 2017

**بہار:**

## پروفیسر عبدالمغنی یادگاری تقریب

**پٹنہ:** پروفیسر عبدالمغنی اردو ادب کے ایک اہم نقاد اور بہار میں اردو تحریک کے ایک بڑے سالار اور روح رواں

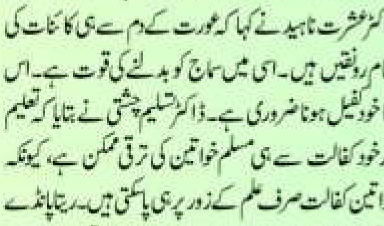

رہے ہیں۔ وہ ایک دانشور، نقاد، صحافی، ماہر تعلیم، بہترین معلم اور ایک عالم دین کے ساتھ ایک اچھے مقرر بھی تھے جس کی بدولت انھوں نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں ان کا موثر کردار رہا ہے۔ ان کو عربی، فارسی، انگریزی اور اردو چاروں زبانوں پر یکساں قدرت اور مہارت حاصل تھی۔ ان کی علمیت اور غیر معمولی صلاحیت کا سکہ چاروں طرف تھا۔ وہ اردو ادب میں صالح فکر و نظر کے علمبردار تھے۔ اردو ڈائریکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے پروفیسر عبدالمغنی کے حوالے سے یہ باتیں کہیں۔ امتیاز کریمی محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام پروفیسر عبدالمغنی کی یادگاری تقریب اسمبلیکھ بھون کے کانفرنس ہال میں خطاب کر رہے تھے۔ فخر الدین عارفی نے کہا کہ پروفیسر عبدالمغنی جیسا ناقد، نثر نگار اور صالح اقدار کا حامل شخص مشکل سے ملے گا۔ ان کی نثر نگاری میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت ابوالاعلیٰ مودودی کی جھلک تھی۔ ڈاکٹر ریحان غنی نے کہا کہ ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ کلاسیکی ادب کے شیدائی، جدیدیت کے شدید مخالف اور اردو تحریک کے علمبردار تھے۔ اردو تحریک کو انھوں نے پروان چڑھایا اور بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلوایا۔ انجمن ترقی اردو کے ترجمان 'مریخ' کے ذریعے انھوں نے کلاسیکی ادب کی حمایت کی اور جدیدیت کے خلاف علم بلند کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر احمد سجاد نے پروفیسر عبدالمغنی: چند یادیں، چند باتیں' کے حوالے سے کہا کہ پروفیسر عبدالمغنی کی تحریر جتنی منظم تھی اتنی ان کی گفتگو بھی۔ شفیع مشہدی، چیئرمین اردو مشاورتی کمیٹی، بہار نے اردو تحریک کے روح رواں پروفیسر عبدالمغنی کی شخصیت اور ان کی خدمات پر صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر اسلم جاوداں نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 ستمبر 2017

## بی این منڈل یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام

**مدھے پورہ:** بی این منڈل یونیورسٹی میں 25 برسوں کے بعد شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا ہے جس کا بڑے پیمانے پر خیر مقدم کیا جارہا ہے۔ خاص طور پر محمد فصیح الدین کو شعبۂ اردو کا صدر بنا کر انھیں جو ذمے داریاں سونپی گئی ہیں وہ قابل تحسین قدم ہے۔ اس سلسلے میں مسٹر فصیح الدین نے نامہ نگاروں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی انتظامیہ اردو طلبا و طالبات کے مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی میں آرہی رکاوٹوں کو جس طرح سے دور کرتے ہوئے شعبہ اردو کا قیام عمل میں لائی ہے اس کے لیے وائس چانسلر ڈاکٹر اے کے بھے کمار اور پرو وائس چانسلر فاروق علی مبارکباد کے مستحق ہیں کیونکہ ان دونوں نے شروع سے ہی اس بات کی کوشش کی کہ ہر حال میں بی این منڈل یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قائم کیا جائے گا تاکہ اس علاقے میں اردو سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کو پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آج وہ دن ہمارے سامنے آگیا جب اردو شعبہ قائم ہوکر اردو کے فروغ میں اہم رول ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 ستمبر 2017

## اردو کی اہمیت اور عوامی مقبولیت

**بانکا:** شہر کے ٹی ہال میں ضلع اردو زبان سیل کی جانب سے اردو کی اہمیت اور عوامی مقبولیت کے موضوع پر ضلع اقلیتی فلاح افسر اودھیش کمار کی صدارت میں 14 اکتوبر کو بحث و مباحثہ مقابلے کا انعقاد ہوا۔ ضلع بھر کے میٹرک، انٹر اور گریجویٹ کے درجنوں طلبا و طالبات نے مقابلے میں حصہ لیا۔ پروگرام کے آغاز میں ضلع اقلیتی فلاح افسر نے کہا کہ ادب ہو یا شاعری، گیت ہو یا غزل یہ اردو کی اہم دین ہے۔ یہ زبان لوگوں کے دلوں کو جوڑتی ہے۔ اردو کے الفاظ کے استعمال سے ہی کسی بھی جذبے کو اس کا مقام مل جاتا ہے۔ اس دوران میٹرک کے طلبا نے تعلیم کی اہمیت، انٹر کے طلبا نے اردو زبان کی اہمیت اور گریجویٹ طلبا نے اردو غزل کی عوامی مقبولیت کے موضوع پر بحث و مباحثہ میں حصہ لیا۔ اس میں بہتر مظاہرہ کرنے والے 24 طلبا و طالبات کو ضلع اقلیتی فلاح افسر نے سرٹیفکیٹ دیا۔ کامیاب طلبا میں احتشام، محمد توفیق رضا، بی بی زویا، رانی بیگم، جسیم اختر، شہباز جلال وغیرہ شامل ہیں۔ اس موقعے پر ضلع اردو سیل کے محمد مہتاب عالم، محمد ولی احمد، محمد علاء الدین، محمد شمشاد، دلیپ شریواستو، حسنین فاروق وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 اکتوبر 2017

**چھتیس گڑھ:**

## 'آئینہ ادب' کے زیر اہتمام محفل مشاعرہ

**بھلائی / چھتیس گڑھ:** ادبی و ثقافتی انجمن 'آئینہ ادب' کے زیر اہتمام مقبول ناظم مشاعرہ اعجاز انصاری اور معروف شاعر سید راشد حامدی کے اعزاز میں کافی ہاؤس ہال میں ایک محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سید انعام اللہ، ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج نے کی جبکہ نظامت کے فرائض اسرائیل بیگ شاد نے انجام دیے۔ اس موقعے پر سریندر سنگھ کھمبو، محمد اکرم قریشی اور چندر کانتا نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے پروگرام کو رونق بخشی۔ آغاز میں

مہمان اعزازی اعجاز انصاری اور راشد حامدی کا استقبال گل پوشی سے کیا گیا۔ ان کی خدمات پر ناظم مشاعرہ نے روشنی ڈالی اور پھر انھیں مہمانان خصوصی کے ذریعے مومنٹو اور شال دیا گیا۔ بعد ازاں مشاعرے کا باقاعدہ آغاز ہوا جس میں قرب و جوار کے تقریباً ڈیڑھ درجن شعرا اور کویوں نے اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں آئینہ ادب کے بنیاد گزار ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے صاحب زادے سینئر ایڈوکیٹ شکیل احمد صدیقی نے پروگرام کے سلسلے میں اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے مہمانان اعزازی کو خراج تحسین بھی پیش کیا۔ کنوینر یوسف ساگر کے کلمات تشکر کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 ستمبر 2017

**گجرات:**

## گجرات یونیورسٹی میں پہلی بار یومِ اردو کا اہتمام

**احمد آباد:** گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ مانی جانے والی اردو زبان سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان بن گئی ہے۔ ایسے میں اردو کو فروغ دینے کے لیے یوم اردو منایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے گجرات یونیورسٹی کے بھاشا بھون میں 9 ستمبر کو ایک شاندار پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔ اس تعلق سے گجرات یونیورسٹی شعبہ اردو فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر مسیح الزماں انصاری نے کہا کہ امیر خسرو کا یوم وفات ہے اور 9 نومبر کو علامہ اقبال کی یوم پیدائش ہے۔ اس کا خیال رکھتے ہوئے ہم نے آج یوم اردو منایا، جس میں اردو کے تمام ادبا نے اپنی اپنی بات رکھی۔ ہندوستان میں کوئی بولی سب سے زیادہ بولی جاتی ہے تو وہ ہے اردو۔ اردو بولنے والوں سے زیادہ دوسری زبان والے اردو زبان بولتے ہیں، لیکن وہ اردو لکھ نہیں پاتے، مگر اردو سمجھتے ضرور ہیں اور اردو کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ اردو ادیب و پروفیسر نثار احمد انصاری نے اس سلسلے میں کہا کہ آج تو ساری دنیا میں اردو نے دھوم مچا رکھی ہے اور گجرات یونیورسٹی میں اردو ڈے منایا گیا ہے، یہ بے حد خوشی کی بات ہے۔ یوم اردو پر گجرات یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہمانشو پنڈیا، سائنسداں پروفیسر مان سنگھ، پروفیسر محی الدین بومبے والا، پروفیسر عباسی اور پروفیسر نثار احمد انصاری نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 11 ستمبر 2017

**مہاراشٹر:**

## اردو ادب میں خواتین کا حصہ

**ممبئی:** اردو کی معروف مصنفہ اور شاعرہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے کہا کہ اردو ادب کو وقیع اور ثروت مند بنانے میں 160 خواتین کی خدمات دو صورتوں میں نظر آتی ہیں ایک تو یہ کہ بحیثیت تخلیق کار انھوں نے نظم و نثر کے مختلف اصناف کو نئی تخلیقی جہتوں سے روشناس کیا اور دوسرے یہ کہ شعر و ادب میں ان کے مسائل و معاملات کو موضوع بنا کر ایسے ادب پارے تخلیق کیے گئے جن میں خواتین کی خانگی نیز سماجی زندگی کا عکس تہذیبی روایت، معاشی مسائل اور جذباتی تصادم کے آئینہ میں نظر آتا ہے۔ موصوفہ شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی اور مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے باہمی اشتراک سے 'اردو ادب میں خواتین کا حصہ' کے موضوع پر منعقدہ ایک قومی سمینار میں کلیدی خطبہ پیش کر رہی تھیں۔ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے کہا کہ عورت کے بغیر ادب کی تخلیق کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا اور اس اعتبار سے خواتین کی خدمات کے اعتراف کے طور پر شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی کی جانب سے قومی سمینار کا انعقاد ایک بہترین اور کارآمد ادبی پہل ہے۔ تھیٹر اور فلموں کی دنیا کی معروف و ممتاز شخصیت نادرہ ظہیر ببر نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ یہ زمانہ سماج میں حقوق نسواں کے تحفظ اور سماجی و تہذیبی سطح پر ان کی خدمات کے اعتراف کا زمانہ ہے اور یہ سمینار اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ افتتاحی اجلاس کا آغاز صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی پروفیسر صاحب علی کے استقبالیہ کلمات کے ساتھ ہوا۔ انھوں نے انیسویں صدی سے لے کر عصر حاضر تک خواتین قلمکاروں کا مختصر مگر معلوماتی تعارف پیش کیا۔ انھوں نے شہر اور بیرون شہر سے تشریف لانے والی خواتین کا شکریہ ادا کیا۔ منور پیر بائی نے بھی اس اجلاس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ دنیا کی ہر بڑی زبان کے ادب میں خواتین کی خدمات کے نقوش و نشان نظر آتے ہیں اور اردو ادب بھی اس سے الگ نہیں ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 23 ستمبر 2017

## طرحی مشاعرے کا انعقاد

**دھولیہ:** 26 اگست 2017 کو بمقام الہٰی تنظیمی ادارہ کی جانب سے ایک باوقار استقبالیہ غیر طرحی مشاعرے کا کامیاب انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف ادیب و مبصر جناب ابوذر انصاری مالیگانوی (ہیرا گولڈ) نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے صاحبان اعزاز کو مشورہ دیا کہ وہ رابطے میں آنے والے طلبا کو اکتساب علم کے لیے محنت کا شعار اپنانے کی نصیحت فرمائیں۔ پروگرام کا افتتاح جنتا کوآپریٹیو بینک مالیگاؤں کے موجودہ چیئرمین جناب یعقوب برکت اللہ سیٹھ کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ انھوں نے اپنے افتتاحیہ خطبے میں صاحبان استقبال کی حوصلہ افزائی دل نشیں لہجے میں فرمائی اور ایک صحت مند معاشرے میں تعاون کا پیغام دیا۔ مہمانان کا تفصیلی تعارف مالیگاؤں ہی کے معروف صحافی، ادیب اور تبصرہ نگار شمس الضحیٰ اسرائیل اور استاد و لئیق انور نے پیش کیا۔ دھولیہ کے صاحبان اعزاز کا تعارف نواب سر اور فیروز سر نے پیش کیا۔ مالیگاؤں ہی کے معروف ادیب اور ماہر غالبیات جناب سعید پرویز نے تاثرات بیان کیے۔ مشاعرے کی ابتدا ابواسامہ (ابن آدم) نے اپنی غزلوں سے کی۔ بعد ازاں ڈاکٹر حفظ الرحمٰن (شہ روز خاور)، صالح بن تابش، فیروز سر، فاروق اقبال، ممتاز نادر، اقبال نذیر، رئیس قتیل، جاوید حسین جاوید اور استاد الشعرا شکیل ابن شرف نے اپنے منتخب معیاری غیر طرحی کلام سے سامعین کو نوازا اور بھرپور داد و تحسین حاصل کی۔ پروگرام کی نظامت غلام مصطفیٰ رضا نے بحسن وخوبی انجام دی۔

پریس ریلیز: صدر ما کارنی ویلفیئر اینڈ ایجوکیشن سوسائٹی، دھولیہ، مہاراشٹر 26 اگست 2017

**مدھیہ پردیش:**

## بزم نو آموز: مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی غزل کلاس

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی محکمہ ثقافت کے ذریعے سلسلے کے تحت 'بزم نو آموز' 9 ستمبر 2017 کو مہادیوی ورما ہال، ہندی بھون، پالی ٹیکنک چوراہا، بھوپال میں بزرگ شاعر جناب ظفر نسیمی کی صدارت اور مہمان خصوصی جناب فارق انجم کی موجودگی میں منعقد ہوئی۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری ڈاکٹر نصرت مہدی نے مہمانوں کا استقبال پھولوں کے گلدستوں سے کیا اور اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ اکادمی کے ذریعے چلائی جارہی غزل کلاس سے ہر سال کئی اچھے شاعر نکل رہے ہیں۔ اردو اکادمی کی کوشش ہوتی ہے کہ انھیں ابتدا میں اسٹیج بھی اکادمی کے ذریعے فراہم کیا جائے اور یہ شعری نشست بھی اسی کا حصہ ہے۔ غزل کلاس کے استاد ڈاکٹر محمد اعظم نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور جناب ابرار نعمی نے 'نئی غزل اشارات و امکانات' عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ اس کے بعد شاعری کا دور شروع ہوا۔ مشاعرے کی نظامت جناب محمد اعظم نے کی۔ غزل کلاس کے جن شعرا نے اپنا کلام سنایا ان کے نام اس طرح ہیں: کانتا رائے، محمد سلمان انصاری، دانش خان، پون کمار آزاد، سریش پیرا، ڈاکٹر عمیر عابد، ندیم علی، سیف اللہ، نعمان خان، انور شیخ انور، سمیر راشد، سید احمد علی، نفیسہ سلطانہ، اسامہ ارشاد علی، عظیم اثر، کملیش کمار ورما، شارق نور، پریم چند جیٹھوانی، سلمان عزیز، فرحان منظر، ینگ کرکرے کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز: سکریٹری ایم پی اردو اکادمی، بھوپال، 20 ستمبر 2017

کیپٹل فاؤنڈیشن نیشنل ایوارڈ کا منظر

**اعزاز و اکرام:**

## کیپٹل فاؤنڈیشن نیشنل ایوارڈ

**نئی دھلی:** جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد کو یونیورسٹی انتظام اور تعلیم بہتری کے کاموں میں ان کی شراکت کے لیے کیپٹل فاؤنڈیشن نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ غیر سرکاری اور غیر منافع بخش تنظیم کیپٹل فاؤنڈیشن سوسائٹی کی جانب سے مرکزی وزیر شری روی شنکر پرساد نے نئی دہلی میں منعقد ایک تقریب میں انھیں اس اعزاز سے نوازا۔

پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ انھیں خوشی ہے کہ کشمیر یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ملک کے کچھ دوسرے اداروں میں تعلیم، خاص طور پر تحقیق کو فروغ دینے کے لیے ان کی کوششوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ دہلی واقع کیپٹل فاؤنڈیشن سوسائٹی کا قیام 1987 میں عمل میں آیا تھا۔ اس کے بانی جسٹس وی آر کرشنا ایئر تھے۔ یہ ادارہ ان لوگوں کی عزت افزائی کے لیے معروف ہے جو قومی اور بین الاقوامی عوامی بیداری اور تعلیم کے لیے کام کرتے ہیں۔ یہ ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں سابق وزیر اعظم آئی کے گجرال، ہندوستان کے سابق اٹارنی جنرل سولی سوراب جی، دہلی ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس راجندر سچر، سابق مرکزی وزیر کپل سبل، سلمان خورشید اور دہلی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر دیپک پینٹل شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 ستمبر 2017

## پروفیسر اختر الواسع

**نئی دھلی:** جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پروفیسر اختر الواسع

کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں پروفیسر ایمریٹس بنا کر علمی دنیا کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ اعزاز پروفیسر اختر الواسع کے ساتھ ساتھ خود جامعہ کے لیے بھی عزت و افتخار میں اضافہ کرے گا۔ ان خیالات کا اظہار انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر منظور عالم نے ان کے پروفیسر ایمریٹس بنائے جانے پر کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس اعزاز کے ملنے کے بعد پروفیسر اختر الواسع کی علمی سرگرمیوں سے اسلامیات کے طلبہ و اساتذہ کو مزید استفادہ کا موقع ملے گا۔

پروفیسر اختر الواسع کی شخصیت کی جامعیت سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ملی، ملکی اور عالمی فورموں میں ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کی مزید بہتر انداز میں نمائندگی کرسکیں گے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 ستمبر 2017

## بجنور اردو ایوارڈ 2017

**بجنور:** تعلیم اور اردو کے شعبے میں نمایاں کارکردگی انجام دینے والی شخصیات کو بھارتیہ دیہات ترقی خدمت تنظیم بجنور کی جانب سے 'بجنور اردو ایوارڈ 2017' سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ تقریب 10 ستمبر کو منعقد کی گئی۔ اعزاز حاصل کرنے والوں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر (انتظامیہ) اور بجنور دیہات کے لائق فرزند شری کمل سنگھ، دبستان بجنور کے مصنف اردو ادیب ڈاکٹر شیخ نگینوی، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، معروف طنز و مزاح نگار و صحافی اسد رضا، آل انڈیا ریڈیو نجیب آباد کے سابق سکریٹری اقبال احمد صدیقی، معروف شاعر اور صحافی ارشد ندیم، سماجی کارکن شکیل احمد رضا کو ضلع مجسٹریٹ بجنور کے نمائندہ تحصیلدار یدویر سنگھ اور سوسائٹی کے سکریٹری ابرار احمد ایڈوکیٹ کے بدست اعزازی سند، مومنٹو دے کر بجنور اردو ایوارڈ 2017 کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

پریس ریلیز: شیخ نگینوی، بجنور، یوپی، 15 ستمبر 2017

## ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو ساہتیہ شرومنی ایوارڈ

**دیوبند:** اسلامیہ انٹر کالج کے احاطے میں منعقدہ ایک پروگرام میں عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی، اسلامیہ انٹر کالج کے پرنسپل شمیم مرتضیٰ فاروقی، ارون اگروال کے ہاتھوں شہر کے معروف شاعر ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو بزم ادب کی جانب سے 'ساہتیہ شرومنی ایوارڈ' سے نوازا

گیا۔ اس موقعے پر کمل دیوبندی نے کہا کہ ڈاکٹر شمیم دیوبندی کی ادبی خدمات انمول ہیں جو وہ لگ بھگ تیس سالوں سے انجام دے رہے ہیں۔ بزم ادب نے یہ ایوارڈ دے کر حق ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر ایس اے عزیز نے کہا کہ ڈاکٹر شمیم دیوبندی کا تعلق اردو اور ہندی ادب سے بہت قدیم رہا ہے۔ موصوف 30 سال سے اردو اور ہندی کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اپنی غزلوں اور کویتاؤں کے ذریعے معاشرے کو درپیش مسائل مزاحیہ انداز میں پیش کرتے رہے ہیں۔ میونسپل بورڈ کے سابق چیئرمین ضیاء الدین انصاری اور دیگر شرکا نے بھی اپنے تاثرات بیان کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے بزم ادب کے ذمے داران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ایک ذرہ کو ماہتاب آپ لوگوں کی محبت نے بنایا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 ستمبر 2017

## منتوسرکل کے طلبا کو صوبائی ایوارڈ

**علی گڑھ:** علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ملک کے ممتاز تعلیمی اداروں کی رینکنگ میں یوں ہی صف اوّل میں مقام حاصل نہیں کیا بلکہ یہاں کی تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں اساتذہ کی محنت اور طلبا کی کامیابیوں سے یہ ممکن ہو پایا ہے۔ ان خیالات کا اظہار آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن و کنوینر بابری مسجد ایکشن کمیٹی ظفریاب جیلانی نے لکھنؤ کے امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ میں منعقد صوبائی سطح کے سیرت مقابلے کی اس تقریب میں کیا جس میں سیدنا طاہر سیف الدین اسکول (منتوسرکل) کے طلبا نے انگریزی اور اردو تقریری مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔ غور طلب ہے کہ آل انڈیا مسلم یوتھ کنونشن کے تحت

امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ نے صوبائی سطح کے تقریری مقابلہ منعقد کیا تھا جس میں سیکنڈری سطح پر 18 اضلاع کے اسکول نے شرکت کی تھی جس میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے تقریری مقابلے میں منتو سرکل کے دسویں جماعت کے طالب علم اظہر داؤد نے اردو اور محمد زید خاں نے انگریزی زبان کی تقریر میں صوبائی ایوارڈ حاصل کیا۔ طلبا کی اس کامیابی پر اسکول کے پرنسپل فیصل نفیس نے طلبا کے والدین کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 ستمبر 2017

## یوٹی سی طلبہ و طالبات کو تقسیم اسناد

**لکھنؤ:** اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے۔ اس تہذیب کی حفاظت ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ ان خیالات کا اظہار بطور مہمان خصوصی خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر اعظم انصاری نے مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیراہتمام یوٹی سی کے طلبہ و طالبات کو سینٹ روز پبلک اسکول میں منعقد جلسہ انعامات و اسناد سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ سند اردو کا ایک حلف نامہ ہے۔ موجودہ دور میں اردو کے حوالے سے طلبہ و طالبات کی ترقی کی امید حوصلہ مندی سے کم نہیں۔ یہ طلبہ ہمارے لیے عظمت کا نشان اور اردو تہذیب کی پہچان ہیں۔ جلسہ کے صدر عثمان عازم نے طلبہ و طالبات کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ سند یافتگان طلبہ و طالبات سے امید ہے کہ آنے والی زندگی میں اردو ادب کا پرچم بلند کریں گے۔ جلسے کا آغاز شائستہ وارث خاں اور سلمہ بانو کی نعت پاک سے ہوا۔ صدارت محمد عثمان خاں عازم لکھنوی نے کی جبکہ بطور مہمان خصوصی خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی کے ڈاکٹر اعظم انصاری شریک ہوئے۔ مہمان اعزازی کے طور پر فہمیدہ صدیقی، ڈاکٹر عبدالسلام اور شکیل گیاوی نے شرکت کی۔ نظامت ڈاکٹر منصور حسن خاں نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 ستمبر 2017

## ہونہار بچوں کے اعزاز میں شاندار تقریب کا انعقاد

**برہان پور:** مدھیہ پردیش مسلم ایجوکیشن سوسائٹی برہانپور کے زیراہتمام آل انڈیا اردو رابطہ کمیٹی کے اشتراک سے برہان پور میں 10 ویں جماعت میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے والے ہونہار مسلم طلبا و طالبات کی حوصلہ افزائی کے سلسلے میں ایک اعزازی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ 7 ستمبر بروز جمعرات گجراتی دھرم شالہ میں منعقد مذکورہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت سید فرید (معروف صنعت کار) نے فرمائی۔ مہمانانِ معظم کی حیثیت سے ارچنا چٹنیس مہیلا بال وکاس منتری نے شرکت فرمائی۔ مہمانانِ خصوصی کے طور پر عبدالکریم سالار صدر اقرا ایجوکیشن سوسائٹی جلگاؤں و دیگر شرکا موجود تھے۔ اس اجلاس میں 10 ویں جماعت کے تقریباً 60 بچوں کو مومنٹو اور سرٹیفکیٹ پیش کیا گیا، ساتھ ہی والی بال کھلاڑی کی حیثیت سے صدف انصاری اور ثنا انصاری کو بیسٹ کھلاڑی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ برہان پور میں علمی ادبی و سماجی خدمت گزار شخصیات میں ڈاکٹر عبدالحفیظ جھولے والا سابق پرنسپل طبیہ کالج برہان پور، ارچنا گووندجی والا پرنسپل پی آر بی ہائر سیکنڈری اسکول برہان پور، عزیز خان صدر گلشن ادب اردو لائبریری برہان پور، صاحبو محبوب تڑوی پرنسپل نیوسرسوتی اسکول سارولا ضلع برہان پور، اعجاز امیدی سکریٹری بزم امید برہان پور کو بہترین خدمات کے لیے مختلف ایوارڈ اور توصیفی سند سے نوازا گیا۔ یہ پروگرام کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 ستمبر 2017

ماہنامہ 'نیا دور' کے اجرا کا منظر

**اجرا:**

## ماہنامہ نیا دور

**لکھنؤ:** اترپردیش کے گورنر رام نائک نے آج محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ، اترپردیش کے زیراہتمام شائع اردو ماہنامہ 'نیا دور' ستمبر 2017 کے شمارے کا اجرا کیا۔ 'نیا دور' ستمبر 2017 کی پہلی کاپی گورنر کو پرنسپل سکریٹری اطلاعات اونیش کمار اوستھی نے پیش کی۔ نیا دور کے اس شمارہ میں گورنر رام نائک پر ایک گوشہ شائع کیا گیا ہے، جس میں گورنر موصوف کا ایک خصوصی انٹرویو بھی شامل ہے۔ گورنر نے نیا دور کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ جریدہ خوبصورت اور معیاری ہے، عام آدمی سے مربوط ہونے کا اچھا ذریعہ ہے، اردو کا علم کا رکھنے والے نیا دور کی ستائش کرتے ہیں۔ اردو زبان کو آئین نے قومی زبان کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اترپردیش میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ کسی مذہب خاص کی زبان نہ ہوکر عام آدمی کی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ تمام ہندوستانی زبانوں کا احترام کرتے ہیں اور ہر زبان کو اس کا مناسب مقام ملنا چاہیے۔ پرنسپل سکریٹری اطلاعات اونیش کمار اوستھی نے اس موقعے پر بتایا کہ نیا دور کی اشاعت کو 95 سال ہوگئے ہیں۔ اس جریدہ کا آغاز 1922 میں 'ہماری زبان' کے نام سے ہوا تھا۔ حصول آزادی کے بعد جریدہ کا نام 'اطلاعات' ہوا، اور آخرکار 1954 میں اس کا نیا نام 'نیا دور' رکھ دیا گیا۔ اس طرح جریدہ 'نیا دور' مسلسل 63 سال سے شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جریدہ 'نیا دور' کے 2022 میں سو سال ہوجائیں گے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 ستمبر 2017

## موج سراب

**نئی دھلی:** اردو کسی مذہب کی زبان نہیں بلکہ پورے ملک کی زبان ہے۔ ان خیالات کا اظہار بالی ووڈ کی معروف اداکارہ شبانہ اعظمی نے ملک کی ممتاز اردو شاعرہ اور اسپینش زبان سے تعلق رکھنے والی پروفیسر مینو بخشی کے شعری مجموعے 'موج سراب' کے اجرا کے موقعے پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں کیا۔ روپا پبلی کیشن کی جانب سے منظرعام پر آنے والی اس کتاب کا دیباچہ معروف ہدایت کار مظفر علی نے لکھا ہے جبکہ اس کا اجرا اداکارہ شبانہ اعظمی کے ہاتھوں ادبی شخصیات کی موجودگی میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر فلم ہدایت کار مظفر علی نے کتاب کے حوالے سے بتایا کہ اردو زبان کے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ اسپینش زبان سے تعلق رکھنے والی ملک کی نامور شاعرہ مینو بخشی نے 'تشنگی' سے لے کر 'موج سراب' تک کا سفر طے کرلیا ہے۔ پروفیسر مینو بخشی نے کہا کہ جب تک دنیا میں محبت قائم ہے اردو زبان زندہ رہے گی۔ کامنا پرساد نے اپنے بیان میں کہا کہ بلامبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پروفیسر مینو بخشی کی شاعری انسانی دلوں کو جوڑتی ہے، ان کی شاعری میں سادگی ہے۔ معروف سماجی کارکن ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے کہا کہ موصوفہ کی شاعری

میں گہرائی اور صوفیانہ پن ہے اور یہ شاعری عام انسانوں کے دل کی آواز ہے۔ ممبر آف پارلیمنٹ پون ورما نے کہا کہ اردو صرف عشق کی ہی زبان نہیں بلکہ انقلابی زبان بھی ہے۔ انھوں نے اردو کے تحفظ کے تئیں گفتگو کرنے والوں کی باتوں پر تنقید کرتے ہوئے فخر کے ساتھ کہا کہ ملک میں اردو زبان تب تک زندہ رہے گی جب تک یہاں انسانیت زندہ ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 21 ستمبر 2017

## تصوف اور بھکتی کے چوتھے ایڈیشن کا اجرا

**ممبئی:** شعبہ عربی ممبئی یونیورسٹی کے زیراہتمام جے پی نائک بھون کالینہ کیمپس میں مشہور محقق، کالم نگار، شاعر اور دانشور شمیم طارق کی کتاب 'تصوف اور بھکتی' کے چوتھے

ایڈیشن کا اجرا عمل میں آیا۔ اس باوقار اور بامقصد ادبی تقریب کی صدارت شعبہ اردو کے صدر پروفیسر صاحب علی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے روزنامہ 'انقلاب' کے مدیر شاہد لطیف شریک ہوئے۔ اس موقعے پر صاحب کتاب شمیم طارق نے 'عاشقانہ اور عارفانہ شاعری' کے موضوع پر جامع اور عالمانہ اظہار خیال کیا۔ انھوں نے اپنے پرمغز خطبے میں الفاظ و معنی کی کائنات کے در وا کرتے ہوئے کہا کہ ''ہر لفظ کے لغوی اور عرفی معنی تو ہوتے ہی ہیں، محل استعمال کے اعتبار سے بھی معنی میں تغیر پیدا ہوتا ہے اور جب وہی لفظ شعر میں ڈھلتا ہے تو معنی کی ایک پوری کائنات وجود میں آجاتی ہے۔ شمیم طارق نے اپنی بات واضح کرنے کے لیے میر تقی میر، حسرت موہانی، علامہ اقبال، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور کچھ دوسرے شاعروں کے مختلف شعروں کی توجیہ و تشریح کی۔ اس عالمانہ خطبے کے دوران شمیم طارق نے اپنی کتاب کے بارے میں کہا کہ یہ کتاب آپ کو اس حقیقت سے واقف کرائے گی کہ تصوف کے نام پر جو کچھ رائج ہے وہ سب کا سب تصوف نہیں ہے۔ اکابر صوفیا نے ہمیشہ غلط اور غیر شرعی رسوم کی مخالفت کی ہے۔ ان کے مطابق تصوف اور بھکتی میں کچھ ظاہری مشابہتیں ہوسکتی ہیں مگر ان کو ایک نہیں کہا جاسکتا۔ شمیم طارق کے مطابق اس کتاب پر جو ردعمل ظاہر ہوا ہے یا جو خطوط آئے ہیں وہ اس کتاب میں شامل کردیئے گئے ہیں۔ قارئین ان کو پڑھ کر خود فیصلہ کرسکیں گے کہ اس کتاب کا معیار و مزاج کیا ہے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی شاہد لطیف نے شمیم طارق کے حوالے سے کہا کہ قحط الرجال کے اس دور میں شمیم صاحب کی موجودگی علمی شمع کے مانند ہے جس سے فیض حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے۔ اس تقریب کے صدر ڈاکٹر صاحب علی نے شمیم طارق کو مبارکباد پیش کی اور صلاحیت کے اعتبار سے انھیں ظ انصاری اور علی سردار جعفری کی فہرست میں کھڑا کیا۔ اس پروقار تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر قمر صدیقی نے انجام دیے۔ تقریب کا استقبالیہ خطبہ شعبہ عربی کے صدر ڈاکٹر جمشید ندوی نے دیا جبکہ شعبہ عربی کے ہی استاد ڈاکٹر محمد شاہد کے شکریے پر تقریب کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 ستمبر 2017

## جہانِ خیال

**سرینگر:** نگینہ پبلشنگ ہاؤس اور کشمیر کلچرل کانفرنس کے اہتمام سے ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی جس میں برگزیدہ شاعر، ادیب اور تحقیق کار غلام نبی خیال کی تازہ تصنیف 'جہانِ خیال' کی رسم اجرا انجام دی گئی۔ محفل کی صدارت جسٹس بشیر احمد کرمانی نے کی جنھوں نے خیال صاحب کی اس تصنیف کو ایک یادگاری کارنامہ قرار دیا۔ ایوان صدارت میں غلام نبی خیال، وحشی سعید، کاچو اسفند یار خان اور پروفیسر ناصر مرزا موجود تھے۔ انھوں نے غلام نبی خیال کی تصنیف کو ایک تاریخی شاہکار قرار دیا۔ اس موقعے پر کئی سرکردہ ادیب، قلم کار، دانش ور اور سول سوسائٹی کے معتبر اراکین موجود تھے۔

روزنامہ 'کشمیر عظمیٰ' سرینگر، 12 ستمبر 2017

## نیا سویرا بھارت

**میوات:** میوات کی تاریخی وراثت کا پاسدار رسالہ 'نیا سویرا بھارت' کا اجرا نوح کے ڈی اے ہال میں کیا گیا۔ تقریب سے پہلے مشاورتی میٹنگ کی گئی جس میں سیاسی، سماجی، ملی اور دانشوران میوات نے اپنی آرا سے نوازا۔ اس موقعے پر مدیر اعزازی ڈاکٹر مشتاق تجاروی نے کہا کہ میوات کا تاریخی ورثہ ہندوستانی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ افسوس کا پہلو یہ بھی ہے کہ میوات کی تاریخی، تہذیبی اور ادبی روایات پر جتنا لکھا جانا چاہیے تھا اتنا لکھا نہیں جاسکا ہے۔ اسی لیے ہم لوگوں نے مل کر یہ فیصلہ لیا کہ ان روایات کی پاسداری کی جائے، اور قومی اجتماعی نظام کے ساتھ 'نیا سویرا بھارت' کو ملک و ملت کے سامنے لایا جائے۔ میٹنگ کے بعد مولانا محمد خالد قاسمی ریاستی صدر جمعیۃ علما کے ہاتھوں نیا سویرا کا اجرا کیا گیا۔ صدیق احمد میو نے کہا کہ اہم مقصد میوات کی تاریخ، روایات، کلچر کو باقی رکھتے ہوئے معاشرے کی تعمیر کرنی ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 155 ستمبر 2017

## دل ہے ورق ورق

**حیدرآباد:** تلنگانہ رائٹرس اینڈ کلچرل سوسائٹی کے زیراہتمام اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد میں 'شب افروز' شاندار پیانے پر منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر شاعر ڈاکٹر معین افروز کے شعری مجموعہ 'دل ہے ورق ورق' کے دوسرے ایڈیشن کی رسم رونمائی پروفیسر اشرف رفیع سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ بحیثیت مہمانان خصوصی ڈاکٹر م۔ق۔ سلیم صدر شعبہ اردو، شاداں کالج، ڈاکٹر اہلیا مشرا ہندی ادیبہ اور صاحب زادہ نواب میر وقار الدین علی خاں نے شرکت کی۔ صدر جلسہ سردار سلیم نے کہا کہ آج کے دور میں جدید شعرا میں معین افروز کی شاعری اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ مجموعہ کلام کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی شاعری حقیقی معنوں میں معیاری اور ادبی ہے۔ پروفیسر اشرف رفیع نے کہا کہ معین افروز کی شاعری جدیدیت کے ساتھ ساتھ ایک نیا رجحان رکھتی ہے۔ سادہ الفاظ میں وہ اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ اس موقعے پر محترمہ اہلیا مشرا نے کہا کہ شاعری صرف علم سے نہیں آتی بلکہ بچپن سے اس میں یہ جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے۔ معین افروز دنیائے شاعری میں حیدرآباد کا نام بلند کریں گے۔ جلسہ کی نظامت ریشما تبسم نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا وطن' دہلی، 19 ستمبر 2017

## چاندنی دھوپ کی

**دربھنگہ:** 'چاندنی دھوپ کی' پروفیسر ایم کمال الدین کی کتاب کے سرسری مطالعے سے ان کی علمی لیاقت اور زبان و بیان کا اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اتنا قیمتی ادیب و شاعر دربھنگہ شہر میں جیتا اور بستا ہے۔ یہ باتیں المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیراہتمام للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ایم کمال الدین کی کتاب 'چاندنی دھوپ کی' رسم اجرا تقریب کی صدارت کرتے ہوئے معروف شاعر انور آفاقی (دہلی) نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ کمال الدین صاحب نے اپنی اس کتاب میں اپنی آپ بیتی کو بہت خوبصورت انداز میں تحریر کیا ہے۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر پروفیسر عبدالمنان طرزی نے کہا کہ ''پروفیسر ڈاکٹر محمد کمال الدین

بلاشبہ ایک ذی علم فنکار ہیں اور بڑے ہی علمی و عرفانی خانوادے سے ان کا تعلق ہے۔'' ڈاکٹر سید احتشام الدین نے رسم اجرا کے بعد کہا کہ ''پروفیسر کمال الدین کی یہ 'چاندنی دھوپ کی' خودنوشت ایک کامیاب آپ بیتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے زندگی کو ایک نئی روشنی ملے گی۔ دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ اخبار مشرق دہلی، 2 اکتوبر 2017

## فصلِ گل

**پونے:** زنجانی پبلی کیشن کے زیر اہتمام لیٰسین برابری کے شعری مجموعے 'فصلِ گل' کا اجرا گولڈن جبلی انسٹی ٹیوٹ ہال میں کیا گیا۔ اس موقعے پر صدر جلسہ سریش چندر سورت والا، مہمانان خصوصی ڈاکٹر نذیر فتح پوری، سلیم انصاری، پرنسپل یوسف ندیم، منور پیر بھائی، ڈاکٹر ممتاز پیر بھائی، محمد حسن اشرفی، ضیا، باغپتی، اقبال حمید، عبدالرحیم ایلوی، تاج الدین تاج اور کثیر تعداد میں علمی و ادبی شخصیات شریک تھیں۔ بعد ازاں مشہور و معروف شاعر عبداللطیف کے شعری مجموعہ سعادت پر مہمان خصوصی منور پیر بھائی کے ہاتھوں اعزاز سے نوازا گیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ممتاز پیر بھائی، ڈاکٹر نذیر فتح پوری، شبانہ عبداللطیف جوہر وغیر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی 28 ستمبر 2017

## 'ہانگ کانگ میں مسلمانوں کی آمد اور دینی جدوجہد

**نئی دھلی:** خدمت خلق ٹرسٹ انڈیا اور جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار کے زیر اہتمام مفتی احمد نادر القاسمی کے سفرنامہ 'ہانگ کانگ میں مسلمانوں کی آمد اور دینی جدوجہد' کا اجرا جامعہ نگر میں معروف عالم دین مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی نے کہا کہ سفرنامہ ایک اہم صنف ہے، اس کے ذریعے سے کسی بھی ملک کی حقیقت، سچائی اور معاشرہ کے حالات کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ انھوں نے مفتی احمد نادر القاسمی کو اس تصنیف کے لیے مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اس طرح کی کوششیں جاری رہنی چاہئیں، ملکوں کی تاریخ اور وہاں کے معاشرے کو سمجھنے اور جاننے کے لیے سفرنامے بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ لیکن مفتی احمد نادر نے وہاں کی اسلام کی تاریخ لکھ کر علمی دنیا میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے، اس سے یہ جاننے کا موقع ملے گا اسلام ہانگ کانگ میں بھی شاندار تاریخ کے ساتھ موجود ہے۔ صحافی شاہ عالم اصلاحی نے کہا کہ سفرنامہ سے کسی بھی معاشرہ اور سوسائٹی کی صحیح جانکاری ملتی ہے۔ تاریخ کی تدوین میں ان سفرناموں کا رول بہت اہم ہوتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اکتوبر 2017

## گہرِ اردو

**دیوبند:** نوجوان فاضل و سماجی کارکن مولوی رضوان غازی کی اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے تحریر کردہ

کتاب 'گہرِ اردو' قاسم پورہ روڈ واقع مسجد اخلاق میں رسم اجرا عمل میں آیا ہے۔ اس موقعے پر مولوی رضوان غازی قاسمی نے کہا کہ موجودہ دور میں اردو زبان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے اور اس شیریں زبان کو ایک مذہبی زبان سمجھ کر اس سے بیزاری کا اظہار کیا جا رہا ہے، وہ یقینی طور پر اردو زبان اور اہل اردو کے لیے نقصان دہ ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کسی خاص قوم و ملت یا فرقہ کی زبان نہیں ہے بلکہ عالمی زبان ہے جس کے فروغ میں تمام قوموں کے لوگ شانہ بشانہ ساتھ رہے۔ اس موقعے پر مولوی امجد رزاقی، مولوی داؤد قاسمی، مولوی فرحان خان وغیرہ سمیت دیگر موجود رہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 11 اکتوبر 2017

**وفیات:**

## گوہر شیخ پوروی

**(رمانہ تبسم: پٹنہ):** عظیم آباد کے ایک عظیم گوہر،

گوہر شیخ پوروی کا انتقال 14 ستمبر کی رات تقریباً 9 بجے ان کے 'سائبان' شیش محل، دولی گھاٹ، پٹنہ سیٹی میں ہوگیا۔ ان کی نماز جنازہ مدرسہ سلیمانیہ میں ادا کی گئی جہاں کافی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ گوہر شیخ پوروی نایاب گوہر تھے۔ گوہر شیخ پوروی کافی ہردلعزیز اور نیک صفت انسان تھے۔ اس کے علاوہ شہر عظیم آباد کے معتبر اور بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر تھے۔ گوہر شیخ پوروی کا پورا نام سید علی حسنین ہے۔ گوہر ان کا تخلص ہے۔ ان کی پیدائش 21 اکتوبر 1951 کو شیخ پورہ ضلع (بہار) میں ہوئی اور اسی نسبت سے خود کو شیخ پوروی لکھتے تھے۔ آپ بچپن سے ہی ذکی فہم تھے۔ پہلی جماعت سے لے کر ایم اے تک ہر کلاس میں فرسٹ آئے۔ گوہر شیخ پوروی کو اردو، فارسی، عربی کے ساتھ ہندی اور انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ گوہر شیخ پوروی صاحب کو اب ت بہت سارے انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ 'گوہر سخن' کا خطاب انھیں کیسری کیاری کی جانب سے ملا ہے۔ انجمن حی علی خیر العمل بنارس کی جانب سے 'رئیس الشعرا' کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

جنوری تا مارچ 1992 میں سہ ماہی داؤ دنگر بہار کا 'گوہر شیخ پوروی' نمبر شائع ہوا۔ ان کی کچھ غزلیں اور نظمیں کاشی ودیاپیٹھ بنارس میں بی۔ اے کے نصاب میں شامل ہیں۔ اردو کی تیسری کتاب جس کے مرتب رضوان رضوی صاحب ہیں۔ میں نظم 'چاول کی آپ بیتی' شامل ہے۔ گوہر شیخ پوروی کی حصار فکر، غبار فکر، شاہ کار فکر، غمگسار فکر، آبشار فکر، گوہر عروض و بلاغت، دیار فکر، بار بار، زرد پتوں کی دعا اور حدیث درد جیسی دس مطبوعہ تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ 'حدیث درد' ان کا نواں شعری مجموعہ ہے جو غزلیات پر مشتمل ہے۔

روزنامہ 'قومی تنظیم' لکھنؤ، 17 ستمبر 2017

## ڈاکٹر تشنہ عالمی

**لکھنؤ:** شہرنگاراں کو اپنی شاعری سے آراستہ کرنے والے شعرا میں ایک اہم نام تشنہ عالمی کا بھی تھا۔ انھوں نے مناظر قدرت کی حسین عکاسی کے ذریعے دور حاضر

میں اردو شاعری کو مالا مال کیا۔ سلیم پور، دیوریا کے ایک معزز خانوادے میں 25 اپریل 1943 کو پیدا ہونے والے فضل الرحمٰن المعروف بہ تشنہ عالمی مختصر علالت کے بعد 18 ستمبر 2017 صبح تقریباً 8 بجکر 30 منٹ پر دارفانی سے کوچ کر گئے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر تشنہ عالمی نے عمر کا بیشتر حصہ نگر مہاپالیکا کے اسکول سے وابستہ رہ کر نسلوں کی آبیاری میں گزارا۔ ہیومیوپیتھ ڈاکٹر کی حیثیت سے دکھی انسانیت کی خدمت کی اور شاعری ایسی کی کہ جس کا کوئی موجودہ وقت میں ثانی ہے نہ جواب۔ صبا پرکاشن نے ہندی رسم الخط میں 2013 میں 'بت کہی تشنہ کی' کے عنوان سے مختصری کتاب شائع کرکے قابل تعریف وتوصیف کام کیا ہے۔ اسی پرکاشن سے وابستہ نوجوانوں نے تشنہ عالمی کی حیات و کارناموں پر ڈاکومینٹری فلم بنائی تھی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ شادی شدہ بیٹی اور بیٹا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 ستمبر 2017

## معروف اداکار ٹام آلٹر

**ممبئی:** مشہور اداکار، مصنف اور ہدایت کار پدم شری ٹام آلٹر کا طویل بیماری کے بعد جمعہ کی شب 29 ستمبر

2017 کو انتقال ہوگیا۔ وہ کینسر سے متاثر تھے۔ ان کے خاندان کی جانب سے جاری بیان کے مطابق ''ہم افسوس کے ساتھ اداکار، ڈائرکٹر اور مصنف پدم شری ٹام آلٹر کے انتقال کا اعلان کرتے ہیں۔ جمعہ کی شب کو اردو کا ایک چاہنے والا ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہوگیا۔ 67 سالہ پدم شری ٹام آلٹر کی پیدائش 22 جون 1950 کو مسوری میں ہوئی تھی۔ ان کے خاندان میں، بیوی کیرول ایونشا، بیٹا جیمی اور بیٹی افشاں ہیں۔ انھیں 2008 میں پدم شری سے نوازا گیا تھا۔ انھوں نے 300 سے زیادہ فلموں میں کام کیا۔ کئی ٹیلی ویژن کے شوز بھی کیے۔ پانچ سال تک چلنے والا گینگسٹر کیشو کلسی خوب پسند کیا گیا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کچھ برسوں کے لیے کھیل صحافت میں بھی طبع آزمائی کی۔ تین کتابیں بھی لکھیں۔ ہندوستان میں امریکہ کی تیسری نسل کے اداکار ٹام آلٹر ووڈ اسٹاک اسکول میں پڑھائی کرنے کے بعد 1970 میں پہلے Yale یونیورسٹی میں پڑھائی کے لیے گئے اور بعد میں ہندوستان واپس آکر اپنی زندگی کی شروعات کی تھی۔

صدر جمہوریہ رامناتھ کووند اور وزیر اعظم نریندر مودی نے ٹام آلٹر کے انتقال پر اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ مشہور اداکار ٹام آلٹر کی موت کی خبر سے رنجیدہ ہوں۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے درمیان ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ وزیر اعظم مودی نے ٹام آلٹر کے انتقال پر رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے سنیما اور تھیٹر میں ان کے کردار کو یاد کیا۔ انھوں نے ان کے خاندان سے بھی گہری تعزیت کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 اکتوبر 2017

## انور حسین

**نئی دهلی:** روزنامہ راشٹریہ سہارا، نوئیڈا کے کارکن انور حسین ولد عثمان حسین کا مختصر علالت کے بعد 9 اکتوبر 2017 کو انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر تقریباً 46 برس تھی۔ مرحوم صوم وصلوٰۃ کے پابند اور بڑے خوش اخلاق تھے۔ وہ 11 سال سے زائد عرصے سے روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' نوئیڈا سے وابستہ تھے۔

مرحوم انور حسین موضع کوچیسر، پوسٹ رانی گنج،

تھانہ امام گنج، ضلع گیا (بہار) کے رہنے والے تھے۔ مرحوم گذشتہ کئی ماہ سے عارضہ جگر اور کینسر جیسے موذی امراض میں مبتلا تھے۔ مرض میں افاقہ نہ ہونے کے سبب دہلی سے انھیں ممبئی کے ٹاٹا میموریل اسپتال لے جایا گیا تھا، لیکن وہ جانبر نہ ہوسکے۔ ان کے پسماندگان میں والدین، اہلیہ اور 4 بچے ارمان، عرفان، ندیم اور امروز ہیں۔ مرحوم انور حسین کی تدفین ان کے آبائی گاؤں کوچیسر میں کی گئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 اکتوبر 2017

## خلیل الرحمٰن راز

**نئی دهلی:** مشہور اردو وعربی ادیب وشاعر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز کا 9 اکتوبر 2017 کا انتقال ہوگیا۔ ان کے سانحہ ارتحال پر اظہار رنج وملال کرتے ہوئے مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی چیئرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے کہا کہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز ایک بڑے محقق اور بلند پایہ مصنف تھے، ان کی کتاب 'سیرت انبیا وحکمت مصطفےٰ' بہت ہی معروف ہے، جس کا اجرا ڈاکٹر سید سلمان ندوی سابق صدر شعبۂ اسلامی تاریخ ڈربن یونیورسٹی ساؤتھ افریقہ نے کیا تھا۔ مولانا قاسمی نے کہا کہ مولانا خلیل الرحمٰن راز نے ایک عرصہ تک سعودی عرب اور قطر دوحہ میں بھی ملازمت کی، لیکن انھوں نے ملازمت کے دوران اپنے علمی مذاق وتصنیفی ذوق کا خیال رکھا۔ مولانا خلیل الرحمٰن راز مرحوم نے بڑی درویشانہ وقلندرانہ زندگی کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی علمی ودینی خدمات قبول فرمائے اوران کے پسماندگان ولواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 اکتوبر 2017

**خراج عقیدت:**

## انیس انصاری

**نئی دهلی:** حکیم اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر انیس احمد انصاری کے انتقال پر آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کی جانب سے ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ تعزیتی نشست میں معروف طبیب حکیم ایف آر شرر مصباحی نے کہا کہ پروفیسر انیس احمد انصاری سے میرے مخلصانہ تعلقات تھے، ان کے حسن اخلاق اور علم دوستی بالخصوص کلیات طب پر ان کی گہری نظر کی وجہ سے تھے۔ ڈاکٹر سید احمد خاں (سکریٹری جنرل، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس) نے کہا کہ پروفیسر انیس احمد انصاری سابق ایڈوائزر یونانی، حکومت ہند کے علاوہ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (سی سی آر یو ایم) کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ اس کے علاوہ ان کا تعلق آل انڈیا یونانی طبی کانگریس سے بھی تھا۔ ابھی حال ہی میں مرحوم انصاری کو مرکزی حکومت نے سی سی آر یو ایم کی لٹریری ریسرچ کمیٹی کا چیئرمین بھی نامزد کیا تھا۔ اظہار تعزیت کرنے والوں میں ڈاکٹر راشد اللہ خاں (سابق صدر، سی سی آئی ایم، حکومت ہند) ودوسرے شرکا نے بھی خراج عقیدت پیش کیے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 26 ستمبر 2017

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

### اصلاح الاصلاح

مصنف: ابر احسنی گنوری
مقدمہ: شمس رمزی
صفحات: 129
قیمت: 85 روپے

### مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات
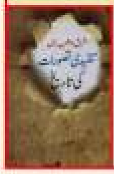
مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: 168 روپے

### عوام الناس کے صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

مصنف: ایس۔ ایم۔ خان
مترجم: سید وجاہت مظہر
صفحات: 166
قیمت: 125 روپے

### کردار اور افسانہ یعنی دنیائے افسانہ (حصہ دوم)

مصنف: عبدالقادر سروری
صفحات: 118
قیمت: 75 روپے

### قدیم علم الامراض

مصنف: ملک وامق امین
صفحات: 131
قیمت: 50 روپے

### اصولِ افسانہ نگاری

مصنف: اویس احمد عزیز
صفحات: 86
قیمت: 65 روپے

### بہار کی بہار (جلد دوم)

مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150 روپے

### مغرب میں تنقید کی روایت

مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245 روپے

### بہارِ گلشنِ کشمیر (جلد اول و دوم)

مرتبہ و مولفہ: پنڈت برج کشن کول
و پنڈت جگت موہن ناتھ رینہ
صفحات: 454و537
قیمت: 275و300 روپے

### رشید حسن خاں (مونوگراف)

مصنف: عبدالحمید
صفحات: 122
قیمت: 74 روپے

### دیوندر ستیارتھی (مونوگراف)
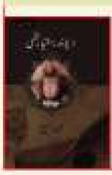
مصنف: عبدالسمیع
صفحات: 162
قیمت: 90 روپے

### سید امتیاز علی تاج (مونوگراف)

مصنف: محمد شاہد حسین
صفحات: 136
قیمت: 80 روپے

### یاس یگانہ چنگیزی (مونوگراف)
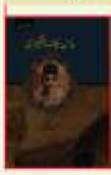
مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات: 149
قیمت: 90 روپے

### علی سردار جعفری (مونوگراف)

مصنف: عمر رضا
صفحات: 165
قیمت: 90 روپے

### حسن نعیم (مونوگراف)

مصنف: شمیم طارق
صفحات: 143
قیمت: 85 روپے

### فدائے لکھنؤ

مصنف: پروین طلحہ
مترجم: ڈاکٹر صبیحہ انور
صفحات: 182، قیمت: 100 روپے

### آغا حشر کاشمیری (جلد ہشتم)
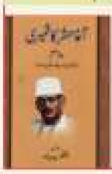
مرتب: یعقوب یاور
صفحات: 460
قیمت: 215 روپے

### رینگنے والے جانور

مصنف: قیصر سرمست
صفحات: 84
قیمت: 22 روپے


شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

**URDU DUNIYA Monthly, November-2017, Vol.19, Issue:11**
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/10/2017
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month


# قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

خاکہ پر ایک دستاویزی شمارہ جس میں خاکہ کے فن اور روایت، اردو کے اہم اور نمائندہ خاکہ نگاروں پر مضامین کے علاوہ رفتگاں اور قائماں پر اہم ادبی خاکے بھی شائع کیے گیے ہیں۔

صفحات: 422 قیمت: 50 روپے

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025